مقالاتِ ہاشمی

حصہ اوّل

ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ

ON LIBRARY
LIGARH.
UNIVER
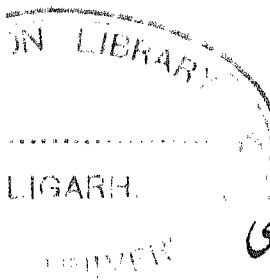
مؤلفہ
نصیر الدین ہاشمی

تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ۔ لاہور

میں اپنی اس ناچیز تالیف کو

قدردانِ علم و فن عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ

کے اسمِ گرامی پر

معنون

کرنے کی عزّت حاصل کرتا ہوں

جن کی علم پروری اور ادب نوازی کے باعث دکّنی ادب کے شہ کار طبع

ہو کر منظرِ عام پر جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ فقط۔

ہاشمی

M.A.LIBRARY, A.M.U.
U32491

۳۲۴۹۱
عطیہ
رام بابو سکسینہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض حال
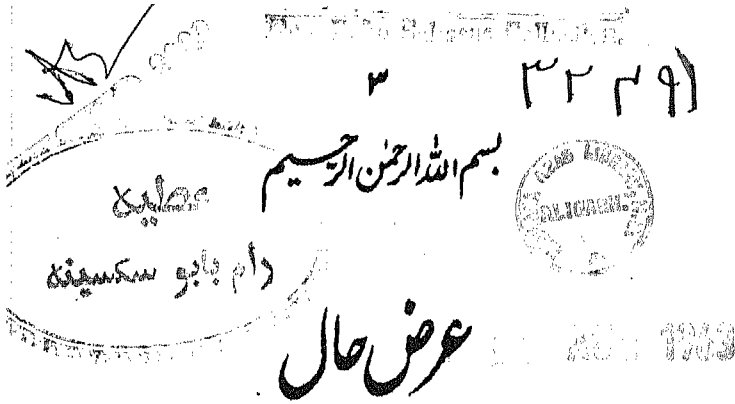
مضمون نگاری کا جو شوق عمر کی ابتدائی منزلوں میں پیدا ہوا تھا۔ وہ مسلسل ترقی کرتا رہا۔ مضامین جو لکھے گئے اور جو ہندوستان کے معیاری رسائل میں شائع ہوئے، ان کی تعداد اب دو سو تک پہنچ گئی ہے، اس شوق نے اب اس سودے کی صورت اختیار کی ہے۔ کہ ان مضامین کے مجموعے مرتب کئے جائیں، اس سلسلہ کی پہلی کڑی "ذکر نبی" تھی۔ اب یہ مجموعہ ادبی اور تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے، جو مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان کی تفصیل اور جن رسالوں میں وہ شائع ہوئے۔ ان کی صراحت ذیل میں درج کی جاتی ہے

۱۔ خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری — رسالہ ہندوستانی سنہ ۱۹۳۶ء

۲۔ بہمنی حکومت کا ایک دکھنی شاعر — معارف سنہ ۱۹۳۲ء

۳۔ نورس مصنفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی — معارف سنہ ۱۹۳۲ء

۴۔ خاور نامہ دکھنی — معارف سنہ ۱۹۳۰ء

۵۔ سلطان علی عادل شاہ ثانی کا ہندوستانی کلیات — معارف ۱۹۳۳ء

۶۔ ولی کے پہلے دکن کی اردو شاعری — المومن ۱۹۳۷ء

۷۔ ولی کا غیر مطبوعہ کلام (یورپ کے دواوین سے) — معارف ۱۹۳۰ء

۸۔ ولی کا غیر مطبوعہ کلام (ایک خاندانی مخطوطہ سے) — ہندوستانی ۱۹۳۳ء

۹۔ وجہی مرثیہ گو کی حیثیت سے — مکتبہ حیدرآباد ۱۳۴۰ف

۱۰۔ دکن کے بعض مرثیہ گو — ادبی دنیا ۱۹۳۰ء

۱۱۔ مرزا کے مرثیے — شہاب ۱۳۴۲ف

۱۲۔ ارسطو جاہی ہندوستانی قصیدے — رہبر دکن ۱۳۴۵ف

۱۳۔ شعرا الہند اور دکن — ہزار انسان جلد ۳۰۲

۱۴۔ انڈیا آفس کی کیٹلاگ میں دکھنی مخطوطات کی فروگذاشتیں — معارف ۱۹۲۹ء

۱۵۔ اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ کی چند قابل توجہ فروگذاشتیں — جامعہ ۱۹۳۲ء

۱۶۔ تاریخ نثر اردو پر ایک تنقیدی نظر — معارف ۱۹۳۳ء

۱۷۔ مقدمہ سب رس پر ایک تنقیدی نظر — رہبر دکن ۱۳۴۲ف

۱۸۔ اردو لٹریچر (مصنفہ ڈاکٹر بیلی) اور رسالہ اردو — شاہجہان ۱۹۳۴ء

۱۹۔ مغل اور اردو پر ایک سرسری نظر — شاہجہان ۱۹۳۳ء

۲۰۔ جواہر سخن پر ایک نظر — شاہجہان ۱۹۳۴ء

۲۱۔ قنوت کا تذکرہ شعرائے اردو — ہندوستانی ۱۹۳۳ء

۲۲۔ تمنا کا تذکرہ شعرا — معارف ۱۹۳۵ء

۲۳۔ کیمبرج کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست — معارف ۱۹۲۹ء

۲۴۔ پیرس کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست — معارف ۱۹۳۰ء

چونکہ یہ مضامین آج سے بہت پہلے شائع ہوئے تھے، اس لئے اب ان میں یا ضروری کمی و بیشی لامحالہ کرنی پڑی۔

اس امر کی ضرورت نہیں معلوم کہ ان مضامین کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ مضامین اپنی زبان کی خدمت کرنے کے جذبہ کے تحت لکھے گئے ہیں، اور توقع ہے کہ وہ زبان کے دوسرے خدام کے لئے کچھ نہ کچھ مفید ثابت ہوں گے۔

یہاں یہ بات واضح کرنی نامناسب نہیں۔ کہ ابھی ہمارے ہاں "تنقید" کے متعلق افراط و تفریط بچی ہوئی ہے، تنقید یا تو تنقیص کی صورت اختیار کر لیتی ہے، یا بے جا ستائش کی، اس مجموعہ میں جو تنقیدی مضامین شریک ہیں، ان کے لکھنے میں یہ کوشش کی گئی ہے۔ کہ

تنقید کا اصلی مفہوم نظر انداز نہ ہو جائے، البتہ "سب رس" کے مقدمہ کی تنقید میں کچھ تلخی سی پیدا ہو گئی ہے لیکن اس میں بھی کوئی بات خلاف واقعہ نہیں ہے۔

محرر مضامین کو اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی کا اعتراف ہے، اور ناظرین سے عفو کا مستدعی۔ فقط

نصیر الدین ہاشمی
(حیدر آباد دکن)

شہریور ۱۳۴۶ف
جمادی الاول ۱۳۵۶ھ

(از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔ اے)

میرے دوست سید نصیر الدین ہاشمی صاحب ان لوگوں میں ہیں۔ جو سارے دن دفتر کا کام کرنے کے بعد بھی نچلے نہیں بیٹھتے۔ گھر پر بھی کچھ نہ کچھ لکھے ہی جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ تھوڑے ہی دنوں میں بہت کچھ لکھ چکے اور چھپوا چکے ہیں انھوں نے صرف ایک ہی مضمون کو لیا ہے اور اسی دائرہ میں اپنی کوششوں کو صرف کر رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگ کچھ کر جاتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے کارنامے کچھ رہ جاتے ہیں۔ بھلا دنیا میں وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ جو دائیں بائیں ہر طرف ہاتھ چلائیں اور اس لوٹ میں بے جوڑ اور انمیل جو مال بھی ہاتھ لگے۔ اس کو کباڑی کی دوکان کی طرح اوپر تلے جمائیں اور پبلک میں پیش کر کے ادیب ہونے کے دعویدار ہوں۔

کم سے کم ہندوستان میں کچھ عرصہ پہلے تک "حب وطن" ایک ایسا

لفظ تھا۔ جو شرمندہ معنی نہ تھا اور صرف لغت کی کتابوں میں ملتا تھا۔ اب "حب وطن" نے ایک جوش بنکر ہر ایک کے دل پر قبضہ کر لیا ہے اور یہی وجہ ہے۔ کہ ہاشمی صاحب نے جنوبی ہند کے شعراء کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے۔ بڑی خوبصورتی سے مضامین کی صورت میں لکھے۔ اور بڑے اہتمام سے طبع کرائے۔ "قطرہ قطرہ دریا شود" والا معاملہ ہوا۔ سب مضامین مل ملا کر قاروں کا خزانہ ہو گئے۔ اسی خزانہ میں سے یہ چند جواہر نکال کر اور سلیقہ سے جما کر ایک ہار کی صورت میں اب آپ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

ممکن ہے۔ کہ بعض اصحاب کا خیال ہو۔ کہ ان پرانے بڈھوں اور اُن کے دو سو برس پہلے کے فرسودہ خیالات کو اب اس نئی دنیا کے سامنے لانے کی کیا ضرورت ہے۔ تو اس کا جواب میں کیا دوں حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی زبان سے سن لیجئے۔ فرماتے ہیں :۔

نام نیک رفتگاں ضائع مکن تا بماند نام نیکت برقرار

دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ جب تک وہ اپنے گذشتہ مشاہیر کی قدر نہ کرے۔ ان کے حالات جمع نہ کرے۔ اُن کے خیالات سے واقف نہ ہو ان کے کمالات پر فخر نہ کرے اور اُن کے واقعات کے مطالعہ سے سبق نہ لے یہی وجہ ہے۔ کہ دنیا کی تمام مہذب قومیں اپنے بزرگوں کے حالات جمع کرنے میں انتہائی کوشش صرف کرتی ہیں اور ان کے حالات کو اپنے لئے چراغ ہدایت

بناتی ہیں ؛

اب رہا خیالات کا فرسودہ ہونا۔ تو اس کے متعلق میری کیا سب کی رائے ہے کہ اچھے خیالات کبھی فرسودہ ہوتے ہی نہیں۔ دَور زمانہ سے زبان بدل جاتی ہے۔ مگر خیالات نہیں بدلتے۔ ہاں یہ ضروری ہے۔ کہ اپنے بزرگوں کے حالات نہ پڑھ کر ہم اُن کے خیالات سے بے خبر رہتے ہیں۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ ہماری نظر محدود اور ہماری ہمت مفقود ہو جاتی ہے۔ اور ہم دوسروں کو اچھا اور اپنوں کو بُرا سمجھنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ خود کو ذلیل سمجھنا اور دوسروں کی نقالی کرنا ادبار کا آخری درجہ ہے ؛

ایک عام خیال یہ پیدا ہو گیا ہے۔ کہ شاعر سے زیادہ بیکار شئے دنیا میں کوئی نہیں لیکن اگر دنیا کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ اُن کے شعرائ نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیئے ہیں۔ اور گو اُن کی شاعری آخر زمانہ میں عشق کے جھوٹے اور سچے واقعات کا ایک جال بنکر رہ گئی ہے۔ پھر بھی لبسا اوقات یہ شکستہ دلوں کے حق میں مرہم کا کام کر جاتی ہے اور اکثر پژمردہ دلوں کو از سر نو شگفتہ کر دیتی ہے ؛

میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ جو مضامین اس وقت آپ کے پیشِ نظر ہیں۔ اُن کی زبان وہ نہیں ہے۔ جو آپ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسی بھی نہیں ہے۔ کہ اس کا پڑھنا اور سمجھنا ذراسی کوشش کے بعد بھی مشکل ہو۔ میں یقین دلاتا

ہوں۔ کہ ذرا سی محنت کے بعد آپ اس میں چل نکلیں گے اور پھر دکھنی اردو کے سب خزانے آپ کی ملک ہے۔ آپ اس میں ایسے جواہر پارے پائیں گے کہ آج کل کی شاعری میں ان کا ملنا ناممکن ہے۔ ان خیالات کو لینا اور موجودہ زبان میں ان کو تبدیل کر کے اہل ملک کے سامنے پیش کرنا اب آپ کا کام ہے اگر آپ نے یہ کر لیا تو بڑا کام کیا۔ آپ نئی دنیا اور پرانی دنیا کو ملا کر ایک ایسی دنیا پیدا کریں گے۔ جس کی اس وقت زمانہ کو بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ کی رفتار ہمارے اخلاق اور حالات کو تباہ کر رہی ہے اور اپنے بزرگوں کے حالات سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس رَو میں بہے چلے جا رہے ہیں:

ممکن ہے۔ کہ آپ کو یہ خیال پیدا ہو کہ دوسروں کے خیالات کو نقل کرنا "سرقہ" ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں۔ کہ کیا اپنے کسی بزرگ سے جائداد حاصل کرنا "چوری" ہے۔ یہ ہمارا قدرتی حق ہے۔ البتہ اس جائداد کی اصلاح نہ کرنا اور اس کو یوں یوں ہی پڑے پڑے تلف ہو جانے دینا نہ صرف دنیا کی نظروں میں اپنے آپ کو بے وقوف بنانا بلکہ خود کو "ناہنجار اولاد" ثابت کرنا ہے۔ بہر حال ہاشمی صاحب کو جو کرنا تھا وہ انہوں نے کیا۔ اب اس سے کوئی فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا آپ کا کام ہے:

سپردم بتو مایہ خویش را ✤ تو دانی حساب کم و بیش را

حضرت خواجہ بندہ نواز کی ہندستانی شاعری

حضرت سید محمد حسینی جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے لقب سے مشہور ہیں۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بہمنی حکومت کے زمانے میں دکن آئے (۸۰۱ ہجری) اور یہاں ہی ۸۲۵ ہجری میں آپ کا انتقال ہوا۔ گلبرگہ میں آپ کا مزار ہے اور ہر سال ماہ ذیقعدہ میں بڑی دھوم سے آپ کا عرس ہوتا ہے۔

آپ نہ صرف اپنے وقت کے ایک باکمال صوفی تھے۔ بلکہ بڑے صاحب علم و فضل بھی تھے۔ آپ کی تصانیف بے شمار ہیں۔ مریدوں اور معتقدوں کی عمومی تربیت کے علاوہ نماز ظہر کے بعد آپ درس بھی دیا کرتے۔ حدیث تصوف۔ سلوک، فقہ اور کلام اس درس میں شامل تھا۔ آپ کے فیض علمی و روحانی کا سلسلہ دور تک پہنچتا ہے۔

اب یہ امر متحقق ہو گیا ہے۔ کہ دکن میں اس وقت عام طور سے اردو زبان مروج تھی، ادنےٰ سے اعلےٰ تک اس میں گفتگو کرتے تھے حضرت گیسو دراز بھی

فارسی اور عربی کے علاوہ اسی دکھنی میں درس دیا کرتے تھے۔ آپ کی ایک کتاب جو "معراج العاشقین" سے موسوم اور نثر میں ہے۔ شائع ہوگئی ہے ۔

لیکن ہنوز اس کی تحقیق باقی ہے۔ کہ آپ نے دکھنی نظم میں طبع آزمائی کی ہے یا نہیں ۔

راقم نے اپنی تالیف "دکن میں اردو" کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں حسب ذیل تین شعروں کے متعلق صراحت کی ہے۔ کہ یہ خواجہ صاحب کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں :۔

پانی میں نمک ڈال مزہ دیکھنا وسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے

یوں کھوئی خودی اپنی خدا ساتھ محمدؐ
جب گھل گئی خودی تو خدا بن نہ کوئی وسے

آنتوں بلبیلہ آنتوں لون
پتین کے گھر جائے کون

یہ اشعار رسالہ النساء (حیدرآباد) میں تمکین کاظمی صاحب نے شائع کیے تھے

اب مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے اپنی جدید تالیف "اردو کی ابتدائی نشو نما میں صوفیا کرام کا کام" میں حضرت خواجہ بندہ نواز کے ذکر میں حسب ذیل صراحت فرمائی ہے :-

مجھے ایک قدیم بیاض ملی ہے۔ جس میں بیجاپور کے مشہور صوفی خاندان کے بزرگوں کے نظم و نثر کے رسالے اور اقوال جو زیادہ تر ہندی یعنی قدیم اردو میں ہیں اس خاندان کے کسی معتقد نے بڑے اہتمام و احتیاط سے جمع کئے ہیں۔ اس کا سنہ کتابت ۱۰۶۸ھ ہے۔ اس میں حضرت بندہ نواز کا بھی ایک اردو رسالہ اور بعض اقوال وغیرہ درج کئے ہیں۔ اور اُن کے ایک مثلث بھی ہے۔ جو یہاں نقل کیا جاتا ہے +

او معشوق بے مثال نور نبی نہ پایا
اور نور نبی رسول کا میرے جیو میں بھایا
ایہیں ایہیں دیکھادنے کیسی آرسی لایا"

اس تفصیل کے بعد مولانا نے معراج العاشقین کا ذکر کیا ہے اور اس کی عبارت کا نمونہ ہے اسکے بعد پھر صراحت کی ہے :-

"بیاض مکتوبہ ۱۰۶۸ھ کے علاوہ دو اور بیاضوں میں اُن کی ایک غزل قدیم طرز ریختہ میں ملی ہے جس کی نسبت یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ انہی کی ہے۔ البتہ مقطع میں تخلص انہی کا ہے۔"

غزل کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں :-

نوں توصحی ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں
ہوئے نرم نہ تجھ ادچڑے بس کھائیگا آواز توں

سینچ گھوڑا زور ہے خود خیال اس کا ہور ہے
تن لوٹنے کا چور ہے نہ چھوڑ اس بد ٹھار توں

تب قید گھوڑا آئے گا تجھ لامکاں لے جائیگا
تب عشق جھگڑا پائے گا خد مارلے تروار توں

شہباز حسینی کھوے کر ہر دو جہاں دل دھوے کر
اللہ آپے یک ہوے کر تب پاویگا دیدار توں

اس کے پیشتر کہ آپ کے کلام کے متعلق مزید صراحت کی جائے ۔ دو امور کے متعلق کچھ لکھنا ضروری ہے ۔ اول تو یہ کہ کیا خواجہ صاحب کی غزل قدیم طرز ریختہ میں ہے ؟ دوسرا آپ کا تخلص ۔

شمالی ہند میں عام طور سے ایک زمانے میں اردو نظم کا نام ریختہ تھا ۔ مگر دکن میں ایسا کبھی نہیں ہوا ۔ بلکہ یہاں ریختہ صرف اس خاص نظم کو کہتے تھے جس میں مصرعے فارسی سے مرکب ہوتے تھے ۔ چنانچہ کلیات شاہی میں جو سلطان علی عادل شاہ ثانی کا دیوان ہے اور قدیم زمانے میں مرتب ہوا ہے ۔ ریختہ کے عنواں سے جو نظم لکھی گئی ہے ۔ اس کا مطلع یہ ہے :-

دیدم نظر بہ ہر روپ جو اس شوخ جگہ مستانہ را
گفتم بیا مندر مئے روشن بکن کاشانہ را

ریختہ کے متعلق ہم نے تفصیل سے ایک دوسرے مضمون میں بحث کی ہے۔ اس لئے یہاں مزید توضیح کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ بہر حال یہ کہنا کہ حضرت خواجہ بندہ نواز کی غزل ریختہ میں ہے صحیح نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کو قدیم اردو یا دکھنی کہنا چاہیئے

خواجہ صاحب کے تخلص کے متعلق یہ لکھا گیا ہے۔ کہ ان کا تخلص یقینی طور پر شہباز تھا۔ مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا ہے۔ کہ در اصل آپ شہباز تخلص کرتے تھے۔ کیونکہ ہم کو جو کلام ملا ہے۔ اس میں پورا نام سید محمد حسینی اور "بندہ" بھی تخلص لایا گیا ہے۔ اس طرح یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے۔ کہ آپ کا در اصل تخلص کیا تھا۔

اس وقت تک ہم کو خواجہ بندہ نواز کا جو کلام دستیاب ہوا ہے۔ وہ تین علیحدہ جگہوں کا ہے۔

(۱)۔ آقا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج کے پاس ایک مجموعہ ہے جس کے جامع ابوالقاسم نصیر الدین ہیں۔ یہ عالمگیر کے ساتھ ان کی فوج میں شامل تھے اور جہاں جہاں سے ان کو تصوف کا ذخیرہ ملتا گیا ہے۔ اس کو اس کتاب میں جمع کرتے گئے ہیں۔ اس طرح یہ رسالہ ۱۱۱۳ھ ہجری میں لکھا گیا ہے۔ اس میں خواجہ صاحب

کی تین نظمیں ہیں۔ ایک میں سید محمد اور دو میں شہباز تخلص ہے۔

مولانا عبدالحق نے اپنی کتاب میں جس مثلث کا ذکر کیا ہے۔ وہ دراصل مثلث نہیں ہے کیونکہ اس کی پوری نظم دستیاب ہوئی ہے۔

زمانہ قدیم میں تصوف کی نظموں کو "حقیقت" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کی تینوں نظمیں بھی حقیقت کے نام سے لکھی گئی ہیں اور موسیقی کے راگنیوں میں ہیں۔ ذیل میں ان کو درج کیا جاتا ہے۔

حقیقت رام کلی

ہیں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے

او پیو میرے جیو کا بزقا لیا ہے

او معشوق بے مثال ہے نور نبی نپایا

نور نبی رسول کا او میرے جیو میں بہایا

اپکوں اپنے دیکھنے کیسی آرسی لایا

گھر گھر سے پیو پیو میں ایسیں آپ دکھاوے

ایسی میٹھی معشوق کوں کوئی کیوں دیکھنے پاوے

جنہہ دیکھے اوسی کون اُسے اور نہ بھاوے

کل شئی محیط ہے اسی کون چھپاسے

جو کوئی عاشق اس پیو کے اسی جیو میں جانے
اسی دیکھت کم ہو رہے جیسی ہیں دیوانے

خواجہ نصیر الدین جنے سائیاں پیو بنائی
جیو کا کھوں کٹھ کھول کر پیا مکہ آپ دکھائی
اکھی سید محمد حسینی پیو سنکھ کہیا نہ جائی

حقیقت

اے محمد ہجلو جم جم جلوہ تیرا،
ذات تجلی ہوئی سیس سپور نہ سہرا

واحد اپنی آپ تھا آپیں آپ سنجھایا
پرکٹ جلوے کارنے الف میم ہو آیا
عشقوں جلوا دینے کر کاف نون لبایا

لولاک لما خلقت الافلاک خالق پالائے
فاضل افضل جیتی مرسل ساجد سجود ہو آئے
اُمت رحمت بخش ہدایت تشریف پلائے

مخفی نانوں معشوق رکھ ظاہر شہباز کہ لائے
عشق کے جیتی چند بند اپنی آپ دکھائے
الان کما کان پھر آپس میں آپ سمائے

حقیقت

شکل بازی عشق کے چھوٹے چھو کوا نا
موتو قبل ان تموتو شا ہد ہے معنا
اونچا مندر ہر عشق کا کوئی کیونکر پاوے
چاروں سیویاں چڑھ کر توپے مارتا آوے
جی بیس دیوے پانوں تل تو بھی نا پاوے
دوئی دوئی تائی دور کر کیٹ واحد ہوتا
چاروں کپڑے کپڑے جال کر مجنوں ہو رہنا
پورا مفلس ہوے تو اسے کھیل چت لانا
سوے عاشق نبھیانہے دو موں جگ کہلارا
خواجہ نصیرالدین سائیاں نیت لکھے ہمارا
ننکہ کھیل توں پیندہ عشق کے تھاڑا

(۲) دوسری بیاض ہمارے عزیز محمد غوث صاحب ایم۔ اے عثمانیہ) کی توسط سے دستیاب ہوئی ہے۔ اس میں ایک طویل مخمس ہے جس کو خواجہ صاحب سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں " بندہ" تخلص ہے۔ مختصر انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

مخمس

کہاں لگ کھینچیا رہے گا توں دنیا کی پریشانی
جتے لگ فکر ہی دینے کی دنیا دیکھے تو ہے فانی
دنیا میں یوں ہمیں آئے کہ چوں آئے ہیں مہمانی
توں سٹ غفلت آپس تن کی کہ ہوشیار لے گیانی
سمجھ کر دیکھ ہے تجھ میں بنیٔ کا نور نورانی ؛

عدو ہے پے منی تیری بسر توں اس رہے ناکی
یہاں کی فکر دے سٹ کر توں کرنا فکر اوس جاکی
خدا سو پاک ہے آپی لگے خوش اس کینی پاکی
بہتر تن ہے تیرا نوری اوپر کا تن تیرا خاکی
ملا حکمت سوں کیتا خاک آتش باد ہور پانی

شریعت بات واجب کا چلی اوس ذکر سوں مل ہے
کیتے اوس روح نامیہ سو مضغہ اوس کا دل ہے
قیاس عقل اوس کا ہور میکائیل سو گل ہے ،
سو مبدا اوس شہادت جان ناسوت اس کا منزل ہے
دھری او نفس امارہ مقام ہے اس کا شیطانی

جو کوئی حق سوں ملے ہیں چلے نا ان سوں عیاری
کیتے باتاں کوں سبک ظاہر کریں ہر کس سوں مکاری
کیتے واصل ہوئے حق سوں کتے سوسی ہیں بھی خواری
ملے تو کیا ہوا حق سوں نہ سٹنا فعل مختاری
کیتے عاجز کوں اون میں کئے ہیں آپ کو قربانی
بندہ دو جگ میں اودل سون شہنشاہ مہبلی کا ہے
نہیں کل آج سرن یاران صحیح او اول ہے کا ہے
غزل کیوں نا کہی نادر کرم ایسے دلی کا ہے،
ثنا یو سب کیا سو ہیں دیکھو حضرت علیؓ کا ہے
نکر کرنے میں دیکھوں تو نہیں کوئی اس کا ہے

۳۔ تیسری نظم ہم کو مولوی سید تمکین کاظمی صاحب کے توسط سے ملی ہے جو کسی سید اکبر علی کے مملوکہ مخطوطہ سے ماخوذ ہے۔

نسخہ منجن

سُن تو سیانے میری بات | بولوں دارو میں کس دھات
جس کے مُنہ میں آوے باس | اس کی دارو سن مجھ پاس

جس کے منہ میں دکھے دات　　ہلتے جلتے گئے کے بات

وزن برابر سب کو تول　　دارو ہوے یوں انمول

داتوں کارن مسی کر　　خوبی کن تو دل ہیں دہر

زیرہ مرچیاں سنوا سفوٹ　　کتھا اجلا لے کر گھونٹ

نیلا طوطہ دھنیا بھون　　اس میں ملا تو سیندا لون

پان پلاس کے کاٹھیاں آں　　ماپھل لوجن اور لوبان

جوں جوں لگاوے پاوے سکھ　　تجھ دانتوں کا جاوے دکھ

دیگر

آنکھ کو ہلیلہ دانت کو لون　　حکیم کے گھر جاوے کون

دیگر

جتنا کاجل اتنا بول　　اوس سے دونا گوند گھول

دیگر

ذرا سی پھٹکڑی نمک لا تھوڑا　　قلم چلے جوں ترکی گھوڑا

خواجہ بندہ گیسو دراز کا موسومہ جس قدر کلام دستیاب ہوا۔ وہ درج کر دیا گیا ہے۔ اب یہ امر تصفیہ طلب ہے کہ کیا دراصل یہ کلام جو آپ

سے منسوب کیا جاتا ہے۔ آپ ہی کا ہے یا نہیں؟ ہم کو دکن کا جو قدیم سے قدیم کلام ملا ہے۔ وہ نظامی کا ہے۔

نظامی کا زمانہ ۸۶۳ھ کا ہے۔ اس کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہے جس کے بعض شعر یہ ہیں:۔

کہوں سدساجی نظامی دھرم ‎ ‎ پدم سب سُنے بات باجی کدم

شہنشاہ بڑا شاہ احمد کنوار ‎ ‎ پرت بال سینا کو تارا دھار

عطارد مسخر ہوا لے قلم ‎ ‎ مسخر کیا سور دسے ہت علم

اس کے کلام سے خواجہ صاحب کا کلام زیادہ صاف ہے۔ حالانکہ بلحاظ زمانہ تدریجی ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے قطع نظر ایسا کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے۔ کہ کلام مندرجہ بالا کو خواجہ صاحب کا ہی قرار دیا جائے بہت ممکن ہے۔ کہ یہ کلام یا اس میں سے بعض آپ ہی کا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ زمانہ بعد میں لوگوں نے آپ سے منسوب کر دیا ہو۔

چونکہ سردست قطعی ثبوت نہیں ملا ہے۔ اس لیے ہم اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن خیال ظاہر نہیں کر سکتے۔

بہمنی عہد حکومت کا ایک دکھنی شاعر

اب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے، کہ بہمنی دور (۷۴۸ھ سے ۹۳۲ھ) میں دکن میں اردو (دکھنی) کا رواج تھا، اور نہ صرف عام طور سے بول چال اور کام کاج میں اس کا استعمال تھا، بلکہ اوس نے تحریری مدارج بھی طے کر لئے تھے، چنانچہ اس کی نثر کے کئی نمونے دستیاب ہوئے ہیں، جن میں سے خواجہ بندہ نواز متوفی ۸۲۵ھ کے تصانیف اور ان کے شاگرد سید محمد عبداللہ حسینی کا رسالہ نشاط العشق کا ترجمہ مشہور ہے۔

لیکن اس عہد کی نظم کے صحیح نمونے ہنوز دستیاب نہیں ہوئے تھے نظم کا جو صحیح نمونہ ملا ہے، وہ ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ) کے دور کے شاعر وجہی کا کلام ہے جس نے سلطان عبداللہ قطب شاہ ۱۰۸۳ھ کے دور میں انتقال کیا تھا،

آج ہم ایک ایسے شاعر کا تعارف کراتے ہیں، اور اس کے کلام سے

ناظرین کو روشناس کراتے ہیں، جو عہدِ بہمنی سے تعلق رکھتا ہے، اس کا تخلص نظامی ہے اس کی ایک نامکمل مثنوی لطیف الدین ادریسی صاحب کے پاس تھی۔

مثنوی ناقص ہے، درمیانی اور آخری حصہ نہیں ہے، جو اشعار موجود ہیں ان کی تعداد تقریباً (۸۶۵) ہے۔ اس مثنوی کو کدم راؤ و پدم راؤ سے موسوم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان ہی دو شخصوں کا قصہ منظوم ہوا ہے، شاعر کے تخلص کی تصدیق حسب ذیل اشعار سے ہو سکتی ہے:۔

جو اونفیس نہ چپلی یوں کوئی   نظامی کدھیں سن برس نہ ہوئی
نظامی مے دہرو کہ کیوں رادھے   کہ پت درت کن پات دھن سودھے
کہوں سدساجی نظامی دھرم   پدم سب سنے بات بانجی کدم
نظامی کہنہار جب بار ہوئے   سہنا سن نغز گفتار ہوئے

اس مثنوی کو دورِ بہمنی کی مثنوی قرار دینے کے وجوہات حسب ذیل ہیں،

(۱) اشعارِ ذیل سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ مثنوی بہمنی دور کی پیداوار ہے

شہنشاہ بڑا شاہ احمد کنوار   پرتپال سینسا کرتار ادھار
دھنین ناج کا کون راجا ابھنگ   کنور شاہ کا شاہ احمد بھنگ

لقب شہ علی آل بہمن ولی ولی تہیں بہت بدہ تدا کلہی

(ب) مثنوی میں مختلف عنوانات ہیں، جن میں سے ایک عنوان حسب ذیل ہے :-

"مدح سلطان علاؤالدین بہمنی نور اللہ مرقدہٗ"

(ج) زبان کے لحاظ سے نہایت قدیم اور ابتدائی دکھنی کہی جاسکتی ہے کیونکہ اب تک قدیم سے قدیم جو کلام دستیاب ہوا ہے، اس سے بھی اس کی زبان زیادہ مشکل ہے۔

(د) رسم الخط کے لحاظ سے بھی یہ نہایت قدیم مثنوی قرار دی جاسکتی ہے اس کے بعد اب یہ امر تحقیق طلب ہے، کہ یہ مثنوی کس سنہ میں تصنیف ہوئی ہے، اس کے متعلق جو کچھ ہمارے معلومات ہیں۔ وہ صرف یہ ہیں، کہ یہ مثنوی علاؤالدین بہمنی کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے، اور اس کے شہزادہ کا نام احمد شاہ تھا، لہذا اب اس امر کی تحقیق ہونی چاہیئے۔ کہ بہمنی خاندان میں سے کن کن بادشاہوں کا نام علاؤالدین تھا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ خاندان بہمنی میں پانچ بادشاہ علاؤالدین کے نام سے گذرے ہیں۔ یعنی :-

(۱) علاؤالدین بہمن شاہ — بانیٔ خاندان — ۷۴۸ تا ۷۵۹ھ

(۲) علاؤالدین مجاہد شاہ — تیسرا حکمران — ۷۷۷ تا ۷۸۰ھ

(۳) علاؤالدین احمد شاہ ثانی — دسواں حکمران جو احمد شاہ کا لڑکا تھا — ۸۳۸ تا ۸۶۲ھ

(۴) علاؤالدین ہمایوں شاہ — گیارہواں حکمران — ۸۶۲ تا ۸۶۵ھ

(۵) علاؤالدین — سولھواں حکمران — ۹۲۷ تا ۹۲۹ھ

ان میں سوائے نمبر ۴ کے کوئی ایسا نہیں ہے جس کا شہزادہ احمد ہو صرف وہی ایسا حکمران ہے جس کا لڑکا احمد شاہ ثالث تھا، اور وہ ۸۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، اور ۸۶۷ھ میں فوت ہوا، اس کو اگرچہ مصنف تاریخ فرشتہ نے نظام شاہ سے موسوم کیا ہے، مگر جو سکّے ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ سے مضروب ہوئے۔ ان پر بادشاہ کا نام احمد شاہ مسکوک ہے۔

اس سے قیاس ہوتا ہے۔ کہ یہ مثنوی اسی عہد میں تصنیف ہوئی ہے اس قیاس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے، کہ شاعر بادشاہ کا مصاحب تھا، اور شاہی دربار سے اس کو تعلق تھا، چونکہ بادشاہ کا لقب عام طور سے نظام شاہ تھا، اس لئے بہت ممکن ہے، کہ شاعر نے اپنا تخلص بادشاہ کے نام پر نظامی قرار دیا ہو۔

احمد شاہ ثالث علاؤ الدین ہمایوں شاہ کا لڑکا تھا، صرف آٹھ سال کی عمر میں سریر آرا ہوا، اس کی والدہ نرگس خانم تھی، جو مخدومہ جہاں کے لقب سے تاریخ میں مشہور ہے، اس کی عقلمندی اور فراست سے بادشاہ کے صغیر سن ہونے کے باوجود نظم و نسق سلطنت میں کوئی خرابی آئی اور نہ دشمنوں نے قلمرو بہمنیہ سے فائدہ اٹھایا، اگرچہ محمود شاہ گجراتی نے سلطنت بہمنیہ پر حملہ کیا تھا، مگر ناکام رہا، مخدومہ جہاں نے محمود گاوان اور خواجہ جہان ترک کو مختار کل بنا رکھا تھا، اور ان دونوں کے حسن انتظام سے سلطنت کا کاروبار چلتا رہا۔

احمد شاہ کے انتقال کے متعلق ایک عجیب واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی بادشاہ کی شادی ہوئی اور شب زفاف کو آدھی رات کے وقت کمرہ سے شور ہوا۔ کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا، ممکن ہے قلب کی حرکت بند ہونے سے یہ موت واقع ہوئی ہو۔

مصنف مثنوی نظامی کے متعلق ہمارے معلومات کچھ نہیں ہیں، اس مثنوی سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے، کہ یہ بادشاہ کے دربار کا شاعر تھا اور کسی فخر الدین سے اس کو بڑا اتحاد تھا۔

مثنوی میں پہلے حمد ہے، اس کے بعد نعت، اسی میں منقبتِ صحابہؓ بھی ہے، پھر علاؤ الدین بہمنی کی تعریف، اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے ہر نیا مضمون نئے عنوان سے شروع ہوتا ہے، عنوان سرخی سے لکھا گیا ہے۔

اس امر کا ذکر ہو چکا ہے، کہ مثنوی کی زبان نہایت مشکل ہے، اس میں عربی اور فارسی کے بجائے ہندی الفاظ زیادہ ہیں، جیسا کہ عام طور سے اس زمانہ میں دستور تھا، ذیل میں مثنوی سے نمونہ کلام دیا جاتا ہے:-

ابتدا بسم اللہ کے ساتھ :-

گسائیں نہیں ایک و نہ جگ ادار — برو برو نہ جگ نہیں دینہار
اکاس اپچہ پاتال دھرتی نہیں — جہاں کچھ نہ کوئی تھا ہے تہیں

نعت :-

تہیں ایک ساچا گسائیں امر — سری وو دی تین جگ نو راد گر
بھٹایا امولک رتن نور دھر — کرتی ویک پلکت کرن راج کر
امولک مکت سیس سنسار کا — کرے کام نر دھار کرتار کا
محمدؐ جرم ادم سنسیاد نور — وو سبی جگ سری دے پو ساد نور

مدح سلطان علاؤ الدین بہمنی نور اللہ مرقدہٗ

بڑا شاہ وہ شاہ جس شا جگ   دہیں سیوتی جرم تسے پائے لک
انہیں شہ کیا شادر کھن دہرن   گگن دل دھرت دل مسخر کرن
عطارد مسخر ہوا لے قلم   مسخر کیا سور دے ہت علم
علم گارہ کہن سور چل سرا چاؤ   طبل دھول برغون بدل توں بجاؤ
چمکنے لگے جب کتک ہستیر   چرہاوا کیا دھرت اکاس پر
چمک بجلی تیون علم مجھ حسیون   علم سنگ تون گرج کہن چھوتوں

. . . .

شہنشہ بڑا . . . الخ

بعض دیگر مقامات سے نمونہ ملاحظہ ہو،

کدم راؤ رکھی رن دنہ آدھر   کہ رہن بات سن بات یک بت دھر
سنیا تھا کی ناری دھری بہت جھنبد   سویں آج دتیا تری جھند بند
دھنی جھند جب ہیں دھتیا جگ مین   تہنی وبل تھے تہیں ہوں پربارک ہیں
سجات ایک ناگن کجات ایک سانپ   اشکت دھنی کھلیں لاتب جہانپ
جو کرتار مجھ کون کیا ہوسے راؤ   اشکت کرکیوں دیکھ سکون انباؤ

پدم راؤ رہتیا ہیا کر دیں   کنڈل ہیراؤ بھا ہوا سرویں
کیپراتیرھو جیون رہیا تھا اڈھل   کمان ہو پر بانیکہ کی پائے تل
اجا سیس باہر کسے یکہ نبات   نہ یون کوئی نیوی نہ نا کہ جات
کہ توں ساچ میرا گسائیں کدم   پدم راؤ تجھ پاؤ کیرا پدم
جہاں تو دھر پاؤ ھور سرو ہرون   اپیں سار کی کت ترای کرون

لکھرا ھوی جو بات میں رانکر   کہی کونزوالیوں کہ منجکون پکر
اگر چور دجری باہوئے سپاہ   پکر کون تس بہتر کھوری باہ
نکر بان جی لوبے کرا کانتہ سنگ   نہ ہوتا کدمن کانتہ کو نہ بھنگ

اس مثنوی کا خط نسخ ہے، اعراب بھی دے گئے ہیں، اگ چ اور ٹ کے لئے کوئی علامت نہیں ہے اور یائے معروف اور مجہول میں کوئی فرق نہیں ہے۔

چونکہ مثنوی نامکمل ہے۔ اس لئے سنہ کتابت اور نام کاتب وغیرہ کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ کی تفصیل بھی دشوار ہے، کیونکہ اول تو ناقص ہے آخری اور درمیانی اوراق نہیں ہیں اور پھر زبان اس قدر مشکل اور دشوار ہے کہ

اوس کا سمجھنا ضرور کسی قدر دقت طلب ہے، بریں ہم اس مثنوی کے دیکھنے سے پایا جاتا ہے، کہ نظامی اپنے عہد کا باکمال شاعر تھا اور اپنے فن میں استادانہ مہارت رکھتا تھا ؎

معارف اکتوبر ۱۹۳۲ء

نورس مصنفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی

"نورس" کا مصنف ابراہیم عادل شاہ ثانی المخاطب بہ جگت گرو ہے ۔ جو بیجاپور کا چھٹا حکمراں تھا، اپنے چچا علی عادل شاہ اول کے مارے جانے پر ۹۸۸ھ میں مسندِ حکومت پر جلوہ گر ہوا، اور طویل و کامیاب حکمرانی کے بعد ۱۰۳۷ھ میں انتقال کیا،

اس کی حکمرانی کا دور علم و ہنر کی ترقی کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس نے علم کی ترویج میں جو کوششیں کی ہیں، وہ تاریخ دکن میں ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہیں گی علمی ترقی کے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں اس کا خاص درجہ ہے، بیجاپور کے تمام مورخ اس کے

علم و فضل اور علم پروری کے معترف اور مداح ہیں، جس کی تفصیل ہماری تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات میں کی گئی ہے (صفحہ ۱۹۸ تا ۲۰۵) ۔

اس کی سرپرستی میں کئی بہترین تصنیفیں ہوئیں، جن میں سے بعض یہ ہیں۔ ابوالقاسم فرشتہ نے اپنی مشہور و معروف تاریخ گلزار ابراہیم الموسوم تاریخ فرشتہ ۱۰۱۵ھ میں تالیف کی، ملا ملک قمی نے مخزن اسرار نظامی کا جواب لکھا عبدالرشید الیشکی نے علاؤالدین محمد بن ذکریا قزوینی کی مشہور کتاب عجائب المخلوقات کا فارسی میں ترجمہ کیا، نورالدین ظہوری نے اپنی مشہور تصنیفات لکھیں رفیع الدین شیرازی نے روضۃ الصفا کا خلاصہ کیا ؛

ابراہیم کو شاعری کا بڑا شوق تھا، خود بھی زبردست شاعر تھا، ابراہیم تخلص کرتا تھا، فارسی اور دکھنی کے نامور شعرا اس کے زمانہ میں موجود تھے، جو نہ صرف اپنے عہد میں بلکہ اپنی تصنیفات کی بدولت آج تک مشہور رہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں، ظہوری، ملک قمی، حکیم آتشی، مرزا محمد مقیم مقیمی، ملا شکیبی، دولت شاہ، عبدالقادر نورسی، نوری اور رامین وغیرہ،

سلطان نے دکھنی زبان کی خصوصیت سے سرپرستی فرمائی، شاہی دفتر کی زبان جو علی عادل شاہ کے زمانے میں فارسی کر دی گئی تھی، پھر سے دکھنی

ہوگئی، شعرائے دکھنی گو کا عروج ہوا، چنانچہ سلطان کے اسی شغف کا ایک
کارنامہ کتاب نورس ہے، اس کو خوشنویسی کا بھی بڑا شوق تھا خلیل خان
تمام خوشنویسوں میں ممتاز تھا، اس کو موسیقی میں اور خاص کر سرود ہندی
میں بڑی مہارت تھی، اس وقت کے تمام باکمال گویے بیجاپور میں جمع
تھے، اس کی اسی مہارت اور کمال کا ایک زندہ ثبوت زیر بحث مخطوطہ ہے۔

سلطان کو "لفظ نورس" سے بڑی محبت تھی، ۱۰۰۸ھ میں ایک قلعہ
بنام "نورس" تیار ہوا، ۱۰۱۳ھ میں ایک شہر آباد کر کے اس کا نام "نورس پور"
رکھا گیا، شاہی مہر پر نورس کندہ تھا، سکہ پر نورس مضروب تھا، سالانہ ایک
جشن اسی نام سے ہونے لگا، درباری شاعری کو نورسی کا خطاب دیا گیا، اسی
طرح بادشاہ نے اپنی تصنیف کا نام بھی "نورس" رکھا۔

یہ کتاب اس نے دکھنی میں لکھی ہے — افسوس ہے۔ اس کی تصنیف
کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہو سکا، مگر اس قدر پتہ چلتا ہے۔ کہ اس کی تصنیف
۹۹۰ھ اور ۱۰۱۵ھ کے درمیان ہوئی ہے، بعض قرائن سے معلوم ہوتا
ہے، یہ ۱۰۰۸ھ میں تصنیف ہوئی ہے،

اس وقت تک اردو علم ادب کی تاریخ میں جو نئی کتابیں شائع ہوئی ہیں

ان میں سے گل رعنا مولانا حکیم عبدالحی، تاریخ ادب مترجمہ مرزا عسکری، اُردوئے قدیم، اور اردو شہ پارے وغیرہ میں اس کا تذکرہ آیا ہے، اور ان میں بتایا گیا ہے۔ کہ خود ابراہیم نے (علم موسیقی) میں ایک کتاب ملکی زبان میں نورس نام تصنیف کی، اور ظہوری نے اس کا دیباچہ فارسی میں لکھا، جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے (گلِ رعنا صفحہ ۲۳۔ تاریخ ادب صفحہ ۷۵۔ اور اردو شہ پارے صفحہ ۳۴ - ۳۵ وغیرہ)

لیکن چونکہ ان میں سے کسی نے بھی اصل کتاب نہیں دیکھی تھی، اس لئے نفسِ کتاب کے متعلق ان میں زیادہ وضاحت موجود نہیں، اور بعضوں نے تو کتاب کا نام بھی غلط لکھا ہے۔ اسی طرح ابھی حال ہی میں بعض مضامین اس پر شائع ہوئے ہیں، لیکن وہ بھی زیادہ تر اردوئے قدیم سے ماخوذ ہیں۔ اب اس کے چند نسخوں کا پتہ چلا ہے، جو حسب ذیل ہیں :-

ا۔ عجائب خانہ حیدرآباد دکن

ب۔ کتب خانہ جناب نواب سالارجنگ بہادر

ج۔ کتب خانہ دفتر دیوانی و مال و ملکی حیدرآباد

۵؎ رسالہ عالمگیر کا سالنامہ ۱۹۳۲ء نوشتہ سید اسعد اللہ قادری

د ۔ کتب خانہ آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج ۔

ان میں سے پہلا اور تیسرا نسخہ ہماری نظر سے گذرا ہے جن کا تعارف ناظرین سے کرایا جاتا ہے ۔

عجائب خانہ کا نسخہ نسخ میں لکھا ہوا ہے، اعراب بھی ہیں، پ اور چ، کے سوا گ اور ڈ کے لئے بھی نیچے تین نقطے دیئے گئے ہیں ۔ اس کا کاتب عصمت اللہ ہے ۔ افسوس سنہ کتابت درج نہیں ہے، اوراق کی تعداد ۳۰ ہے ۔ ہر صفحہ میں چھ سطریں ہیں جن میں سے تین سطریں جلی اور تین خفی لکھی گئی ہیں، جدول مطلا ہے، یہ نسخہ بظاہر مکمل معلوم ہوتا ہے ۔ کیونکہ بسم اللہ اور خاتمہ کی عبارت موجود ہے، مگر دفتر دیوانی و مال کے مملوکہ نسخہ سے مقابلہ پر معلوم ہوتا ہے، اس میں تقریباً ۵۰ شعر کم ہیں،

اس عجائب خانہ کے نسخہ کا پہلا صفحہ سبز رنگ کا سیاہی مائل کاغذ کا ہے، اس صفحہ پر جو عبارتیں درج ہیں، وہ حسب ذیل ہیں :-

۱۔ "کتاب نورس بخط شکوہ . . . . . . ؟ قلمی بجلد سیاہ جمع کتاب خانہ معمورہ . . . . . ؟"

۲۔ "دریں تصنیف راگ شانزدہ دوہرہ دہ گیت چہار . . . . ؟"

(۳) "تصنیف ابراہیم عادل شاہ، مالک ایں کتاب نوَرسی"۔
اسی طرح نظم کے خاتمہ پر دو سطروں کی عبارت درج ہے، جو اگرچہ صاف معلوم نہیں ہوتی، تاہم جو واضح ہے۔ وہ حسب ذیل ہے :۔

"حضرت . . . جہاں پناہ خلد اللہ ملکہ، عجالہ باستکمال رسید
بید الفقیر عصمت اللہ"۔

ابتدا، حسب ذیل عنوان اور شعر سے ہوئی ہے :۔

انچلی در مقام کوری

سید محمد میرے دل پر نانو — جیون رسول کر لکھے عرش تہانو

خاتمہ ذیل کے شعر پر ہوا ہے :۔

رام گیری راگنی کستوری — سیا سو کیس کیسی دھملا

اس کے برخلاف دفتر دیوانی کے نسخہ میں ابتدا اور خاتمہ کے اشعار بالکل جداگانہ ہیں جس کی صراحت آگے آتی ہے۔

لفظ نورس کئی ایک مقام پر لایا گیا ہے، مثلاً :۔

بن بیچ تھاوی نورس کا آتی — بھر بھر دار دہ پیالا پلانی

سہلا نورس کلیان بدھاوے   ابراہیم گرگنی گاوے

نورس کا دگپت کنچن کن گنج ہتی   جم جم جیو آتش خان سدا

ایک کرونذی واوز دوجی پابی   پہتک پکیت نورس کاوت اتیتی

ابراہیم پایا اتم ملنساری نورس

کئی جگہ سید محمد کا نام آیا ہے جس سے سید محمد گیسو دراز مراد ہیں، اگرچہ عجائب خانہ کے نسخہ میں صرف سید محمد ہی درج ہے۔ مگر دفتر دیوانی کے نسخہ سے اس کی تشریح ہوتی ہے جس میں لفظ گیسو دراز مذکور ہے:۔

حضرت محمد جگتر کر گستائیں   تو در گد چپک میر دسن سازہ ص۱۲۰ الف

ابراہیم جاپے اتم بریادان دھرم   سید محمد کر دھائی کریم کرن تا ص۱۲۱ ب

میرانیر[۱۳] سکنـدر رہو ادھوونڈی   سید محمد ابراہیم کون دکھانگری [۱۴ الف]

ایک جگہ چاند بی بی کا ذکر آیا ہے :۔

سب سندری دیکھیا یون بچپن ہے کہاں   جات چاند سلطان نا نوپی ابی ملکے جہاں

چاند سلطان (چاند بی بی) ابراہیم کی چچی تھی، ابراہیم اس شعر[۱۵] میں اس کے حسن کی تعریف کرتا ہے، جو موجودہ مشرقی تہذیب میں معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ دفتر دیوانی کا نسخہ خاص حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ شاہی کتب خانہ بیجاپور کا اصلی نسخہ ہے،

اس کا خط بھی نسخ نہایت عمدہ ہے، جدول طلائی ہے، اس کا کاتب خود سلطان کا استاد عبداللطیف ہے، اس نسخہ پر ابراہیم کی دستخط موجود ہے، ۱۰۲۲ھ ہجری میں یہ نسخہ شاہی کتب خانہ میں داخل ہوا ہے مخطوطہ پر اس کی صراحت موجود ہے، اس نسخہ کی ابتدا یوں ہوئی ہے :۔

دوہرا

نورس سورجگ جیگ جواں سـرو کنی،

پوست سرسنی ماتا ابراہیم پرساد بھتی ودرنی

خاتمہ کے اشعار یہ ہیں :-

سُمامی عنبر بتیاں پھرائے   شربت گھول امرت پلائے
بادل وما ے بجلیاں بجاوے   باجی خالو نستابی آنے پاوے
سہل نورس کلیان بدھاوے
ابراہیم گر کتی گاوے

اب تک خیال یہ تھا کہ " نورس " فن موسیقی کی کتاب ہے اور اس میں راگ راگنیوں کی تفصیل و تشریح درج ہوگی ۔ مگر دراصل اس میں نہ ہندی راگ راگنیوں کے اقسام یا ان کے قواعد درج نہیں ہیں ۔ بلکہ بعض راگوں کے تحت دکھنی نظمیں لکھی گئی ہیں ۔

مختصر نمونہ کلام حسب ذیل ہے :-

مقام بھیرو

دنیا گھیرا بھرے چند نادود   اوپر نرمل سکا سوچ چاند سود
لال موسوں نگر کیسی ہست   پر سیج رہے نیچ سیج سست
اس فراقوں ہوا نکرتے تنکر ولا   سمرن کیتی سب سے چوں چوں ملا
تیرا دھان امرت اب مرنا مشکلا

ناچھوڑیا چاوے دھان جو جیو دسے سکول

کون پنڈت یو د دیدہتی راکھول

ابراہیم ملیں یو سب مشکل اکھول

کمت دسی جیو جسندر دیدیا　　کبھی غلیف دھر موتیوں خونا

جیون دیپک ہیں دسی مدہ ناکٹ نکینا　　مشک عبیر چھپائی انکھنا

سیوی رہ بزچل ذوالقعد اینا

ابھوک

پوت نبی کا پدر مردانا　　جس ثیک برس ہوے زینا

ابراہیم خان پہ رسول ہواستا　　جیون نوازش سب بخشے گنا

ابھوک

دہنی بوا نار جیو ملکی جھساری　　سندر ہمدر سنگات کرتار کنازی

ابراہیم اکتیں جتل سندر نترو نتا دری

بین

ایک بہت رند ترا نرسول جگل کرا　　داہن بلیو ڈست جات گسائیں لشبورا

گاس گرت گنجرا پرشتہ چہر مرد کربا

در مقام نوروز نورس

سید محمد پتی پیرا   جیوں رتن میں اتم ہیرا

محل محل صدر سنواری   اس نونے بہشت اپاری

انند ہوتا ہے سدا بہاری   ارتی لیائے انبر بھر ناری

کردم کستوری جوا چندر لالی   بادل کاں سی ہر رنگ دس پر ساری

شمامی عنبر بتیاں پھرائی   شربت گھول امرت پلائی

بادل دمامے بجلیاں بجاوے   باجی خالو آشتابی آنے پاوے

سہلا نورس کلیاں دھاوے

ابراہیم گر کنی گاوے

امید ہے۔ کہ اس وضاحت سے نورس کا ایک خاکہ ذہن نشین ہو جائے،

(معارف)

خاور نامہ دکھنی

یہ ایک دکھنی رزمیہ مثنوی ہے۔ جو بعہد محمد عادل شاہ بیجاپور (سنہ ۱۰۳۷ھ تا سنہ ۱۰۶۷ھ) تصنیف ہوئی ہے۔ چونکہ یہ فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے، اولاً اصل فارسی کتاب کے متعلق صراحت کی جائے۔

خاور نامہ فارسی ابن حسام کی تصنیف اور سنہ ۸۳۰ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزم میں اور دو نسخے انڈیا آفس میں موجود ہیں۔ برٹش میوزم کا نسخہ باتصویر ہے، جو ۹ رمضان سنہ ۱۰۹۷ھ میں لکھا گیا ہے، اس کا ذکر فارسی قلمی نسخوں کے کیٹلاگ کے صفحہ (۶۴۲ نمبر ۱۹۷۹۹) پر درج ہے، اس کو مول چند ملتانی نے نواب کمال الدین خاں کے لئے لکھا ہے،

انڈیا آفس کا ایک نسخہ باتصویر ہے جس کا سنہ کتابت درج نہیں ہے دوسرا نسخہ بلا تصویر ہے۔ یہ جمادی الاول سنہ ۹۶۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کاتب محمود بن عبدالرحمٰن ہے؛

ابن حسام کو بعض اصحاب حسام الدین اور بقول بعض محمد حسام کہا جاتا ہے قہستان کا باشندہ، اپنے زمانہ کا نامور باکمال عربی اور فارسی کا شاعر تھا،

خاور نامہ کے علاوہ اس کی دیگر تصانیف بھی ہیں۔ بعہد عمر مرزا ابن تیمور گورگاں
۸۷۵ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ "خوسف" میں مدفون ہے +

اس نے خاور نامہ کو شاہ نامہ فردوسی کی تقلید میں لکھا ہے، اس لئے اس کو
فردوسی ثانی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے' ابن حسام نے خاور نامہ میں
فردوسی کی تعریف کی ہے +

اس کتاب میں کسی بادشاہ کی مدح نہیں ہے اور مصنّف نے ظاہر کیا ہے
کہ صرف ایک روٹی پر گزر ہوتی ہے، چنانچہ لکھتا ہے :-

بیک قرص تا شب از بام گاہ   قناعت کنم چو خورشید و ماہ
شکم چوں بیک نان تواں کرد سیر   مکش منت سفرۂ اردشیر

ایتھے انڈیا آفس کے کیٹلاگ کے مصنف کا بیان ہے کہ اس کتاب کا
مواد ایک عربی کتاب سے لیا گیا ہے، تصنیف کی تاریخ خود مصنف کے بیان
کی ہے :-

چو بر سال ہشتصد بیفرودسی   شد ایں نامۂ تازیاں پارسی
مرا ایں نامہ را خاوران نامہ نام   نہادم بر آنکہ کردم تمام

انڈیا آفس کے باتصویر نسخہ میں علی ابراہیم خان نے ۱۱۸۹ھ میں کتاب

اور مصنف کے متعلق مختصر فارسی نوٹ درج کیا ہے، جو حسب ذیل ہے:—

"نام این کتاب خاورنامہ۔ نام مصنف این کتاب ابن حسام است، کہ فاضل و شاعر کامل ساکن قہستان من اعمال خراسان بود، اشعار در عربی و فارسی بسیار گفتہ است، اینکہ خاوران نام ولایتی ست از خراسان و مسکن مصنف این کتاب از توابع خراسان است و نیز بسبب اینکہ خاوران در لغت مشرق و مغرب را گویند و بقول مصنف این فسانہ ہا در مغرب زمین رودہ او بنابرین خاورنامہ نام نہاد، و این خاورنامہ در مملکت ایران خاصہ در اصفہان و خراسان شہرت داد، اگرچہ اصل این حکایتہا از صورت راستی معرا است، ابن حسام مصنف خاورنامہ مذکور در وقت شیخ عمر مرزا ابن امیر تیمور بسال ہشت صد ہفتاد و پنج ہجری وفات یافت و در قصبہ خوسف من اعمال خراسان مدفون شدہ +

الحال کہ سال یکہزار ہفتصد و ہشتاد و نہ عیسوی ست بحساب سال ہجری فوت ابن حسام" مصنف خاورنامہ را سہ صد و بست و ہشت سال گذشتہ و مجموعہ ابیات خاورنامہ بست و سہ ہزار ہفتصد و سی و پنج بیت بشمار آمدہ و مجموعہ تصویرات این کتاب یکصد و پنجاہ و بست صفحہ ۹ اوراق است

"مجموعۂ اوراق ایں کتاب سہ صد و ہشتصت و دو ورق است، واغلکہ ایں کتاب بفرمایش بادشاہ یا امیر والاجاہ تیار شدہ باشد، کنندۂ علی ابراہیم خان"

در ۱۷۸۹ء

کتاب میں کس قصّہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کا ہیرو کون ہے؟ ان امور کی صراحت آگے کی جائے گی،

جیسا کہ قبل ازیں میں نے لکھا ہے۔ "خاور نامہ دکھنی" اس فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے، جس کو رستمی نے بیجاپور میں کیا ہے؛

جہاں تک میرا خیال ہے، اس کتاب کا کوئی نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے اس لحاظ سے اس کتاب کے متعلق جن جن اصحاب نے صراحت کی ہے، وہ اصل کتاب کے علم کے بغیر صرف کٹیلاگون کے معائنہ سے کی ہے اور بعض جگہ قیاسات کو بھی دخل دیا گیا ہے، جو واقعات کے خلاف ہوتا ہے، مثلاً بیان کیا گیا ہے کہ اس میں محاربات حضرت علی علیہ السلام مذکور ہیں"۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ شاید حضرت علی رضؓ کی خلافت کے جنگوں کا ذکر ہوگا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے،

رستمی کے تخلص کے متعلق یہی غلط فہمی ہوئی ہے، اور بجائے رستمی کے

رسمی" خیال کیا گیا ہے، حالانکہ رستمی ہی صحیح ہے ۔
یہ کتاب کس نے لکھی؟ کب لکھی؟ کیوں لکھی؟ ان امور کی صراحت میں اپنے الفاظ میں کرنے کے بجائے، اس فارسی عبارت کو درج کرنا مناسب خیال کرتا ہوں جو اسی کتاب کے آخر میں درج ہے اور جس کے مواد سے مرتبین کیٹلاگ نے استفادہ کیا ہے :-

سبب منظوم کردن خاور نامہ دکھنی آں بود کہ علیا جناب خورشید نقاب قدر افزائے دیہیم عفت مسند آرائے کشور عصمت، زینت بخش علیای مخدرات مجلس آرائے حجرات طاہرات والا مرتب سمو مناقب خدیجہ سلطان شہربانو الملقب بڑی صاحب دامت عفتہا و عصمتہا کہ بصدق و یقین و تقین و صدق خود را کنیزک پنج تن پاک حضرت بہترین امام پیشوائے عظام متقدل اکرام حضرت دوازدہ امام علیہ الصلوٰۃ والسلام، و حضرت فاطمہ زہرہ رضہ اخدیجہ کبریٰ رض و چہاردہ معصوم پاک کہ . . . . . . ؟ درج شرفناک و نیر اعظم برج لولاک اند خوانده و صبیہ طیبہ شاہ گردون بارگاہ، قطب فلک عز و جاہ سلطان محمد امین قطب شاہ ابن قطب شاہ است و خواہر نیکو سیر شاہ گیتی پناہ کسریٰ کلاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ ابن قطب شاہ است و زوجہ شاہ سلیمان

بارگاہ جم قدر سکندر سپاہ خاقان فریدون فر، قیصر الامنظر سلطان دین پناہ ابوالمنصور سلطان محمد غازی عادل شاہ ابن ابراہیم عادل شاہ است، و والدہ صالحہ ارشد ارجمند کامگار موید منصور بختیار قرۂ ناصرہ دولت و اقبال غرۂ ناصیہ حشمت و جلال سعادت مند ابدی و ازلی شاہزادۂ عالم و عالمیان شاہ علی مد ظلہ را چنین بخاطر رسید کہ خاور نامہ فارسی اگر بزبان دکھنی منظوم شود بہتر است پس فرمود . . . کہ ایں کتاب خاور نام را بزبان دکھنی منظوم کند او را بمراحم گوناگوں شاہانہ و عواطف بوقلموں خسروانہ ممتاز فرمودہ، از ابنائے زمان و سخنوران دوران سرفراز گردانم، بنا براں محرمان سراپردۂ عظمت تفحص بسیار و تردد بے شمار ایں مژدہ بہجت افزا و بشارت دل کشا بہ کمال خان ابن اسمٰعیل خطاط خان دبیر کہ دبیر قدیم ششم کرسی درگاہ عدالت پناہ است و بزرگانش بخطاب خطاط خاں نوازش یافتہ اند طبع نقادش در فن شاعری مہارتے تمام دارد و در سلک نظم و نثر در ناسفتہ را سفتہ آوردہ، و در اشعار تخلص خود رستمی کردہ و در قصائد و غزلیات فارسی و دکھنی بلاغت از حد بردہ رسا بندند (۹)

رستمی حسب الفرمودۂ بلقیس زماں وصوف اعصاف بے کران قبول

این معنی گشته رستمایہ زخش فصاحتِ فارسی را میدانِ بلاغت دکھنی جولان داده ہر بیت فارسی را بہ بیت بیت دکھنی انتظام داده نامش خاور نامہ دکھنی کرده از تائید ربانی واز فیض سبحانی بست و چہار ہزار بیت در یک سال ونیم تسوید نموده ترقیم وترتیب کتاب نمود از توفیق الٰہی باتمام رسید،

امیدوار درگاه مجیب الدعوات اندکہ کار فرمائی این کتاب را از نخل بخت وعمر برخوردار گردانید ومراد دل بر سپاند، مولف ونویسنده وسامعہ وخواننده را نیز از فضل خویش بی بہره نگذارد ●

بیان مندرجہ بالا سے بخوبی واضح ہے، کہ کمال خان کا تخلص رستمی صحیح ہے نہ کہ رسمی جیسا کہ بعض اصحاب کا خیال ہے۔

اشعار میں بھی متعدد جگہ جہاں تخلص آیا ہے، وہاں رستمی ہی لکھا گیا ہے چنانچہ کہتا ہے :۔

کیا ترجمہ دکھنی ہور دلپذیر بولیا معجزه یو کمال خان دبیر
خلق کہتی ہے مجھ کو کمال خان دبیر تخلص سو ہے رستمی بے نظیر

کیا رستمی اس وقت یو کتاب بندیا بات کی گوہران بے حساب

خاور نامہ دکھنی کیتا ہوں نام   ہوا خاور ان پر قصہ سب تمام

شے ادمے جو ستی اچھے مجھ مدام   کرے رستمی کون ادعالی مقام

رستمی کے تخلص کے متعلق فیلن نے بھی دھوکہ کھایا ہے، مگر اس کا دھوکہ کھانا ناگزیر تھا، کیونکہ گارسی' ڈی تاسی کا تذکرہ اس کے پیش نظر تھا جس میں رسمی مذکور ہے، اس پرنگر کے کیٹلاگ اور اسٹوارٹ (Stewart) کی کیٹلاگ میں یہ کتاب شریک نہیں ہے،

یہ کتاب جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے سلطان محمد عادل شاہ ابن ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں مرتب ہوئی ہے، سلطان کا زمانہ حکومت ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۶۷ھ تک ہے

محمد عادل شاہ اپنے باپ کے بعد مالکِ تخت و تاج بنا، باپ کی طرح بھی ارباب کمال کا قدردان اور اہل علم کا سرپرست تھا، اس کے دربار کے شاعر حکیم آتشی نے خمسہ نظامی کا جواب لکھا تھا،

سلطان کے حکم سے نواب خاں بابا نے رفیع الدین حسین شیرازی کی کتاب احوال السلاطین دکن کو مکمل کیا، حکیم آتشی کے سوا ابراہیم خاں دوسرا مشہور شاعر

تھا، جو قصائد اور غزلیات میں ید طولیٰ رکھتا تھا، سید نور اللہ مرزا مقیم، مرزا دولت
شاہ دوسرے شعرا تھے ۔

سلطان کی طرح اس کی ملکہ بھی علم و فن کی قدر دان تھی، جس کی بہترین دلیل
خاور نامہ ہے۔ ملکہ خدیجہ سلطان شہربانو گولکنڈہ کے حکمران سلطان محمد قلی
(۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کی پوتی اور سلطان محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ)
کی بھتیجی اور سلطان عبد اللہ قطب شاہ کی بہن تھی ۔

۱۰۴۰ھ میں محمد عادل شاہ ابن ابراہیم عادل شاہ بیجاپور سے بیاہی گئیں
کمال خان رستمی، اسمٰعیل خان کا لڑکا تھا، اس کو اور اس کے بزرگوں کو سلاطین
عادل شاہی کی جانب سے خطاط خان کا خطاب عطا ہوا تھا، رستمی اپنے عہد
کا نامور ادیب باکمال شاعر تھا، فارسی کے ساتھ ساتھ دکھنی میں بھی ید طولیٰ
رکھتا تھا، صرف خاور نامہ اس کی قابلیت اور لیاقت کی بین دلیل ہے، اس
نے قصائد اور غزلیات بھی کہے تھے، مگر افسوس اب وہ سب ناپید ہیں ۔

خاور نامہ جیسا کہ بیان کیا گیا، ڈیڑھ سال میں لکھا گیا، اشعار کی تعداد
چوبیس ہزار ہے، اس کی ترتیب ۱۰۵۹ھ میں ہوئی ہے، خود مصنف کہتا

نبی کی جو ہجرت تھی کہتا خیال ہزار پر پچاس اور نو کی تھی سال

کیا رستمی اس وقت یو کتاب بندیا بات کی گوہراں بے حساب

خاور نامہ دکھنی فارسی کا ترجمہ ہے، مگر ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اصل تصنیف معلوم ہوتی ہے اور یہی اصلی خوبی ہے' یہ رزمیہ مثنوی ہے، اس کی جو خوبیاں ہیں' ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں :۔

ا۔ یہ اردو کی سب سے پہلی ضخیم مثنوی ہے' نہ تو اس سے پہلے اور نہ آج تک ایسی ضخیم رزمیہ مثنوی اردو میں لکھی گئی۔

ب۔ یہ سب سے پہلی رزمیہ مثنوی ہے' اور پھر پہلی ہی نہیں' بلکہ آخری بھی کیونکہ ایسی ضخیم رزمیہ مثنوی اردو میں کوئی نہیں ہے'

ج۔ ضخیم ہونے کے باوجود اس کا تسلسل بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا'

د۔ سلاطین عادل شاہی کے رزم و بزم کا اندازہ ہو سکتا ہے، کیونکہ ترجمہ میں ان امور کا داخل ہونا ناگزیر تھا' جو اس وقت کی معاشرت اور تمدّن کے لوازمات تھے'

(و) مثنوی میں کئی سو تصاویر ہیں۔ جن میں سے بعض کی صراحت حسب ذیل ہے :۔

(۱) بروج آسمان (۲) حضرت آدم فرشتوں کو تعلیم دے رہے ہیں (۳) مسجد النبیؐ (۴) فردوسی اور بہشت (۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معہ صحابہ رضؓ (۶) ابو المحجن و سعد وقاص (۷) کوہ نور (۸) جنگ نو اور راز سعد (۹) مقابلہ نوادر و سعد (۱۰) شکست سپاہ نوادر (۱۱) سوداگران و حضرت علیؓ (۱۲) حضرت علیؓ و بادشاہ زنگیان، وغیرہ،

ان تصاویر سے بعض تو پورے صفحہ پر ہیں اور بعض نصف اور ربع صفحہ پر بعض مقامات پر ایک صفحہ پر دو دو تصویریں ہیں، کل تصویروں کی تعداد ۸۳ ہے، ان میں مختلف رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے اور رنگ میں خصوصیت بھی رکھی گئی ہے، مثلاً شب خون حملہ کی تصویر ہو تو زمین سیاہ دی گئی ہے، دریا کا منظر ہو۔ تو نیلگوں رنگ استعمال کیا گیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کی تصویر جہاں دی گئی ہے، وہاں چہرہ ظاہر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ہر جگہ ایک نقاب سے گردن تک پوشیدہ کر دیا گیا ہے، ان تصاویر سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے، ان میں سے چند کی صراحت کی جاتی ہے۔

ا۔ جو لباس ان تصاویر میں استعمال کیا گیا ہے، اس سے عادل شاہی تمدن کا اندازہ ہوتا ہے مسلمان مرد و عورتوں کا لباس کیا تھا، ہندو مستورات

اور مرد کس قسم کا لباس پہنا کرتے تھے، اس کا پتہ چلتا ہے، کہ بعض ڈاڑھی صاف کرواتے تھے، کسی کی مونچھ زیادہ لمبی ہوتی تھی، ہندو مرد دھوتی کا استعمال کرتے تھے، ہندو عورتیں ساڑھی کو پیچھے ٹوپ دیا کرتی تھیں، مسلمان مرد لمبی قبا تنگ آستینیں کی استعمال کرتے تھے۔ بعض اوقات ایک نیم آستین قبا اس پر ہوتی تھی، پائجامہ کبھی تنگ اور کبھی گھردار استعمال ہوتا تھا، عام طور پر عمامہ باندھا جاتا تھا، جس کو کبھی پہنے بھی ہوا کرتے تھے، جنگ کے وقت خود استعمال ہوتا تھا، عورتوں کے لباس میں لہنگا دامنی اور چولی کا رواج تھا۔ پیٹ صاف طور پر نظر آتا ہے، آج تک جنوبی ہند (مدراس) میں غریب مسلمانوں کا یہی لباس ہے ؛

مسلمانوں میں عام طور پر نماز اور عبادت کا دستور تھا، مذہب کو زندگی کا جزو لاینفک تصور کرتے تھے، دعا مانگی جاتی تھی، اور اس کو اثر پذیر خیال کیا جاتا تھا، امرا کے کھانے کے وقت ملازم نوال سے مکھی اڑایا کرتے تھے، مختلف کھانے ایک ساتھ دسترخوان پر چن دیئے جاتے تھے، صراحی بردار پیچھے استادہ رہا کرتے، دوست ملاقات کے وقت بغل گیر ہوا کرتے بادشاہ موسیقی سے بہرہ اندوز ہوتے، تخت کے ساتھ کرسی کا رواج تھا۔

نجوم پر اعتقاد تھا، بلا نجوم کوئی کام نہیں کرتے تھے، ماتم کرنے کا دستور تھا اور بوقت ماتم سر کے بال کھول دیا کرتے تھے، عورتیں بعض دفعہ سینے کے اوپر کا حصہ کھلا رکھتی تھیں، سوتے وقت اکثر لباس تبدیل نہیں ہوتا تھا، بادشاہ کے سوتے وقت لونڈیاں پہرہ دیا کرتی تھیں، ان سے کسی قسم کا حجاب یا پردہ نہیں ہوتا تھا، ان کی موجودگی میں ملکہ پہلو میں سویا کرتی، غرض کہ اس طرح اس زمانہ کے تمدن کی ہر شے ان میں نظر آتی ہے، گو کئی ایک چیزیں اب بھی ہمارے تمدن میں داخل ہیں، اس لئے وہ ہمارے لئے نئی نہیں، مگر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی ان کا رواج اور دستور تھا۔

(ب) جہاں ان تصاویر سے اس وقت کے بزم کے حالات معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح رزم کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، جنگ کے ساز و سامان آلاتِ حرب، طریقۂ جنگ، بری و بحری جنگ، جنگی جہاز وغیرہ کی صراحت ہوتی ہے، آلاتِ حرب میں تلوار، نیزہ، تیر، گرز، ڈھال وغیرہ استعمال ہوتے تھے مختلف رنگ کے "علم" دھریرے، ہوا کرتے،

ج۔ فرشتوں، دیو اور پریوں کی تصاویر سے معلوم ہوتا ہے، اس زمانہ میں فرشتوں کو عورتوں کی شکل دی جاتی تھی، دیو سیاہ بدشکل مہیب صورت میں

بنائے گئے ہیں، ان کے سر پر سینگ بھی ہوتے تھے۔

اس صراحت کے بعد اب میں نفس مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، اس کے متعلق مصنف کیٹلاگ بلوم ہارٹ نے جو وضاحت کی ہے، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

"ایک فارسی نظم کا دکھنی ترجمہ جس میں حضرت علیؓ اور ان کے رفقا مالک اور ابو المحجن کے لڑائیوں کا ذکر ہے مصنف کمال خاں رستمی"۔

"مؤلف اردوے قدیم لکھتے ہیں :-

"خاور نامہ نظم ہے، اور شاہ نامہ فردوسی کے جواب میں لکھا گیا ہے، اس میں امیر المومنین جناب علی علیہ السلام کے محاربات مذکور ہیں"۔

رسالہ تجلّی میں دکھنیات کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں مضمون نگار صاحب نے اس کے متعلق جو صراحت کی ہے، وہ یہ ہے :-

"یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے، اور اس میں حضرت علیؓ اور آپ کے صحابی حضرت مالک اور حضرت ابو المحجان کے جنگی کارناموں اور محاربات کو بیان کیا گیا ہے"۔

ان تصریحات سے نفس کتاب کے متعلق کوئی صحیح اور واضح روشنی نہیں

پڑتی۔ چونکہ اصل کتاب کا کوئی نسخہ غالباً ہندوستان میں نہیں ہے، اس لئے اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ معلومات حاصل کرنا ناممکن تھا۔

بیشک اس میں حضرت علیؓ اور آپ کے رفقا کے محاربات کا ذکر ہے، مگر کیا اصلی محاربات خلافت ؟ نہیں بلکہ ایک فرضی داستان ہے، یہ فرضی داستان قصّہ امیر حمزہؓ کے بالکل مشابہ ہے ممکن ہے مصنف خاورنامہ نے اس فارسی قصّہ امیر حمزہ کو جو سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں تصنیف ہوا تھا دیکھا ہو۔

اس میں بتایا گیا ہے، ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کی مجلس میں صحابہؓ کی بہادری کا ذکر ہو رہا تھا، کوئی کسی کا نام لیتا تھا، کوئی کسی کا کسی نے سعد وقاصؓ کو ترجیح دی، جس پر ابوالمعجن کو ناگوار ہوا۔ اور بعد برخاست مجلس دونوں میں رنجش کی صورت اختیار کرلی، ابوالمعجن بالکل نوجوان تھا، اور حضرت علیؓ سے فنونِ جنگ کی تعلیم حاصل کی تھی، سعد وقاص نے ابوالمعجن سے لڑنے کے لئے جنگل کی راہ لی جہاں ابوالمعجن آیا اور سعد سے بیان کیا، کہ وہ اس امر کا ارادہ رکھتا ہے کہ ملک مغرب کو لڑائی کے لئے جائے، اگر وہاں مارا جائے۔ تو خیر ورنہ کامیابی کا سہرا رہے گا، سعد نے بھی اس کو پسند کیا، دونوں مل کر روانہ ہوئے،

کچھ مدت سفر کے بعد ایک ملک میں پہنچے جہاں کے بادشاہ کا نام ہلال بن علقمہ تھا، یہ اور اس کے تمام اہل شہر مسلمان تھے، اس نے تین دن تک دونوں کی مہمانی کی اور جاتے وقت ایک لشکر ساتھ کرنے کا ارادہ کیا، مگر انہوں نے انکار کیا۔ اسی طرح تنہا روانہ ہوئے، نو روز کی مسافت کے بعد دسویں دن ایک دوسرے ملک میں جس کا نام کوٹہ نور تھا پہنچے، یہاں کا بادشاہ نوادر نام تھا، اول تو اس نے خاطر تواضع کی اور ان کے ارادہ سے واقف ہو گیا، بعد ازیں مخالفت ہو گئی اور ان سے جنگ ہوئی مغلوب اور مجبور ہو گیا۔ تو ایک دوسرے بادشاہ قنطار شاہ سے مدد کا طالب ہوا، اس عرصہ میں آنحضرت صلعم کو سعد اور ابوالمعجن کے ملک مغرب کو جانے کا حال معلوم ہوا، اور حضرت علیؓ ان دونوں کی مدد کے لئے روانہ ہوئے، اثنائے راہ میں حضرت علیؓ کا بادشاہ زنگیاں سے مقابلہ ہوا، اور وہ مسلمان ہوا، اس کے بعد حضرت علیؓ قنطار شاہ کے مقابلہ کو روانہ ہوئے، یہاں آپ کی سعد سے ملاقات ہوئی، مگر ابوالمعجن شرم سے دوسری جانب چل دیا، قنطار شاہ کے مقابلہ ہوا اور وہ گرفتار ہو کر حضرت علیؓ کے پاس پیش ہوا،

ابوالمعجن یہاں سے روانہ ہو کر "پولاد کوٹہ" گیا، جہاں رعد اور عمار سے مقابلہ ہوا، قنطار شاہ کے مقابلہ کے بعد حضرت علیؓ ملک خاور کی جانب روانہ

ہوئے، اثنائے راہ میں کئی بادشاہوں سے مقابلے ہوئے اور کئی جنگیں ہوئیں
پولاد کوہ میں حضرت علیؓ اور ابو المعجن میں نادانستہ مقابلہ ہوا، مگر کوئی کامیاب
نہیں ہوا، اسی عرصہ میں حضرت علیؓ پر غنودگی طاری ہوئی، اور خواب میں معلوم
ہوا وہ ابو المعجن تھا، اس کے بعد دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اب سعد اور ابو المعجن
آپ کی رفاقت میں رہے، اسی عرصہ میں آنحضرت صلعم نے عمر بن امیہ کو حضرت
علیؓ کی مدد کے لئے روانہ فرمایا، جنہوں نے اپنی عیاری سے ہر جگہ بڑی مدد
دی اور ان کی عیاری سے بڑا کام نکلا، ان ہی جنگوں میں کئی دفعہ طلسم کشائی
اور دیووں وغیرہ سے لڑائی ہوئی، جس میں حضرت علیؓ کامیاب ہوتے رہے،
اکثر مقاموں پر خضر راہ نمائی، اور مدد کے لئے آتے ہیں، اس طرح مختلف جنگوں
جو بری اور بحری دونوں ہیں، بیسیوں طلسم کشائی کے بعد کئی بادشاہوں کو مسلمان
کر کے حضرت علیؓ مع رفقا بہ فتح و فیروزی مدینہ منورہ کو تشریف لاتے ہیں، اور
آنحضرت صلعم اور امام حسنؓ اور حسینؓ سے ملاقات ہوتی ہے۔

یہ ہے مختصر سا خلاصہ اس مضمون کا جو بڑی تقطیع کے (۱۰۸۶) صفحوں میں آیا
ہے، کتاب کے پورے صفحہ پر (۳۸) شعر آتے ہیں، جیسا کہ خاتمہ کی عبارت سے
واضح ہے، جو بیس ہزار شعر ہیں،

اس کے بعض اندراجات کی صراحت ذیل میں کی جاتی ہے جس سے نفس مضمون کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

اس میں حسب ذیل بزرگوں کا ذکر اور ان کی تصاویر موجود ہیں :۔

حضرت آدم علیہ السلام، ابراہیمؑ ۔ موسیٰؑ ۔ سلیمانؑ ۔ یونسؑ ۔ خضرؑ ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۔ حضرت علیؓ ۔ امام حسنؓ ۔ امام حسینؓ ۔ جبریلؑ ۔

جن جن بادشاہوں کا ذکر آیا ہے اور ان سے مقابلہ ہوا وہ یہ ہیں :۔

ہلال شاہ ۔ نوادر شاہ ۔ قنطار شاہ ۔ بادشاہ زنگیاں ۔ قباد شاہ خاوران سلیمان شاہ ۔ جمشید شاہ خاوران ۔ بادشاہ فیل گوشاں ۔ جمار شاہ ۔ فیروز شاہ ، ناہید شاہ ، طماس شاہ ، قبط شاہ ۔ شاہ سک ۔ صلصال شاہ ۔ ہرمز شاہ ۔ پرویز شاہ ۔ رانقص ،

ان کے منجملہ نوادر اور رابض کو ابوالمحجن نے قتل کیا ہے ، قبط شاہ ۔ اور صلصال شاہ حضرت علی رضؓ کے ہاتھ سے مارے گئے ، جمشید شاہ ، شاہ سک طماس شاہ معہ اپنے بہن کے مسلمان ہوتے ہیں ۔

ان بادشاہوں کی جانب سے جو سپہ سالار مقرر ہو کر میدانِ جنگ میں آئے ۔ اور مقابلہ کیا ۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں :۔

ہلال، جو فنطار شاہ کی طرف سے آیا تھا، رعد، میر سیاف۔ قباد۔ ایلاق ترک اس کو سعد نے قتل کیا۔ میر زنہار خوار یہ مسلمان ہو گیا۔ شاہ پور، اس کو مالک نے قتل کیا، فرہاد، عمار، شاہ خاوران کی جانب سے آیا تھا کشیپ، ہوما، نوشاد جمشید کی جانب سے حضرت علیؓ کے مقابلہ کو آیا تھا، اردشیر، یہ بھی جمشیدی تھا۔ آدم کوتوال شہر ربیع، اسفندیار، بہمن اس کا مالک سے مقابلہ ہوا۔ اور قتل ہوا شلاد کاموس، شیبان۔ شہپال، جادوگر، گلباد، ابوالمحجن سے مقابلہ ہوا، خنجان قرطاس اس کو بھی ابوالمحجن نے قتل کیا، ارغوان کوہی، سمراق، پیل زور، ابوالمحجن کے ہاتھ سے مارا گیا۔ سرہال، صلصال شاہ کا سپہ سالار تھا، گوراب، گرز در د۔ توزاد، کیو، عاد، نورادین، سام، یہ سب صلصال شاہ کے جنرل تھے اور اکثر قتل ہوئے۔

داستان میں عورت کا ذکر آنا ناگزیر ہے، چنانچہ اس مثنوی میں جن عورتوں نے حصہ لیا ہے۔ ان میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

دل افروز، دختر نوادر، جس سے سعد نے بیاہ کیا، گل چہرہ، دختر جمشید شاہ پریرخ، زن جمشید، خواہر جمشید، گلنار، گل اندام، شمامہ صلصال شاہ کی ملکہ اس کے قتل ہونے پر مسلمان ہوتی ہے، فرطاس شاہ کے حرم، طہماس شاہ کی بہن،

ناہید شاہ کی دختر، پری کوہ بلور،

حضرت علیؓ کے جن جن رفقاء اور ان کے کارناموں کا ذکر آیا ہے، اور جن کا داستان میں بڑا حصہ ہے۔ وہ یہ ہیں:-

ابو المحجن، سعد، مالک، عمر امیہ، قنبر، خالد، فتاح، عمرو معدیکرب، سلیم جعفر طیّار۔ علیؓ کی طرف سے عیاری میں عمر ہیں اور طرف ثانی کی جانب سے مہیار اور طرب قابل ذکر ہیں، مگر عیاری میں بلکہ داستان میں سب سے بڑا حصہ عمر امیہ کا ہے، جیسا کہ داستان امیر حمزہ میں ہے۔

مثنوی میں جن جن شہروں اور مقاموں کا ذکر ہے، اور جہاں جہاں لڑائیاں ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

کوٹہ نور، ریاض کوٹہ، ضمال کوٹہ، پولاد کوٹہ، بندرگاہ سلیمان، شہر جم، شہر خاوران، قلعہ صول، قلعہ صور، حصن ربیع، بت خانہ، رہن باغ، حماد کوٹہ، بت خانہ دیوازمید، قلعہ آہن، شہر سمت، کوٹہ بلور، قلعہ آدمی خور، شہر عرض، کوہ طلسمات حصار، برنج، حصار ظلمات، طلسم بلور، شہر مرصع، ویران حصار، شہر عام، شہر زر میل گوہر نگار، شہر زریں، رباط اول، دوم، سوم، باغ زریں، حصن شیطان،

ان بادشاہوں کے لشکروں کے سوا بعض اور لشکروں کا ذکر اور ان سے مقابلہ ہوا ہے، چند کے نام بیان کیے جاتے ہیں، لشکر آدمی خوار، لشکر دیوان لشکر پریاں، لشکر جادوگراں، لشکر کلاہان، لشکر فیل گوشاں۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے، یہ فرضی داستان ہے جس میں صدہا امور غلط اور ناممکنات سے ہیں، مثلاً دیووں، پریوں، بھوتوں سے جنگ کرنا، خلاف قیاس اژدہوں، شیروں، ہاتھیوں سے مقابلہ طلسم کشائی اسی قسم کے صدہا واقعات ہیں۔

یہ سب کچھ تو غلط ہے، اور قصہ کی حقیقت صرف افسانہ ہی ہے، مگر جو امر قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ ہے کہ زمانہ سلف میں تبلیغ اسلام اور اشاعتِ دینِ محمدیؐ کی ہر وقت دھن رہا کرتی تھی، اور وہ قصہ کہانیوں میں بھی اس کو نظر انداز نہیں کرتے تھے، خاور نامہ کے مطالعہ سے بہ صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے کہ مصنف کو تبلیغِ اسلام کا کیسا شوق تھا۔

نفس کتاب میں جن جن عنوانات پر بیان ہوا ہے، جن کی سرخیاں قائم کی گئی ہیں، اس کا اندراج طوالت سے خالی نہیں، بریں ہم بطور نمونہ چند درج ہیں، دکھنی خاور نامہ کی سرخیاں فارسی میں ہیں :-

۱۔ گفتار جمع آسمان

۲۔ گفتار در صفتِ آدم زاد و قدر و منزلتِ ایشاں۔

۳۔ فی المناجات۔

۴۔ صفتِ مدینہ۔

۵۔ صفتِ شب است (اسی میں فردوسی کی تعریف ہے)

۶۔ آغازِ داستان خاور نامہ

۷۔ صفتِ شب و خشم گرفتن ابوالمحجن و سعد وقاص رضؓ۔

۸۔ داستان با نوادر۔

۹۔ فرستادن نوادر سپاہ را بکار روان زدن۔

۱۰۔ داستان نوادر

اس تفصیل کے بعد اب دکھنی نظم کا نمونہ مختلف مقامات سے پیش کیا جاتا ہے جس سے نہ صرف کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے، بلکہ شب کا سما، جنگ کا سین، شب خون حملہ، بحری جنگ، دو شخصوں کا مقابلہ وغیرہ امور پر بھی کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔

ابتدائی کتاب

حمد

اول[1] جب کیا یو کتاب ابتدا — بندیا بات میں نقش نام خدا

جو صاحب ہے او عقل ہور جان کا — کیا دین بخشش او ایمان کا

او ہے ایک صاحب اپر ہور تلین — جو ہستی پر اس کی گواہین ہمیں

فردوسی کی تعریف :-

جو شاعر تھا فردوسی پاک زاد — اچھو حق کی رحمت سوں اوبھوت شاد

دنیا میں ہوئی بات استی پند — ہوا شعر تھی بھی انی یہ ہند

ہو شعر اس خوب آپلے روال — کیا از پچوا نال کیا از خسروال

کیا نامہ او خلق میں نام دار — رہیا جگ میں اپن تیج یو یادگار

اسی طرح چند شعر لکھنے کے بعد آخر میں کہتا ہے :-

اس یک بیت پر بہشت اس کو دیا — ملک بات کا اس کو بخشش کیا

صفت بھوت توحید میں اس کروں — مگر میں بھی یک نکتہ ایسا کہوں

---

[1] چونکہ مجھے کوئی اور نسخہ اس کتاب کا دستیاب نہیں ہوا۔ اس لئے صحت کا موقع نہیں تھا اس لئے بجنسہ کلام پیش کیا گیا ہے۔

جو آپس بختی تھی ہوئی دولت منجے،
بلندی دیوی ہور رحمت منجے

اصل قصہ کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے:۔

جو مسجد میں انصا کی بیت الحرام   رسولِ قریشی علیہ السلام
مبارک وقت کون جو یک نامدار   جو بیٹھے تھے مسجد میں اس وقت شاد
زبان کھول یاران ہر اپس میں اپنے   تھورا بھوت ہر یک لگے بولنے
بولیا ایک جوان مالک نامدار   نہ ہوسی دنیا میں بھی دسرا سوار
بولیا سعد وقاص مجھ سار کا   نہیں کوئی مجلس میں مجھ کار کا
جوان ایک بوالمعجن اپس ناؤ تھا   جو مردی میں اس ناؤ سب تہا نو تہا
ہنر کا دو اول میں روشن اتھا   ہنر سب او حیدر سے سکیا اتھا
اونچی ہور نچی بات آئی درمیان   عمر جا بگی لے کر آیا وہاں

ایک شب کا سین ملاحظہ ہو:۔

آیا تھا زمین پر بلی جون شاہ زنگ   زمین ہور زماں کون لیا یا تھا پی تنگ

سفیدی پی کھلیچی تھی مکہ پر نقاب پرند سیہ پہنا تھا آفتاب
زمین پر عنبر کا منڈپ تھا تمام سوا کون سراپردہ تھا مشکفام
زمین پر تو سنبل تھا نہیں تھا سمن کیا تھا پی سو پس کا کسوت چمن
کیا تھا محل کی بستر شاہ چین صبا جی کا تھا مرغ بھی خواب میں
زمین ہور زمان میں پی کاجل بھریا انگار جا کر جگ میں پھول بھر رہیا
جتی مرغ ماہی کون تھا بہوت خواب زمین کون دے رنگ آسمان بانتاب
فلک نو طبق گوہراں سون سنوار
ہوا کون پی زیور کیا صد ہزار

شب زفاف کے متعلق صراحت دیکھو :-

دل افروز ہور سعد کون واں لیجا کیئے عقد دونوں کا سب لوگ جا
زن و مرد کا کام جوں سب ہوا اٹھی بات ساری محل میں ادجا
ستارے اتی جتنے سب رات کون چھپی دیکھ کر راوجت کالی ہوان
عروس صبح کی جو نکہ جلوا کری فلک کی پی مجرے تھی بہار آپہری
علی بھی بولائی دل افروز کون کہی اچہ توں ناپن یو نچ بھی دل سون

ابوالمحجن اور رعد کا مقابلہ ملاحظہ ہو:-

آیا رعد اپس پر جا نو فیل مست — چمکتی لیا رعد سپی تیغ دست
ودباگان لڑکے لے کر شمشیر تیز — زمین پر کئے آپس دقت ستیخیز
مارے اس اپر ہر طرف تھی بی تیر — سپر سوں کھیا دیا نپا اپنا اوس پر
سپر کی ہلن بجلی دستی رتھی تیغ — دستی بجلی جون ابر میں بید ریغ
غصّے سوں مارے زخم ہور یوں لڑے — جو سر تھی سپر نگرے ہو کر اتری
جوانان کی بازو تھی شمشیر یوں — ہوئی تھی جو چوکان سپر گیند جون
سوار رعد کی آپس تھی میدان میں — ہوئی دیکھ حیران اس سب جتن
آخر کو ابوالمحجن نامدار ، — کیا سرا پر رعد کی تیغ باز
سپر لیا یا سر پر او جنگی سوار — دو ٹکڑے ہوا او سر جون خیار
سپر کاٹ کر تیغ اتری ملار — کالی ترک پولاد سر ایک بار
چلیا رعد کی سر تھی بھی لعل خون — ہوا ترک پولاد سوں سرنگوں
ماریا گرم ہو غصّے سوں پہوان — کاٹیا زین ہور سب تمام کستواں

اسی سر تھی بھی پا نو تک دو کیا
اس تیغ زین سوں باندیا

بحری جنگ کے حالات ملاحظہ ہوں :-

انو بولے نوبت بجا از فراز | جو جھکر لگے نوبت بجی بان پی باز
بہی کشتی میں تھی ایراے نقیر | بہری دریا اوپر تمام آکر تیر
دو کشتی یو تیران تھے اپرے | نہنگاں پی او دیکہ جھکر اوسرے
سپہ کون دریا او پیچ گوراب دل | جگر کی لہو سون سیراب دل

. . . .

ہر یک طرف کشتی سون کشتی لگی | نہیں کوئی لڑنے تھی اس میں بچکے
سر نیزہ سنیان سون گستاخ ہو | ہوئی بہوت کشتی میں سوراخ ہو
ہوا مردیاں تھی دریا سارا سیاہ | جو کشتی کون جانی نہیں ابری راہ

نن مردیان سون جا گا سارا بہریا
لہو کی جانو دستی تھی سب دریا

شب خون حملہ کا ذکر دیکھو :-

کہا دل سون او بہی شب خون کریں | لہو سون تمام دشت جیحون کریں
ہر یک ملک تہی لشکری لیا یا ہون | انو ہات بھی جب یکر اس لاہوں

لیا چن کر لشکر او پنجاہ ہزار ۔۔۔ کیتی تھی سواراں جو او کارزار

شبخون کی نیت سوں او آئے بہا ۔۔۔ علی کے او لشکر پہ کتے ہزار

انہی رات کالی او ظلمات سی ۔۔۔ نہیں تھا جست زہرہ ہور مشتری

جو اس رات میں مالک رزم خواہ ۔۔۔ طلاوہ او پرتا تھا لے کر سپاہ

اتھی سات اس مرد جن کی ہزار ۔۔۔ طلاٹے کوں نکلیا تھا او نامدار

نگہ کر گرد دیکھا انین گشت میں ۔۔۔ سپہ آتا سوں دیکھا انین دشت میں

انین جانیا لیا یا شبخوں سپاہ ۔۔۔ ہوا ایک طرف چھوڑ لشکر کی راہ

کیا بانگ لشکر میں او بھی بلند ۔۔۔ کہ ہشیار اچھو سب جنین زورمند

جو لیا یا ہے خاور زمین اپنا سپاہ ۔۔۔ تمن لیو شمشیر ہور باندو راہ

. . . .

کیا خاوراں بھوت کوشش کرو ۔۔۔ لئو تیغ ہور تیرہ جو کشش کرو

نکو چھوڑ رو ایکیں کوں جانی کوں بہا ۔۔۔ مگر سر پہ ہی اس کے نہیں تھی تلوار

سپنیکا جو یو حیدر نام دار ۔۔۔ رونا چہو رسی چھیتیاں بھی یکسوار

ہلیا جیتنا لشکر یو لیا جو نکہ شاہ ۔۔۔ طادی کی اسپاس ایا سپاہ

جون آیا برسنی ابہال تیغ و تبر ۔۔۔ او پر پیا بہت مرداں پڑا بر قیر

طاوے کی شمشیر لے ہات میں ‏ ‏ سراں بہوت کاٹی اسی سات میں
بہت کوتیاں مالک لے گرز گراں ‏ ‏ کاریا سرزاں کی بھی سر تہی واں
ہوا کالا واں دشت سب گرد تہی ‏ ‏ پچھانی نہیں ایسی واں مرد بھی
چمکتی تھی بجلی ہور تیغ واں ‏ ‏ پسناری ہو دستیاں سنہاں وہاں
کالی رات ہور گرد ہور تیغ تیز ‏ ‏ کہوا سپنتی بھی کیسی رستخیز
شبخوں کا لشکر ہوا کہا برا ‏ ‏ کیا خاوران جھکرت میں دل بڑا

دو فوجوں کا مقابلہ ملاحظہ فرمائیں :-

آئی درمیان سواران تمام ‏ ‏ اتہی ہاتھ میں تیغ آئینہ فام
لی شمشیران پر انو کھولے دست ‏ ‏ کیئے مار کر سرفراز یکون پست
مارے تیغ جس سرا پہ سرفراز ‏ ‏ دو نیمہ کیئے گھوڑا گھوڑا سوار
بہی جس گردن اوپر مارے تیغ کون ‏ ‏ دو ٹکرا لیا سرنت سوا سرنگوں
دلیران کی لہو تھی دشتاں اندروں ‏ ‏ جون دریا میں موج ماری بخون
ہوئی جتنی اسپان پولاد نعل ‏ ‏ پڑی سم تہی دم لگا و در آب
تمام دشت و صحرا بری دست و پائے ‏ ‏ چلے ان اپر سب جنگ آزمائے

شان ہمی ورزیر بغل سوار کاٹی کی تھی شمشیر سون جو خیار
دیکھی جو نکہ یاران حیدر کہ تیغ جانو سو لہو چہر کی او بسیدریغ

عمر وامیہ کی ایک عیاری کا حال اس طرح بیان کیا ہے :-

گیان اس کے نزدیک پچاڑہ تن اد ھسر و کنین جا کیان انجمن
او بتاں اُنو کرخندہ ہور نوس لب اپنہاں جانڈ تمن اددر تیرہ شب
اتھا مکہ ان کا جانو نو بہار تمام خوش شکل تازیان ہور ایدار
اتھا بول شیریں ورفتار خوش اتر گیت گایاں فی بسیار خوش
یکس فی لیائی شادمانی رپی بجائے جو نکہ اسپنار اد چنگ نی
سراپردہ میں رہتے اد از تھے جواد سپازو یکہ زہرہ لی ساز تھے
تون بولے گا زچرخ کبود بجائے کون زہرہ فلک تھی فرود
کنیزان جنیاں رقص کیتا دہاں رہا حین پر سنبل بی دنیال دہاں
عمر نے نظر کیتا از زیر تخت سنوار یا آپس کون بھید گو نہ رخت
عروسان کی نمن سنواریان اد تن آیا بہار اد دیکہ کر انجمن
پرستاران اس جھور کر سب کیاں بجاتے تھی ہو رنا چتی تھی رہیاں

نہیں کوئی رہیا جز عمر ہور شاہ ۔ سنگیا عمر جانے ازاں بارگاہ
ماریا ہاتھ طہماس دامن پراس ۔ نگیا ہات سپینس نی تن پراس
بولیا شاہ سوں اومیں آن توم ۔ ہیں یک از پرستندگان توام
صبوری نوں جو میں تن تھی کپڑی نکال ۔ شراب پی کر کرتی ہوں ملکہ جوں کلال

. . . .

عمر نے کہڑے یک کیا انتظار ۔ کیا پکی تھی نیسند میں شہریار
او آہستی سوں گیا تخت پر ۔ جو شہ نے نہیں پایا اتھی خبر
ماریا او لکد بر سر شہر یار ۔ لیا سر تھی اس تاج گوہر نگار
انی بار کہ تھی کہا ہیک بہار ۔ نگہبان دیکھی نکو ایک بار
کیا غلبلا و انی طہماس کرد
کہ رقاصان نے تاج میرا ببرد

صلصال شاہ کی ملکہ شمامہ کا ماتم کرنا :-

بزاں رونا بھی اپس پر آغاز کی ۔ ماتم کا اپی شیوہ بھی باز کی
او یوں بولی اسے بادشاہ جہاں ۔ دولت سوں اتہا توں پناہ جہاں

دنیا تجھ پناہ میں آسودہ تھی　　تری دور ظلم تو کچھ نہ تھی
ترے داد تھی ظلم کوتاہ تھا　　ترا تاج پی افسر ماہ تھا
توں بیدار کرفتنہ درخواب تھا　　زمین تیغ تل تیری سیراب تھا
اتاں ائی خرابی کار جہاں　　اپرایا سب روز کار جہاں
اتاں شاہی کا تخت بی شہ ہوا　　توں روشن جیب تھا سو جون مہ ہوا
اتاں ہیں ہور یو سو و ضیع کا پی درد　　انکیاں تر ہوئیاں خشک ہور آہ سرد

زمانہ جو یوں دکھلایا مجھے،
انجو کی جاگی لہو رلایا مجھے

ذیل کے اشعار پر یہ مثنوی ختم ہوتی ہے :-

سنوار یا ہوں سن نامہ سوں خامہ کوں　　نہایت کون ایزایا ہوں نامہ کون
نہایت سوا نامہ ٔ نامدار　　سوا نامداران اپر یادگار
اگر مانٹی ہوے گا تن زیر خاک　　میرا نام جتیائے مجھ کیا ہے باک
نبی کی جو ہجرت تھی کیتا خیال　　ہزار پر پچاس اور نو کی تھی سال
کیا رستمی اس وقت یو کتاب　　بندیا بات کی گوہران بے حساب

خاور نامہ دکھنی کیتا نبوں نام ہوا خاوران پر قصہ سب تمام
اپس اد پر بہت گذریگا روزگار اچیکا یو دنیا میں ہور یادگار
نو اس نامی کون نامہ شاہ جان
دوجی نامیان پر شاہ دلخواہ جان[1]

(معارف نامہ ۱۹۳۰ء)

علی عادل شاہ ثانی المتخلص بہ شاہی کا ہندوستانی کلیات

(۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ ہجری)

یہ ہمیں معلوم ہے کہ بیجاپور کے آٹھویں حکمران سلطان علی عادل شاہ ثانی کا تخلص شاہی تھا اور وہ عموماً اردو زبان میں طبع آزمائی کیا کرتا تھا، مگر آج تک اس کے کلام کے متعلق کافی تفصیلات سے آگاہی نہیں تھی۔

آج سلطان کے کلیات کا ناظرین سے تعارف کرایا جاتا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ ہم کو برہان پور سے دستیاب ہوا تھا۔ اور اب وہ دفتر دیوانی و مال سرکار نظام (حیدرآباد) کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

---

[1] چونکہ ہندوستان میں اس مثنوی کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ اس لئے کلام کا نمونہ کسی قدر زیادہ دیا گیا ہے۔

اس کلیات کے تعارف سے پیشتر خود سلطان علی عادل شاہ ثانی کی سوانح زندگی کو مختصراً بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔

بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں میں سلطان علی عادل شاہ ثانی آٹھواں تاجدار رہے، جو سلطان محمد عادل شاہ کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔ ۱۶ ربیع الثانی ۱۰۴۸ھ کو بیجاپور میں پیدا ہوا۔ چونکہ سلطان محمد کو اس سے پہلے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اس کے تولد پر بڑی خوشی منائی گئی، غربا کو خیرات تقسیم ہوئی، علماء شعرا اور امرا کو جاگیر و مناصب سے سرفراز کیا گیا۔ شعرا نے قصیدے پیش کئے اور تاریخیں نکالیں، منجملہ ان کے خواجگی آقا نے جو قطعہ موزوں کیا تھا، اس کا مصرعۂ تاریخی حسب ذیل تھا:-

۶۔ مولود شہزادہ گفت کوکب شوکت رسید

خوش قسمتی سے شہزادے کو نگرانی اور تربیت کے لئے خدیجہ سلطانہ شہر بانو جیسی خاتون دست یاب ہوئی۔

سلطانہ شہر بانو گولکنڈہ کے محمد امین قطب شاہ کی دختر نیک اختر تھی۔ جس زمانے میں سلطانہ شہر بانو نے ہوش سنبھالے ہیں۔ گولکنڈہ اپنے عہد زریں سے گزر رہا تھا، اس کے دادا سلطان قلی اور بھائی سلطان

عبداللہ اور خود اس کے والد نے اپنی ذاتی دلچسپی اور انہماک سے جو علمی فضا پیدا کر دی تھی وہ ہر صاحب ذوق کے لئے ممد حیات تھی، سلطانہ شہر بانو نے اس فضا میں رہ کر وہ سب کچھ حاصل کیا جس کی ایک زیرک شاہزادی سے توقع کی جا سکتی ہے، شادی کے بعد جب بیجاپور آئی۔ تو یہاں بھی اس کے خسر حکمت گرو کی پیدا کی ہوئی۔ وہ علم آموز اور دانش بیز ہوا چل رہی تھی۔ جو ارباب علم کے لئے مفرح ذات تھی، خود سلطان محمد عادل شاہ کی ذات میں سلطانہ شہر بانو نے ایک ایسا شوہر پایا تھا جس کی گھٹی میں علم پروری نے بھی بڑا حصہ پایا تھا۔

اس سراپا علمی فزا میں جس ہستی نے زندگی بسر کی ہو اور جو خود بھی بذاتہٖ شوق و ذوق علم کا مجسم پیکر ہو۔ اس نے علم و ادب کے لئے کیا کیا نہ کیا ہوگا۔ رستمی کا خاور نامہ جو چوبیس ہزار کی اردو رزمیہ مثنوی ہے اور ملک خوشنود کی ہشت بہشت اور یوسف زلیخا خدیجہ سلطانہ شہر بانو کی سرپرستی کی زندہ یادگاریں ہیں:

اس علم دوست اور ادب نواز سلطانہ کے دامن عافیت میں جس تعلیم و تربیت کا انتظام ہوا، اس کے بوجوہ کامل احسن و بہتر ہونے میں کوئی شبہ

نہیں کیا جا سکتا، لائق معلم اور قابل ترین مودب شہزادے کی تعلیم و تربیت پر مامور کئے گئے، آگے چل کر شہزادے نے ایک نامور ادیب، بلند پایہ شاعر قابل مدبر اور نبرد آزمائی میں آزمودہ کار جنرل اور ایک شاہ سرآمد روزگار کی حیثیت سے امتیاز حاصل کیا، تو وہ نتیجہ تھا ایک ایسی تربیت کا جو شاہی خاندان کے ارکان کو اقبالمندی کے عین شباب میں شاذ و نادر ہی میسر آتی ہے۔

باپ کے انتقال پر محرم ۱۰۶۷ ہجری میں انیس سال کے عین زمانہ شباب میں سلطنت کی باگ ہاتھ میں لی، درباری شاعر عبد النبی نے

نوبت شاہی زادہ بعد محمد علی

سے تاریخ نکالی۔

محمد عادل شاہ کے زمانہ ہی میں سلطنت عادل شاہی کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا تھا، علی نے جب حکمرانی کی باگ ہاتھ میں لی۔ تو اس نے اپنی سلطنت نہ صرف بیرونی مخالفوں میں گھر پائی۔ بلکہ خود ارکان حکومت اور امرا ملک میں بغض و عناد کی تباہ کن آگ شعلہ زن دیکھی۔ مغلیہ شہنشاہیت کی پالیسی اب اس امر کی مقتضی تھی۔ کہ دکن میں بھی عظیم الشان مغل سلطنت کا خطبہ و سکہ چلنے لگے۔ شاہ جہان صاحب قران کی جانب سے اورنگ زیب

۳۲۴۹۱

خلد مکان نے عادل شاہی قلمرو پر تاخت کی اور بیدر و کلیانی پر شاہجہانی علم لہرا دیا اور خود بیجاپور کی باری تھی۔ کہ شاہ جہاں کی علالت کی خبر آئی اور نگ زیب نے عارضی صلح کر لی ؂

اورنگ زیب سے صلح کے بعد عادل شاہی دربار نے ابھی سنبھالا نہیں تھا کہ اسی اثنا میں سیواجی نے حکومت کے خواب دیکھنے شروع کئے، عادل شاہی سپہ سالار افضل خاں کا سیواجی کے ہاتھوں دھوکہ سے مارا جانا تاریخ کا ایک غمناک اور درد انگیز واقعہ ہے، اس جرم کی سزا دینے کے لئے سدی جوہر المخاطب صلابت خان روانہ کیا گیا، صلابت خان سیواجی کی سازش کا شکار ہو گیا۔ اور دونوں شیر و شکر ہو گئے، اب خود سلطان نے فوج کشی کی، سیواجی کا فرار ہونا صلابت خان کا قلعہ پنالہ میں محصور ہو کر طالب عفو ہونا اور پھر سرتابی کرنا اور بالآخر شکست کھا کر انتقال کرنا سب کچھ تاریخ کے مشہور واقعات ہیں، تفصیل کی ضرورت نہیں ؂

علی عادل شاہ کے مصائب کا سلسلہ اسی پر ختم نہیں ہوا، سلطنت عادل شاہی اعداء کے نرغے میں تھی لیکن سلطان نے اپنی فراست و دانشمندی اور قابلیت کے بل بوتے پر ان مشکلات پر غالب آنے کی کوشش کی چنانچہ

سلطنت میں کچھ اضافہ بھی ہوا، ملیبار اور بدنور وغیرہ فتح ہوئے سلطان نے کرناٹک کے جانب توجہ کی تھی۔ کہ سیواجی نے پھر سر اٹھایا، اورنگ زیب کے حسب خواہش علی عادل شاہ نے سیواجی کے قلع قمع پر کمر باندھی دربار مغلیہ سے بھی جے سنگھ کی سپہ سالاری میں فوج روانہ ہوئی، ابھی فوج آئی نہیں تھی۔ کہ سیواجی عادل شاہی لشکر سے مقابلہ کی تاب نہ لاکر پونہ کی جانب فرار ہوگیا، مغلیہ فوج نے پونہ کا محاصرہ کرلیا، سیواجی کی سازش جے سنگھ پر بھی کارگر ہوگئی۔ دونوں مل کر بیجاپور پر حملہ کے لئے روانہ ہوئے، دو سال کی مسلسل ناکامی کے بعد مغلیہ فوج واپس آگئی۔ اس کے بعد سیواجی نے پھر ہاتھ پیر نکالے لیکن صلح ہوگئی۔

اب خود سلطان کا پیمانہ عمر بھی لبریز ہوگیا اور پینتیس (۳۵) سال کی بھری جوانی میں سولہ سال کے عہد حکومت کے بعد سفر آخرت اختیار کیا" پادشاہ دین علی کرد وطن برجنان" تاریخ وفات ہے (۱۰۸۳ھ)

سلطان علی عادل شاہ ایک منصف مزاج، دادگستر اور رعیت پرور حکمران تھا، علم و فضل کا قدردان اور خود بھی ذی علم تھا، نہایت خوش مزاج رنگین طبع اور لطیفہ گو، بذلہ سنجی میں مہارت تامہ رکھتا تھا، شعر و سخن میں

ید طولیٰ حاصل تھا، علماء و فضلا اور شعرا کا قدردان تھا۔
سلطان کو فنونِ لطیفہ سے اچھا ذوق تھا، شاعری اور موسیقی میں مہارت تھی، عمارت سے دلچسپی تھی، متعدد قصر و محل تعمیر کئے تھے۔
اس کی علمی قدردانی اور ذوقِ شاعری کے متعلق عالمگیری مورخ خافی خان لکھتا ہے :۔

"بادشاہ بود باہوش، سپاہ دوست و در سخاوت و شجاعت و وسعت خلق مشہور فضلائے و صلحا را دوست داشتے و شاعران را حرمت نمودے، خصوص درحقِ شاعرانِ ہندی زیادہ مراعات می فرمود"۔

اسی طرح ابراہیم زبیری نے بساتین السلاطین میں لکھا ہے :۔
"چوں طبع ہمایوں بادشاہ اکثر میل بجانب لغت خاص خویش یعنی زبان دکھنی داشت، برطبق الناس علیٰ دین ملوکہم شعرائے ہندی گو بسیار از خاک بیجاپور برخاستہ اند، خانہ بخانہ ہنگامہ شعر تازہ گوئی گرم داشتہ اند"۔ (ص ۴۲۴)

سلطان علی نے جب حکمرانی کی عنان اپنے ہاتھ میں لی۔ تو بیجاپور اس مرحلہ سے گزر رہا تھا جس سے ہر حکومت کو ترفہ کے بعد گزرنا لازمی ہے، اور جو دراصل انحطاط و زوال کا پیش خیمہ ہوتا ہے، اس وقت بیجاپور کی عام

معاشرت میں سادگی، بلند مشربی، اور عالی دماغی کا وجود نامود ہونے لگا تھا تمدن اور رسمی شائستگی میں پیچیدگی اور تکلف بے جا نے اپنی جگہ پیدا کر لی تھی، عالی شان عمارات کی زیبائش اور آراستگی میں سونے کو پانی کی طرح بہایا جاتا تھا، زاہد فریب سانیوں اور گل رخسار حرموں نے عیش وطرب کے وہ وہ سامان مہیا کر دیئے تھے، جن سے انسانی زندگی اپنے اس جوش اور انہماک کو بالکل فراموش کر چکی ہے۔ جو قوموں اور حکمرانیوں کی روح ہے، سلطان علی نے آنکھ کھولی۔ تو اس ماحول میں، اور ہوش سنبھالے۔ تو اس ماحول میں اور زندگی ختم کی۔ تو اس ماحول میں، لیکن اس کے باوجود اس نے کوشش وسرگرمی کا جو حق ادا کیا وہ عجوبہ ہے۔ ذاتی حیثیت سے بادشاہ نے علم وفن کی جو قدر دانی فرمائی اور شعرا اردو کی خصوصیت سے جو سرپرستی ہوئی اس کے لحاظ سے شاعری کا تواب گھر گھر چرچا تھا۔ شعر کہنا اس وقت گویا فیشن میں داخل تھا۔ سخن فہمی، سخن سنجی، سخن دانی کے بغیر کوئی شخص سوسائٹی میں نہ تو نام ونمود پیدا کر سکتا تھا۔ اور نہ کوئی اثر ورسوخ حاصل کر سکتا، نصرتی، ہاشمی، مرزا، شغلی وغیرہ جیسے ارباب فکر وتخیل صدیوں میں جا کر کہیں پیدا ہو سکتے ہیں :

اس وقت میں اگر بادشاہ خود بھی شعر نہ کہتا۔ تو بہت تعجب کی بات ہوتی
سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے اس کو شعر گوئی کا ملکہ پیدا کرنا ضروری تھا
سلطان علی کو طبعاً خوش مزاجی رنگین طبیعی اور بذلہ سنجی سے حصہ وافر
نصیب ہوا تھا مصوری، موسیقی میں مہارت تامہ حاصل تھی ایسے فرد کا شعر
کہنا قدرتی ہے، طبیعت کا بہاؤ خود اس جانب سے جاتا ہے، زمانہ تعلیم میں
ملک خوشنود اور رستمی وغیرہ نے بھی بادشاہ کی افتاد طبیعت پر اثر ڈالا تھا اور
شعر گوئی کا خاصہ ملکہ پیدا ہو گیا،

یہ امر قابل افسوس تھا۔ کہ تا حال سلطان کا کلام گوشۂ گمنامی میں تھا، مگر اب
نہایت مسرّت کے ساتھ سلطان کے کلّیات کو علمی دنیا کی خدمت میں پیش
کیا جاتا ہے۔

زیر بحث کلیات کے (۲۴۰) صفحے ہیں، فی صفحہ چھ[۶] سطر ہیں۔

تمام اصنافِ سخن یعنی قصیدے، مثنویاں، غزل، مخمس، مثمن، رباعی، فرد
اس میں شامل ہیں، تاریخیں بھی ہیں۔

پہلے اس امر کی بھی صراحت ضروری ہے کہ اس کلیات کو سلطان علی عادل شاہؒ
ثانی المتخلص بہ شاہی کا کلیات قرار دینے کے کیا وجوہ ہیں :۔

ا۔ کلیات میں متعدد جگہ شاہی تخلص آیا ہے اور یہ معلوم ہے۔ کہ شاہی علی عادل شاہ ثانی ہی کا تخلص تھا۔

"روزے علی عادل شاہ مرزا ان کا را بحضور طلبیدہ مدارت و عنایات بدو نمودہ و تکلف نمود کہ زبان را بمدح بادشاہ آشنا سازد، مرزان گفت زبانے راکہ در حمد و نعت و منقبت وقف گردیدہ در حکم من نماندہ بادشاہ مکرر تکلیف نمودہ ناچار یک دو مرثیہ بزبان سلطان گفتہ بجائے اسم خویش تخلص علی عادل شاہ کہ شاہی بود بہ قسمے داخل نمودہ۔ کہ ذو معنی واقع شدہ۔

بساتین السلاطین صفحہ ۴۳۳

ب۔ اشعار ذیل اس امر کا کافی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ کہ یہ علی عادل شاہ ہی کا کلیات ہے۔

تیرا یاد دن رات شاہی کا کاج ترے فیض سوں ہے اُسے تخت و تاج

(ص ۱۲)

منظفر علی شاہ کے ہات کا اچک تیر لاگیا نشان کے پلک

(ص ۱۵۸)

لاکھ سوں بھوں جیٹ نبوت سوں سیدین بنیادے بھید پرتنگ گت علی عادل سیوک مرتضیٰ ات تر بخادے

(ص ۲۱۹)

سلطان کی کنیت ابوالمظفر ہونے کی تصدیق نہ صرف تاریخوں سے ہوتی ہے۔ بلکہ نصرتی کے ذیل کے اشعار سے بھی اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے :-

علی عادل شہ غازی شہنشہ بوالمظفر کون دیا ہے جس خدا ایسا کہ تھا جلیا سکندر کون

الٰہی سور یونت ان کو عالمگیر ہے جگ میں تلک جم فتح و نصرت دے یو شاہ بوالمظفر کون

ج۔ کلیات کے عنوانات میں صراحت کی گئی ہے۔ "حضرت شاہی فرمودند"

د۔ شرف برج اور بادشاہ محل کی تاریخیں ۱۰۸۰ھ و ۱۰۸۱ھ کی برآمد کی گئی ہیں، اس زمانہ میں علی عادل شاہ ثانی ہی حکمران تھا۔

ہ۔ شرف برج کی تاریخ سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس تاریخ کا مصنف خود سلطان ہے۔

و۔ علی واد محل کی تعمیر اسی سلطان نے کی تھی، اس کے قصیدے کا طرز بیان اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ وہی اس کا بانی ہے،

ان تفصیلات سے اس امر کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے۔ کہ یہ کلیات سلطان علی عادل شاہ ثانی ہی کا ہے۔

ایک اور امر کی صراحت بھی ضروری ہے۔ کہ اس کلّیات کی ترتیب کب ہوئی؟

کلّیات کے خاتمہ پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ مگر اس میں بادشاہ محل کی تاریخ

سنہ ۱۰۸۱ھ درج ہے۔ اس سے واضح ہے۔ کہ اس سنہ کے بعد ہی اس کی ترتیب ہوئی ہوگی۔

قصائد۔ دکھنی قصائد کی بنا فارسی پر قائم ہوئی ہے۔ اس لئے جو لوازم فارسی قصائد کے ہیں وہی دکھنی قصائد میں نظر آتے ہیں، تمہید، گریز، مدح، التعریف اور دعا، قصیدے کے اجزا ہوتے ہیں، دکھنی قصائد میں نصرتی کے قصیدے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو تسلسلِ مضمون اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔

زیر بحث کلیات میں شاہی کے چھ قصیدے ہیں، پہلا قصیدہ حمد میں ہے دوسرا نعت میں تیسرا منقبت حضرت علی رضؓ میں۔ چوتھا منقبت دوازدہ امام میں پانچواں حوض، علی داد محل اور باغ کی تعریف میں اور چھٹا چار در چار کے عنوان سے ہے، پہلے قصیدہ میں ابتدائی ورق نہ ہونے سے چند شعر کم ہیں، موجودہ تعداد ۷۲ ہے، جو اشعار موجود ہیں، ان میں ابتدائی اشعار حسب ذیل ہیں:-

عقل معلّم اپن قصہ سکھایا کہن عقل کا مکتب ہوا فہم کے پڑھنے بدل
عقل کا جاسوس ہو کہ یہ اچھے لو کرن عقل خبردار ہے عقل ہمہ کار ہے
خوب دسا دے جھلک رنگ دُرِّ عدن عقل کا موتی مگر مغز کے طبلے بہتر

عقل کسوٹی ہوئی طبع کے کنے بدل   بوجھ رکھیا ہے صراف تلب کھرا جیو کنجن

اسی طرح عقل کی تعریف کرنے کے بعد:۔

خاک کی پتلی بنا روح نے تن میں بھرا   چال چلا کر اول آپ سکھایا کھن

آب سے آتش ملا خاک و ہوا تے کلا   چار عناصر لگا دیہہ سنوار یا ہمن

دو ر پھریں جو تمام سجدہ کریں صبح و شام   لیکہ تاریاں منگات چاند سورج ہور گگن

نور کا جھلکاٹ دے حور پری لک سنوا   سات طبق سرگ کے پور رکھیا ذوالمنن

اس قصیدہ میں آخر پر مناجات ہے اور اسی پر قصیدہ ختم ہوتا ہے۔ ملاحظہ

ہو:۔

شاہی عاشق اِتا بول مناجات کچ   تا کرم تج پہ ہوے بہر حسین و حسن

کار جہان کے سگل نکر تے ہماری اچھے   سائیں کرے لو یہ جب دور ہو جاوے محن

آہ و افسوس کے قبح تے محفوظ دھر   سایہ کرم کا دکھا ذوق سوں کہہ مج بدن

سائیں سچا ہے نہیں سیوا تجھے ہے سہی

جیتے جہاں کے شہان نذر کریں تج سرن

دوسرا قصیدہ جو نعت میں ہے پچاس شعر کا ہے، یہ بہاریہ قصیدہ ہے تمہیدی

شعر ملاحظہ ہوں:۔

دیکھو نوروز منجل یو بہارستان دیکھایا ہے
برگین پھل دپھولان ہیں پون کے ہت کھلایا ہے
سرک کی اوج کی کرسی سنوار یاد ول ہو دن کر
چندر ناری بلانے گھر بسنت سارا بنایا ہے

. . . .

اووک جل تھل بھرے حوضان نہیں ہے جانو بھویں پر
چندر کا مکھ دیکھانے تیں سرج ارسیان منگایا ہے

گریز یوں ہے :-

ود بولیا باغ مالی سون بڑا ہے نانون سو کس کا
کھیا دو اسم احمد کا جنے دین آپ نپایا ہے
محمدؐ شاہ مرسل کا سنگیا جب نعت کہتے مین ،
مٹھائی پاکہ من میرا یو مضمون چن کہ لیایا ہے
محمدؐ سا نہیں پیدا کیا کرتار تر جگ میں ،
اسی کے عشق نین سو لنسار ترجگ کا برایا ہے

. . . .

فرشتاں کا نہ تھا پھیرا اندان تھا نور سو تیرا،
ترے احکام مشترک جگت کے سر چڑھایا ہے
بڑا تج دین کا کس ہے دو جے دین سب ہوئے پس ہے
ترے انگشت کے کس نین چندر دو کھند گرایا ہے

تیسرا قصیدہ منقبت حضرت علیؓ میں ہے ۔ اس کے پچاس شعر ہیں۔

تمہید :—

اے کلال مجھ کوں پیالا پلا میا کا تا مست ہو کہ دیکھوں مکڑا علیٰ پیا کا
پیو جیو کا گسائیں پیو سوں پرت لگائیں پینا شراب پیول پانی ارت پیا کا

گریز :—

شاہ نجف ولی ہے تس ناؤں سو علی ہے
و دراز دان احمد سلطان اولیا کا
جس ذات میں محبت کرنا اپچھے علی کی،
حیران سدا پرے و دجیوں سنگ آسیا کا
تج شہ جوان آگیں مغلوب ہیں عدو سب
توں شیر ہے ازل تھیں موصوف انبیا کا

تلوار کی تعریف ملاحظہ ہوں :-

تج تیغ کی جھلک تھیں بجلی چھپی گگن مین   شمشیر زن تھیں ہے سردار اصفیا کا

تج تیغ تیز آگیں ادسان سب بسریا   پانی گیا ہے کھ تھیں چپ بھول بسریا کا

خاتمہ :-

شاہی ہوا ہے عاشق سن نازن مرتضی کا   سایہ اوسیج کا ہے تس سیس پر دیا کا

چوتھا قصیدہ دوازدہ امام کی منقبت میں ہے۔ اس کے (۶۵) شعر

ہیں۔ تمہید :-

مج دل کے رسے میدان پر جب عشق کے فوجان چڑے

تب ہوش کے رادت جتی مخمور ہو بے خود پڑے

جو عشق کے سلطان کا فرمان کہت میں آئیا

اقبال ہو پاتاں یو دو خدمت بدل لس دن کھڑے

امام حسین علیہ السلام کی تعریف میں کہتا ہے :-

سارے جہاں میں نیں ہوا تج سار کا شمشیر زن

جس پر کیا یک وار توں دو دھڑ برابر ہو پڑے

تج کھڑک کی ہور علم کی تعریف میں کیوں کر سکوں

حق کی عنایت تھے اوہک یو وصفت تج ہٹ چڑے

پھر پھر ہوا لازم مجھے تعریف کہنا شاہ کی،

تو مطلع ثانی کیا ات شوق سوں ہر یک پڑے

نابولنے کچ جان تے تھے طبع کے جوگھر پڑے

نزدیک ہیں شیانے دسے جب رس ہیں شہ کے جڑے

پانچواں قصیدہ حوض، علی داد محل اور باغ کی تعریف میں ہے، اس قصیدہ کے (۶۵) شعر ہیں، یہ لامیہ قصیدہ ایک زبردست قصیدہ ہے، اسی بحر اور ردیف میں نصرتی نے بھی ایک قصیدہ لکھا ہے، محسن کاکوری کا وہ مشہور قصیدہ نعت بھی جس کا پہلا مصرعہ "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" ہے، اسی بحر میں ہے، سلطان نے علی داد محل کو ۱۰۶۹ھ میں تعمیر کیا تھا۔ اس کا باغ بھی مشہور و معروف تھا:۔

دسے مج نین میں اس حوض پہ چند نا یو جھل   دھرتا ہے چاندنی جیو نیکہ اپس نکہ کے آکل

صفائی دیکھ کر اس حوض کی چندر دائم   چلے اکاس پہ ات شوق سوں امرت تے ادبل

پریان اچرج ہو کھیان دیکھ کہ اس حوض کہ تیں

اپچھے امرت تے بھریا حوض یو سمندر تے ڈکل

علی داد محل کی تعریف :-

کسوایا اٹھوان سمدر بھریا جب نیر سوں حوض

سزاوار اس کے آئیں گے ہے یو علی داد محل

پایا یو اچھے اس قصر کا پاتال تلک

طاق کسریٰ ہوئے معراج اسے نہ کے اکل

باغ کی تعریف :-

مقدم دیس دیس کا بیان کم زیادت کر کے　　بولیا ہوں یہاں تے میں تعریف کچھ یک باغ بدل

. . . .

بھرے ہیں باغ کے تختے گلاں ہر جنس نے کے　　خصوصاً نیو بیخاتس ہیں یو دسا دی جھل

. . . .

دسے شربت کے یو کوزے جتے ناریل کے کپر　　میٹھے کئی نیر کے چشمے تے بھریا ہے منجل

نارنگی رنگ کا ہوس دہر لگیا باغ میں نے　　زنگلے تن کوں سرا سر دیکھ یو رنگ رس میں گل

خاتمہ :-

پہلاں پھولاں سوں عمارت کی ہوئی جب یو صفت　　بھرے معنی سوں یک یک غزل سا وے افضل

دکھانے طبع کی قوت شاہی اس بحر منے　　بندھیا ہر بیت میں کئی نقطہ یو صنعت کے نزل

جان ہور دل تھے اچھا بات دعا منگتا ہے   تا اچھے من میں سکھ چین تنے یو خلق سگل

جو لگون نور سوں دن کر اچھے ہور چاند دگگن   جو لگوں مہر ہے زاہر اچھے ہور پیر زحل

مشتری سعد ہے جو لگ و عطارد ہے دبیر   جو لگوں پانچوے منے اکاس پہ ستا ہے منگل

جو لگوں رات دن دو پہر گھڑی جشن منے   بجو انند سوں اس گھر میں سدا تال منڈل

چھٹا قصیدہ چار در چار کے عنوان سے ہے۔ اس کے (۱۹) شعر ہیں

پہلا شعر حسب ذیل ہے :-

دیکھو اجھنا لکیا ہے یو بن تو ہی کلاں سوں بہر یا ہے سارا

سر و شنو بر سمنکے پیلاں پہلے میں پھولاں اچھے مکارا

مثنویاں . دکھنی شعرا طویل مثنویاں لکھنے کے عموماً عادی تھے۔ جہاں تک ہماری معلومات ہیں۔ ان کے لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ دکن میں کسی غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم (مثنوی) کا وجود ہی پہلے ہوا ہے +

دکھنی شعرا کی اکثر مثنویاں فارسی سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ مگر ایسی مثنویاں بھی لکھی گئی ہیں۔ کہ جن کو مصنف کی دماغی اپج قرار دیا جا سکتا ہے۔ مقیمی کی چندر بدن و مہیار ضعیفی کا قصۂ تمیم الفاری، ملک خوشنود کی ہشت بہشت رستمی کا خاور نامہ، نصرتی کی گلشن عشق علی نامہ اور تاریخ اسکندری۔ ہاشمی کی یوسف

زلیخا جیسی مثنویاں جو ہر زبان کے ادب کے لئے سرمایۂ امتیاز ہو سکتی ہیں۔
یہ سب بیجاپور میں لکھی گئی ہیں۔

شاہی کی ایک نامکمل طویل مثنوی بدیع الجمال ہو جو اس وقت دستیاب نہیں ہوئی۔ اس کلیات میں بھی سلطان کی تین مثنویاں ہیں جن میں سے ایک بہتر شعر کی مثنوی خیبر نامہ کے نام سے لکھی گئی ہے۔ دو اور مثنویاں سات سات شعر کی ہیں۔

خیبر نامہ میں جنگ خیبر کے حالات ہیں۔ زیادہ تر واقعات نہایت صداقت کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں، یہ مثنوی واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ ہے، مختصراً انتخاب پیش ہے:۔

اول حق کی توحید سوں کر سخن ۔۔۔ پچھیں خوش ادا سوں بیاں کر سخن
تجھے ہے سراوار حمد و ثناء ۔۔۔ ترے حکم سوں ہے فنا ہور بقا

. . . .

آتا ایک قصہ سوں جنگ کا ۔۔۔ کہ دو جنگ تھا دین کے ننگ کا
اتھا ایک خیبر کا قلعہ بکل ۔۔۔ بڑے بھر کلاں پر اکل تھے اٹل

. . . .

سلح ظاہری باطنی سوں سنوار　　عنایت کئے شاہ کوں ذوالفقار
رواناہوئے جنگ کے لئے نامدار　　دو شاہ ولایت او دھک کامگار
چلے شہ وہیں کفر کوں توڑنے　　او جا سٹ ہتھیر کے تبان پھوڑنے

. . . .

جو مرحب نے دیکھا برادر کتین　　کھپیا وہ گیا تو لڑوں گاج میں
زرہ باندھ دوہری بندھا دو فرنگ　　رکھیا دل میں جب شہ سوں کرنے پلنگ
لیا ہات بھالا جو تھا تین من　　شتابی سوں آکر کھڑا بیچ رن
جو دیکھا نظر بھر شہنشہ کا موں　　وو بولیا سخن بوا ابس لوچ سوں
کہ سپنے میں دیکھیا ہوں میں رات شیر　　کیا پھاڑ پنجے سوں آپس کوں زیر
وہی شیر دستا ہے مج آج یو　　غصے سوں کریگا مگر دھر کوں دو
شہنشہ نے مرحب کوں بگی ہلک　　دو شق کر سٹے سیس تھی پا تلک

. . . .

یہودی بچتے تھے ہوئے سرنگوں　　غنیمت لگی ہات حد سوں فزوں
فتح کر قلعے کوں شہنشاہ سور　　پھرے لیکہ لشکر پیمبر حضور
پیمبر خبر سنکہ خوش حال دل　　ہوئے تو انگے آ علی شہ سوں مل

. . . .

تیرا یاد دن رات شاہی کا کاج
ترے فیض سوں اُسے تخت و تاج

ایک دوسری مثنوی بھی ملاحظہ ہو:—

سونے کی صراحی سونے کا ہے جام — سونا گھول پیتی ہے بھر بھر مدام
چندر مکھ سکی کا ادھک پیار کا — سونے کا ہے سیس پھول برج سار کا
سونے کیاں کلیاں کر کرن میں پڑی — سونے کی زنجیر گلے میں دھری
سینا ہے سکی کا سونے سار کا — سونا ہور موتی گلے ہار کا
سونے کا زر نیا سونے کا ہے انگ — سونے کا ہے ٹیکا سونے کا ہے پلنگ
سو وصن جب سنواری ہی پچن کا نگ — سونا اسرن لک دھر یا سیس پک

کرم تج پہ شاہی کا دستا ہے آج
سونے کا انجل ادت کرتی ہے لاج

غزل۔ سعدی و حافظ کی فارسی غزل خوانی کے بعد ہندوستان میں
غزل نگاری نے جو رنگ اختیار کیا، اور ظہوری و کلیم نے جو زمزمہ خوانی کی،
اس کی آواز بازگشت میں رستمی، نصرتی، ہاشمی وغیرہ نے اپنا زور قلم صرف

کیا، اسی طرح شاہی کا کلیات بھی غزلوں سے خالی نہیں ہے، جن کی تعداد (۱۸) ہے، ان کے اشعار کی تعداد پانچ سے چودہ تک ہے، اشعار کی کل تعداد (۱۳۹) ہے، نمونہ ملاحظہ ہو۔

جس دن تے تمن سنات لگیا من را ہمارا
اس دن ستے پرت کا ہوا ج تن میں پکارا

جس زلف و گال کے آگیں شام و سحر کو ہو،
تس روپ کے پرکھنے کو حد بشر کو ہو

تج نین کی نرمی کنے منگتے ہیں موتی آبرو
یا روپ کی تو کان ہے یا حسن کی سمدور ہے

تج گال پر نگ کا نشان دستا ہے مج اس ہات کا
روشن شفق جگمگے جیوں چاند پہلی رات کا

سارے رین تیرا مدن مج طبع میں بھرپور ہے
تج صبح مکھ کے سامنے دیپک سدا محضور ہے

مکھ موڑ کے چلی ہے چنچل سنے کمان کر
پلکھوں کے تیر چھانٹ دے بھونہی کمان کر
مکھ دیکھنے دھنی کی ہوئی ہے شگفتگی،
توجن بھتکھ بئی جو دیکھائی وہ آن کر
امرت بھری ادھر تے ہوئی ہے حیات مج
دیکھیا نظر جو بھر کر سبد دھنکے گیان کر

سارے جہاں کے پارکھی پرکھوں رتن کیونکہ کہو
یاقوت ہور مرجان میں کو ہے رتن برتر کہو
بولے جہان کے پارکھی ہمنا نہ آوے بولنا
تمنا سہاتا بولنا اے شاہ بحر و بر کہو

بولیا ہوں نت میں فنکر تنے یو دو رتن کا فرق کر
گر کچ اپچھے انصاف تو اس بول کوں خوشتر کہو

مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اپچھے
جس ذات میں صافی اپچھے اس ذات کوں بہتر کہو

یاقوت ہور مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل
سنکر جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

خوش بھات ہو پیاری آتی انگنن میں جھم جھم
نت ہیم میں لٹکتے دستی نین میں جم جم

پھولی ہوں ات خوشی سوں ہو باغ باغ سن میں
جب ہاتھ ملا کر پھرتے چمن میں جھم جھم

درد سنتے ہوا ہے مج کہ میں تج کل نہیں دیکھا
ہوا ہے کل تیا میں کل کہ یک تل کل نہیں دیکھا

تمہارے حسن کی خوبی مقابل جب چہندر سوں ہوئی
تدانتی میں کلینکے کوں کدھن نرمل نہیں دیکھا

چل خوش سہاوے کمان کے ادے　　کمان پدمنی سے چلا ہے الگ
مظفر علی شاہ کے ہات کا　　اچک تیر لاگیا نشان کے پلک

ابرو کمانان کھینچ کر ہارے پلک کے تیر سون
زخمی ہوا دل کا ہرن لاگیا نشان تج ہات کا

تج بال کالے دیکھ کر بادل پھریں حیران ہو
تج بھال ہور نیلک کنے کیا چاند ہور کیا سور ہے

ریختہ۔ شمالی ہند میں ایک زمانہ تک اردو زبان ہی کا نام ریختہ تھا اور پھر نظم کو بھی عام طور سے ریختہ کہا جاتا تھا، بخلاف اس کے دکن میں اردو زبان کو کبھی ریختہ نہیں کہا گیا اور نہ عام طور سے نظم کو ریختہ کا نام دیا گیا، البتہ ولی کے زمانہ سے نظم ریختہ کے نام سے بھی موسوم ہونے لگی ؎
یہ ریختہ ولی کا جا کر اُسے سنا دو　　رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند
ہمارا خیال ہے۔ ولی نے بھی اس کو شمالی ہند کے سفر کے بعد ہی اختیار

کیا ہوگا، کیونکہ دکن میں ریختہ سے مراد صرف وہ اشعار تھے جن میں فارسی مصرعے اور اردو ترکیبوں سے مرکب ہوتے تھے، چنانچہ زیر تبصرہ کلیات میں ایک غزل ایسی موجود ہے اور اس کو ریختہ کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے، اس غزل کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں ۔

دیدم نظر بھر روپ جو اس شوخ چکہ مستانہ را گفتم بیا مندر منے روشن بکن کاشانہ را

ناہاں کر اس بول کون انچل جھٹک دے جب چلی آخشم سون بولی مجھے با من مگو افسانہ را

تس کے فراقوں یوں دسے گلزار سب انگار ہو یو دل معلم ہو مرا دیوے سبق پروانہ را

موزون مقفا بولنے ہر یک کون کاں طاقت اچھے اجرج کہیا شاہی غزل سننے بدل فرزانہ را

ریختی - ریختی کا موجد ہاشمی بیجاپوری تصور ہوتا ہے جو ہی علی عادل شاہ کے زمانے میں تھا، زیر بحث کلیات میں بھی ایک غزل ایسی موجود ہے جس کو ریختی سے موسوم کرنا غیر درست نہ ہوگا، وہ اگرچہ اس کلیات میں غزلوں کے تحت میں درج ہے ۔ مگر عورتوں ہی کی زبان میں ہے ۔ یہ پوری غزل حسب ذیل ہے :-

پیو سات یُج رہنا لذت اسے کہتے ہیں آپ سیج پھر رہنا صنعت اسے کہتے ہیں

بج نین کے نگر میں لالن وسطن کئے جب تب انجمن کے لوگاں خلوت اسے کہتے ہیں

میں بھاؤں مجہ پیا نگ لاگے رہی ہوں دائم یک تل جدا نہ ہونا وصلت اسے کہتے ہیں

گل ہور گلاب میانے نہیں کچ فرق ازل تے — یوں پیو سوں من مل رہی ہیں الفت اسے کہتے ہیں
ہت جوڑ چت بھلائے ہیں آپنی پیا کون — عاقل جہاں کے بولیں حکمت اسے کہتے ہیں
سو تن میں پیو مجکون جب سیج میں آپس کے — بھوناں دے بلاوے عزت اسے کہتے ہیں
چارن بہر پیا سنگ کئے بھانت کر بدن کیے — سنجوگ ہور ہی ہون عشرت اسے کہتے ہیں
لالن کی چاو تھی ہیں پوری پر و کہ انجھیا — ترلوک میں پیو لئے شہرت اسے کہتے ہیں
روں روں رسن کری ہیں شاہی کا ناوں لینے — پہر پہر دوناؤن نسیار احت اسے کہتے ہیں

مخمس۔ غزلوں کے ساتھ ایک مخمس بھی ہے، یہ نظم شاعر کے پرواز خیال اور زور بیان کی اچھی مثال ہے۔ ذیل میں اس کا کچھ نمونہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات — میں نیہ بندی توں کیتا گھات
دل مرا اپنے سات کیا — مج برہے میں دن رات کیا
دل داری کا نابات کیا — سب لبرا سکہ ہے ہات کیا
کئے مج سوں ایسی د ہات کیا

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات — میں نیہ بندی توں کیتا گھات
پیو مورت دیکھو سپنے میں — جب جاگو تب رہوں سپنے میں
لا دیبک برہا اپنے میں — تن جائے جھک جھک جینے میں

آرام اچھے مج کھپنے ہیں

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیستا گھات

مج نینوں نیند آتی نہیں   یو رین کھٹن سر جاتی نہیں

پیو باج مج کوئی ساتی نہیں   اس بات بن کچ بہاتی نہیں

بن افسوس ستے کچ کہاتی نہیں

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیستا گھات

تج یاد کر تل ملتی ہوں   لہو تیل ہنے دل تلتی ہوں

تن موم بتی ہو جلتی ہوں   اس جلنے سوں نا ٹلتی ہوں

سب رین برہ میں کلتی ہوں

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیستا گھات

جو برہ جا لیا تن کون اب   ہو دکھ کنیر آ گیر یا تب

جیوں ہتونت جا لیا لنکا سب   اب کے سیں سوسوں میری رب

میں مکڑا دیکھوں پیوں کا کب

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیستا گھات

کوئی آ دسنو رے میرا حال   پیو کیا مج سوں جو کو تال

میں جگ تے نت اٹھا انجو ڈہال کل پتی آنسو موتی مال

مج یک یک پل سے لک لک سال

کوئی جاؤ کھو مج ساجن سات میں نینہ بندی توں کیتا گھات

مثمن ۔ اس کلیات میں ایک مثمن بھی ہے۔ جو حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز کی مدح میں ہے، اس کے بعض شعر ملاحظہ ہوں :۔

تس ریج محفوظ ہوات شوق سوں کیتے بچن مدح میں اس ذات بابرکات کے کہو لیا رسن

طبع مج بولیا ثمن خوش عبارت خوش وزن حق کیا قدرت سوں عالم تس میں یک روشن بدن

سو محمدؐ ہے حسینی سید قطب دکھن اس نین کے کیا اتھے طالع جو کیتا ہے وطن

کہا سو یو دہرت ہو تس میں توں ہی جیوں رتن جن لقب پایا ہے اپنی پیر تے گیسو دراز

رباعی ۔ رباعی صرف ایک ہے :۔

سب دیس گیا ہے دھن تے لڑتے لڑتے کھٹ رات گئی ہے پانوں پڑتے پڑتے

کیا بنکہ بدن کا اونچ لگتا ہے مجھے بہے پانوں سرے پرت کے چڑتے چڑتے

راگنیاں ۔ اس کے بعد متعدد راگنیاں ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ابراہیم عادل شاہ ثانی موسیقی کا ماہر تھا اور اپنی یادگار میں نورس جیسی کتاب راگنیوں کے متعلق چھوڑی ہے، اسی طرح اس کے پوتے علی عادل شاہ کو

بھی موسیقی میں کافی مہارت حاصل تھی،

سوہلا در مقام رام کلی بجملہ متعدد راگ اور راگنیوں کے ایک کا نمونہ پیش ہے۔

آج راج ہے راج ہے راج ہے سائیں گھر راج ہے
سکھیاں سکھیاں مل گاؤ سوہلا سوہلا کاج ہے
بن آیو سجنی اور ساجن سج سج ساجن ہے
مدن روپ نرنارن کو سر سر تاج ہے

تاریخیں۔ دو فارسی تاریخیں بھی اس کلیات میں شامل ہیں، ایک شرف برج جس کا سال تعمیر ۱۰۸۰ھ ہے اور دوسری تاریخ بادشاہ محل کی ہے، جس کی تعمیر ۱۰۸۱ھ میں ہوئی تھی۔

بنا کردہ ام وقتِ خوش ایں مکان — کہ دایم دریں برج عشرت شود
بامداد رسشاہ ولایت پناہ — بجستم چو تاریخ آں از خرد
بر آں شش عدد را فزوں کرد گفت — شرف برج جائے مبارک بود
۱۰۸۰ھ

پس از ہزار و ثمانین و یک ز مہر علی — گرفت زینت و اقبال بادشاہ محل
۱۰۸۱ھ

پہلی۔ اس کلیات میں دو ایک پہلی بھی مذکور ہیں۔ نارِیل کی پہلی حسب ذیل ہے :۔

میانے ملائی بہتر رس   آس پاس بھوت دس

سلطان علی عادل شاہ کے کلام کا نمونہ جو مختلف اصنافِ سخن میں ہے پیش ہو چکا ہے۔ اس سے سلطان کی قوتِ بیان اور ذوقِ سخن کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس کے قصیدے جہاں ادق اور مشکل بحریں ہیں، وہاں آسان اور سہل بھی ہیں۔ زورِ بیان شوکتِ لفظی اور شاہانہ طمطراق کا ان قصیدوں سے کافی ظہار ہوتا ہے، مثنویوں سے واقعہ نویسی اور مرقع نگاری کی تصدیق ہوتی ہے، محل سراؤں اور شاہی کوشکوں میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کی کوئی کمی نہیں تھی، رخساروں کی گل گونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے اٹھو پہر لطف اندوز ہونے کا پورا ساماں مہیا تھا۔ اس لحاظ سے شاہی کی غزلیات میں حقیقت کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ ساتھ ہی رنگین خیالی، عاشقانہ مضمون آفرین تخیل کی پرواز کو ظاہر کرتی ہیں، تشبیہ اور استعارہ کو بھی کام میں لایا گیا ہے، مگر وہ بھی عام فہم، اس کے عاشقانہ کلام کو اگر زمانۂ مابعد بلکہ آج

کل کے کلام سے ملایا جائے تو زیادہ فرق سوائے زبان کی صفائی اور تخیل کی پرواز کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

معشوق کی وہی زلفِ سیاہ، رخسارِ گلگوں اور چشمِ فتاں کی تعریف ہے اس کی ترچھی نظر سے عاشق گھائل ہوتا اور تیرِ نظر سے اس کا دل مجروح ہوجاتا ہے۔ شرابِ ناب سے سیری نہیں ہوتی، معشوق چاند سے زیادہ حسین، شمع سے زیادہ روشن ہے، اس کا حسن سمندر کی طرح بے پایاں گیسو شام کی طرح سیاہ، گال سحر کی طرح سپید ہیں۔

کبھی معشوق اپنے عاشق کے ساتھ جانے کے لئے بے قرار ہے، اس کو جدائی اور فراق کے زمانہ میں نیند نہیں آتی، دن کو چین ملتا ہے اور نہ رات کو آرام، پیا کے سوا کوئی ساتھی نہیں، دل لہو کے تیل میں تپتا اور موم کی طرح جلتا ہے اور وہ جدائی کے صدمہ سے گھل کر دبلی ہوجاتی ہے، کوئی اس کے حال کو سننے والا نہیں، اس کے آنسو موتی کے طرح نکلتے ہیں، جدائی میں ایک ایک پل سال معلوم ہوتا ہے، عاشق کے بغیر دکھ بھاری اور دنیا اندھیری ہے۔

اس طرح کے خیالات اور مضامین وہی ہیں۔ جو شعرائے مابعد کے کلام

میں بھی نظر آتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ عاشقانہ کلام میں زیادہ فرق نہیں ہے۔

یہ ہم کو معلوم ہے کہ سلطان نے دولت کے دامن میں آنکھ کھولی، ہوش آیا تو عیش و نشاط کا چرچا سنا اور جوان ہوا۔ تو ساغر و جام کا دور دیکھا، اس وقت بیجاپور کی معاشرت میں سادہ زندگی، بلند شربی اور عالی دماغی کا وجود نابود ہو رہا تھا، عالی شان قصروں کی زیبائش کے لئے سونے کو پانی کی طرح کام میں لایا جا رہا تھا، ساقیانِ مہ وش اور زاہد فریب رانیاں زینتِ محفل ہوتی تھیں، اس لحاظ سے کلام کا رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی سے مملو ہونا ناگزیر تھا۔

یہ بھی واضح رہے کہ وہ زمانہ تھا کہ اسلامی علوم و ادب میں انحطاط پیدا ہو چکا تھا، اور اصابت فکر و رائے کا ٹوٹا پڑ چکا تھا۔ لفظی مباحث کی دلچسپی نے اپنا پورا غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ شرح و حاشیہ کی بھول بھلیاں نے ارباب علم کو سرگرداں کر رکھا تھا، قومیت یا اخلاق کے بلند اور اعلیٰ جذبات کی نشو و نما اس زمانے کی شاعری کی دسترس سے بالکلیہ باہر تھی۔ نہ صرف فارسی بلکہ دکھنی شاعری نے بھی اس وقت یہی روپ اختیار کر رکھا تھا۔ اس لحاظ سے شاہی

بلکہ اس وقت کے سب شاعروں کے کلام میں اس امر کی تلاش کہ انھوں نے زندگی کے سدھار، اخلاق عامہ کی بہتری اور زندگی کیلئے کوئی اعلیٰ نصب العین مقرر کرنے میں کیا نقطۂ نظر قائم کیا محض فضول ہے۔

اس زمانے میں کسی شاعر کو بلند پایہ قرار دینے کا معیار غالباً صرف یہ ہوسکتا ہے۔ کہ اس نے اپنی اس محدود چار دیواری میں کس حد تک کامیابی حاصل کی اور فن کے پرکھنے کے جو ظاہری اور رسمی قواعد مقرر ہو گئے تھے، ان پر اس کا کلام کس حد تک پورا اترتا ہے۔

اس لحاظ سے شاہی کا کلام بلاشبہ اقران و امثال میں بہت بلندی پر ہے، البتہ چونکہ دکھنی شاعری کا ابھی گویا ابتدائی دور تھا، سادگی اور سادہ اسلوب اس کے کلام کی خاص خصوصیت ہے۔

بہرحال سلطان کا کلیات ایک بیش بہا خزانہ ہے جس میں قیمتی موتی محفوظ ہیں، خدا کرے یہ زیور طبع سے آراستہ ہو جائے ؛

(رسالہ معارف بابتہ ۱۹۳۳ء)

ولی سے پہلے دکن کی اُردُو شاعری

جامعہ عثمانیہ اردو زبان کی ترقی کی وہ جدید منزل ہے۔ جہاں یہ کارواں صدیوں کے مراحل طے کرنے کے بعد پہنچا۔ اب اگر ہم گزشتہ منزلوں کے راہ رَوں کی سعی و کاوش کی قدر و منزلت کے اعتراف میں اپنی عقیدت اور احسان مندی کا کوئی باج ادا کریں تو درحقیقت یہ ایک سعادت ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے اپنی سحر آفرینی سے ادب اردو کے دریا کا بہاؤ جو بدل دیا، اس کے متعلق حال میں ملک نے اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ امر واقعی برمحل ہے کہ ہم دکن کی سرزمین میں ولی کی یاد تازہ کریں۔ ابھی جبکہ حالی کے جادو کو چلنے کے لئے سو سال کا عرصہ درکار تھا۔ دکن کے پتھریلے مرزبوم میں اردو ادیبوں کے ایک گل سرسبز نے وہ مہک پھیلائی۔ کہ پورے سو سال تک اسی کی خوشبو مہکتی رہی۔

دکن میں جب بہمنی سلطنت قائم ہوئی (۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء) تو اس وقت تک فارسی شاعری نے ترقی کے سب مدارج طے کر لئے تھے، اس تاریخی حقیقت سے

انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ جس اسلامی سوسائٹی نے ہندوستان اور دکن میں نشو و نما پائی۔ اس کا اصلی سرچشمہ ہندوستان سے باہر وسط ایشیا اور ایران میں واقع تھا۔ بہمنی عادل شاہی اور قطب شاہی زمانہ کی تاریخ ادبیات کے اکثر پہلو ایران و وسط ایشیا کی تاریخ ادبیات سے مربوط ہیں، اس لحاظ سے جب دکھنی ارباب ادب نے فکر و تخیل کو الفاظ کا جامہ پہنانا چاہا۔ تو ان کے سامنے فارسی شاعری کا پیکر موزوں موجود تھا دکھنی شاعروں نے بھی فارسی مثنوی، فارسی قصیدہ اور فارسی غزل کا چربہ اتارنا شروع کر دیا

ہمارے عام قومی انتشار اور پراگندگی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ہماری عام قومی زبان کی تاریخ تاریکی اور گمنامی کے پردوں میں اوجھل ہو گئی ہے، ہماری زبان کے ایسے شاہکار جن پر ہر زبان ناز کر سکتی ہے۔ خود ہمارے ملک میں موجود نہیں۔ یہ کتنی بدقسمتی ہے۔ کہ آج ہم اپنی زبان کی تاریخ یا عہد بہ عہد ترقی کی کوئی مسلسل روئیداد مرتب نہیں کر سکتے

بہرحال جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کہ دکن میں ولی سے پہلے اردو نظم کی ابتدا کب ہوئی اور کن حالات میں ہوئی۔ تو ہمیں اس کا کوئی صحیح علم نہیں ہوتا۔

جو مواد ہمارے پاس موجود ہے۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے۔ کہ جس

زمانہ میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رہ اپنی روحانی قوت کا سکہ بٹھا رہے تھے اس وقت اردو میں یہ سکت پیدا ہو چکی تھی۔ کہ سلوک و اخلاق کے بعض ابتدائی مسائل اس میں نظم کئے جائیں، ۸۲۵ھ میں خواجہ بندہ نواز واصل بحق ہو گئے۔

۸۶۵ھ میں جبکہ نظام شاہ بہمنی اپنے ظالم باپ ہمایوں کے بعد آٹھ سال کی عمر میں تخت و تاج بہمنی کا وارث ہوا ہے بہمنی سلطنت میں امن و امان کا دور تھا۔ بادشاہ کی ماں نرگس بانو، خواجہ جہان اور محمود گاواں کی تدبیر و دانش اور غیر معمولی قابلیت سے بہمنی قلمرو میں ہر جانب اطمینان اور رفاغ البالی کا دور دورہ تھا، لامحالہ ادب اور شاعری کا بھی خوب چرچا رہا، اس دور کے ایک شاعر نظامی سے ہم واقف ہیں۔ اس کی دکنی مثنوی ہماری نظر سے گزری ہے۔

خواجہ بندہ نواز اور نظامی کے کلام پر نظر ڈالی جائے۔ تو بیک نگاہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ زبان کے ارتقا کے مدارج طے کرنے میں دوسری اہلِ زبانوں نے بھی پوری سرگرمی سے حصّہ لیا ہو گا۔ نہ صرف خواجہ صاحب سے پہلے بلکہ خود اُن کے زمانہ میں اور بعد میں بھی۔

بہرحال نظامی کی مثنوی دکنی عشقیہ شاعری کے قصر بلند بام کی بہت ہی

مضبوط بنیاد ثابت ہوئی۔ اس ابتدائی مثنوی کو چھوڑ کر غزل، قصیدے یا مرثیے کا
اس زمانہ کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے، عشقیہ شاعری کے اس ابتدائی نقش کے
ا سوا معاشرت یا زندگی کے کسی اور پہلو کی ابھی غالباً نظم و شعر میں ترجمانی نہیں
ی گئی تھی۔

اب وہ زمانہ آجاتا ہے۔ جبکہ بہمنی عظمت و شوکت کا تار و پود بکھر گیا۔ پانچ
کومتوں کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ اب اگرچہ بہمنی سلطنت کی جیسی عظمت خواب
خیال ہوگئی، لیکن ان پانچوں حکومتوں نے پوری کوشش کی۔ کہ بہمنی سلطنت
کے علمی وقار اور ادبی سرپرستی کی اعلیٰ روایات اپنی قدیم رونق و شان کے
اتھ باقی رہیں۔

سنہ ۹۰۰ھ سے سنہ ۱۰۰۰ھ تک پورے سو سال کی ادبی تاریخ پر نظر ڈالی
ائے تو ہمیں سوائے میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم اور فیروز و محمود
ے کسی اور کا نام معلوم نہیں ہوتا۔

میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم نے بیجاپور کی خاک
ل میں جنم لیا تھا، فیروز اور محمود نے گولکنڈہ کی فضائیں پرورش پائی میراں
ی اور شاہ برہان الدین جانم کا تو خیر کچھ حال معلوم ہے اور کچھ کلام بھی موجود ہے

لیکن فیروز اور محمود کا نہ تو کچھ حال معلوم ہے اور نہ ان کے کلام کا کوئی نمونہ دستیاب ہوا ہے، وجہی اور ابن نشاطی جیسے باکمال شاعروں نے فیروز و محمود کا جو لوہا مانا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زبان کو صاف کرنے اور اس کو ترقی دینے میں فیروز و محمود نے کوشش و سعی کا پورا حق ادا کیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مثنوی سے گزر کر غزل اور قصیدے کے میدانوں میں بھی جولانی شروع ہو چکی تھی۔ شاعری کے حلقہ میں عشق اور تصوّف و سلوک کے علاوہ فخریہ، مرثیہ، اور اخلاقی نظموں کی کڑیاں بھی داخل ہو چکی ہوں گی زمانہ مابعد کے جو نمونے ہماری نظر سے گزرے ہیں وہ کسی ابتدائی بنیاد کے بغیر مرتب نہیں ہو سکتے تھے۔

ان دو ابتدائی صدیوں کے بعد اب اس زمانہ میں پہنچ جاتے ہیں جبکہ شاعروں اور نظم نگاروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ پیدا ہو گئے اور شمع سخن اس شان سے فروزاں ہوئی۔ کہ پہلی کوششیں ماند پڑ گئیں، خوش قسمتی سے اس زمانہ کی کوششوں کا ثمرہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہے۔ اس کے بعض پاکیزہ نمونے سمندر پار ناواقف لوگوں کی حفاظت اور نگرانی میں موجود ہیں۔

دکنی شاعروں کا فکر و تخیل اب عشق اور تصوف کے دائرے سے نکل کر رزمیہ

تاریخی، نیچرل اور دوسری تمام اصناف سخن میں پرواز کرنے لگا۔ جو ذخیرہ اس خصوص
میں ہمیں دستیاب ہو چکا ہے۔ اس کے لحاظ سے ہم ان سب اصناف پر قدرے
تفصیل سے نظر ڈال سکتے ہیں۔

ردیف اور قافیہ کی سہولت کی بنا پر مثنوی کی صنف سخن نے جو عام قبولیت حاصل
کی اور فارسی میں اس کی وجہ سے جو اعلیٰ ادب فراہم ہو گیا۔ وہ دکنی شعرا کے لئے
ایک اچھا نمونہ ثابت ہوا، دکنی مثنویاں اردو ادب کے لئے ایک گراں بہا زیور
ہیں، زیادہ تر اسی صنف سخن میں دکنی شاعروں نے اپنے فکر و تخیل کی رودادیں
قلمبند کی ہیں، اس دور کے جتنے بھی شعرا کا علم حاصل ہے۔ ان سب نے
بجز چند شاذ مستثنیٰ صورتوں کے ایک یا ایک سے زیادہ مثنویاں لکھی ہیں۔ یہ
مثنویاں یا تو اپجی ہیں۔ یا فارسی سے ترجمہ۔

دکنی شعرا نے اپنے کلام میں زندگی کے ہر پہلو کی تصویریں پوری کامیابی
سے کھینچی ہیں، چاہے اخلاق و موعظت ہو یا فلسفہ و تصوف۔ چاہے عشق کی
موشگافیاں ہوں یا جنگ و پیکار کی خون آشامیاں، چاہے گھریلو زندگی کی
پُرکیف روداد ہو۔ یا مناظر قدرت کی سحر طرازیاں، تاریخ و سوانح کو بھی ان
قادر الکلام شاعروں نے نظم کا جامہ اس عمدگی سے پہنایا۔ کہ شاعری ہی طرح

ہوگئی۔

عاشقانہ شاعری۔ پہلے عاشقانہ شاعری پر قدرے تفصیلی نظر ڈالنی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کہ تدریجی ارتقا کے پہلو کا بھی ساتھ ساتھ علم ہوتا جائیگا نظامی کی مثنوی کے بعد بلحاظ تاریخ تصنیف جو مثنوی نظر آتی ہے۔ وہ وجہی کی قطب مشتری ہے۔ (سنہ ۱۰۱۸ھ) پھر غواصی کی سیف الملک و بدیع الجمال (سنہ ۱۰۳۵ھ) اور طوطی نامہ (سنہ ۱۰۴۹ھ) احمد کی لیلیٰ مجنوں (سنہ ۱۰۵۰ھ) مقیمی کی چندر بدن و مہیار (سنہ ۱۰۵۰ھ) صنعتی کا قصۂ تمیم انصاری (سنہ ؟ھ) ملک خوشنود کی ہشت بہشت اور یوسف زلیخا (سنہ ۱۰۵۶ھ) جنیدی کی ماہ پیکر (سنہ ۱۰۶۴ھ) ابن نشاطی کی پھول بن (سنہ ۱۰۶۶ھ) نصرتی کی گلشن عشق (سنہ ۱۰۶۸ھ) طبعی کا قصہ بہرام و گل اندام (سنہ ۱۰۸۱ھ) غلام علی کی پدماوت (سنہ ۱۰۹۱ھ) ہاشمی کی یوسف زلیخا (سنہ ۱۰۹۹ھ) وغیرہ۔

ان مثنویوں میں قطب مشتری، چندر بدن، ماہ پیکر خود دکنی شاعروں کی وتراوش فکر کے نمونے ہیں۔ باقی فارسی سے ترجمہ۔

ان مستقل مثنویوں سے قطع نظر سلطان قلی قطب شاہ، سلطان محمد شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل شاہ ثانی ہر ایک کے کلیات میں بعض مختصر مثنویاں ایسی موجود ہیں

جن میں عاشقی کی کتھا بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نظامی کی مثنوی کے بعد ان مثنویوں پر نگاہ دوڑائی جائے تو بیک نگاہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ نہ صرف اسلوب بیان بلکہ زبان کی سلاست نے بھی آب ترقی کی کئی منزلیں طے کر لیں۔

ان تمام مثنویوں پر تفصیلی تبصرہ کافی وقت کا محتاج ہے، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اس قدر بیان کرنا کافی ہوگا۔ کہ قطب مشتری میں خود بادشاہِ وقت سلطان قلی قطب شاہ کی روئداد محبت کو شاعری کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ جو بھاگ نگر کی ایک حسین رقاصہ بھاگ متی کے عشق کا نتیجہ تھا

غواصی کی مثنویاں سیف الملک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ کو ایک کامیاب ترجمہ قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، غواصی نے ہندی الفاظ کو بڑی عمدگی سے دکنی زبان میں آمیز کیا ہے، کلام بہت سادہ اور تصنع و آورد کی قید و بند سے آزاد ہے۔

غواصی سے گزر کر ابن نشاطی کی پھول بن پر نظر ڈالیں۔ تو پچیس سال کے اندر ایک بڑا انقلاب نظر آتا ہے، جذبات کی حقیقی تصویر لفظی اور معنوی صنائع بدائع کے پردوں میں چھپ جاتی ہے۔ پوری مثنوی مرصع ہے لیکن واقعی یہ

اعجاز سخن ہے کہ سلاست اور روانی بڑی کوشش سے برقرار رکھی ہے۔

اسی زمانہ کی ایک دوسری مثنوی "گلشن عشق" نصرتی کے سحر نگار قلم کی ایک دائمی یادگار ہے، اس مثنوی میں انسان کے حقیقی جذبات کو جس خوبی سے قلم بند کیا ہے۔ اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ کلام کی رنگینی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت واقعی قابل داد ہے۔

عاشقانہ جذبات کا اظہار صرف مثنوی کی حد تک ہی نہیں رہا۔ بلکہ اس کا اثر غزل کی لطیف تر زمین پر بھی جلد پڑ گیا

سعدی اور حافظ کی فارسی غزل گوئی کے بعد ہندوستان میں غزل نگاری نے جو رنگ اختیار کیا اور خسرو، حسن، ظہوری اور کلیم نے جو زمزمہ خوانی کی اُس کی آوازِ بازگشت میں دکنی شعرا نے بھی اپنا زورِ قلم صرف کیا اور دادِ سخنوری دی ہے جو مواد ہمارے پیش نظر ہے، اس کے لحاظ سے بہ ظاہر یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ولی سے پہلے اس میدان میں دکنی شعرا نے اپنی یادگاریں بہت کم چھوڑی ہیں دکنی شاعری کے سلسلہ میں جو عظیم الشان ذخیرہ مثنوی اور مرثیہ کی صورت میں دستیاب ہوا ہے۔ اس کے مقابل غزلوں کی مقدار بہت کم ہے، سلاطین گولکنڈہ و بیجاپور کے سوا دوسرے نامور شعرا۔ وجہی، غواصی، نصرتی، شوقی، ہاشمی وغیرہ

کی جو غزلیں ہمیں معلوم ہیں۔ ان کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ اس امر کے باور کرنے کے لئے نہایت قوی ثبوت ہے کہ رستمی، نصرتی، غواصی وغیرہ جیسے قادر الکلام شعرا نے اس صنعت میں بھی کافی ذخیرہ چھوڑا تھا۔ مگر افسوس اب ناپید ہے جو سلاطین، گولکنڈہ اور علی عادل شاہ شاہی اور ہاشمی وہ خوش نصیب شعرا ہیں جن کی بیسویں غزلیں ان کے کلیات میں موجود ہیں۔

غزل گوئی کا اصل موضوع محبوب ہے لیکن فارسی شاعری میں اور اس کے بعد خود اردو شاعری میں محبوب کی جو درگت بنی وہ ہمارے ادب کا ایک افسوسناک پہلو ہے۔ مگر دکنی غزل نگاروں نے عربی اور ہندی شعرا کی طرح واقعیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، سلاطین کا بالخصوص محل سراؤں اور شاہی کوشکوں میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کے دیکھنے میں سارا وقت صرف ہوتا تھا اور رخساروں کی گل گونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے آٹھویں پہر لطف اندوز ہونے کا پورا سامان مہیا تھا، اور پھر چونکہ سلطان قطب شاہ بوجہ اس کے کہ خود ایک عاشق مزاج اور سوختہ دل شاعر کی حیثیت رکھتا تھا اور بھاگ نگر کی پری صفت اور حور وش معشوق کے زلف گرہ گیر کا اسیر تھا۔ اس لئے جو غزلیں لکھی ہیں وہ حقیقت بردار ہیں ؂

ان غزلوں میں رنگین خیالی، عاشقانہ مضمون آفرینی تخیل کی بلند پروازی خیالات کی جدت، تشبیہ و استعارات کی لطافت کی کوئی کمی نہیں ہے۔

رزمیہ شاعری۔ دکنی شاعروں نے جہاں عشق کی حکایات لذیذ کو صفائی اور ندرت سے بیان کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، وہاں جنگ و پیکار کی دار و گیر کو بھی نہایت سلیقہ اور ہنرمندی سے مرتب کیا ہے، اس قسم کی مثنویوں میں رستمی کا خاورنامہ (۱۰۵۹ھ) شوقی کا فتح نامۂ نظام شاہ (؟ھ) سیوک کا جنگ نامہ (۱۰۹۲ھ) لطیف کا ظفر نامہ (۱۰۹۵ھ) بہت سر آمد ہیں۔

رستمی کے خاورنامہ کو دکنی ادب کا سرسبد گل کہنا بجا ہے، چوبیس ہزار شعر کی ضخیم مثنوی صرف اٹھارہ ماہ کی قلیل مدت میں لکھ ڈالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، گو یہ مثنوی ابن حسام کی تالیف کردہ ایک فرضی داستان خاورنامہ کا دکنی ترجمہ ہے لیکن اس کی وجہ سے رستمی کا پایہ کچھ کم نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح ظفر نامہ اور جنگ نامہ دونوں غالباً ترجمے ہیں۔ البتہ شوقی کا "فتح نامہ نظام شاہ" خود اس کی ذاتی محنت کا ثمرہ ہے۔ اس مثنوی میں اُس یادگار معرکہ کی روداد قلم بند کی گئی ہے۔ جو تلی کوٹ کے میدان میں مہاراجہ بیجانگر کے مقابل اسلامی

سلطنتوں کی صف آرائی کی بنا پر وقوع پذیر ہوا تھا۔

نصرتی کے قصیدے بھی رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔ نصرتی نے جس خوبی اور عمدگی سے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ وہ تعریف سے مستغنی ہے واقعات جنگ، صف آرائی کی تفصیل، لڑائی کا سماں، باجوں کی آواز۔ توپوں کی گرج۔ ہتھیاروں کی جھنکار، دشمن کی فراری وغیرہ امور کی جو کامیاب مرقع نگاری کی ہے۔ وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اسی کے ساتھ شوکت لفظی خیالات کی جدت و تسلسل بیان قابل قدر ہے۔

تاریخی شاعری:۔ تاریخ و سوانح کے لئے نثر ہی موزوں ہے لیکن موزون طبعی اس کو بھی نظم میں پڑھ کر لذت گیر ہوتی ہے، دکنی شاعروں کی ایسی مثنویاں بھی مقررہ معیار پر کامیاب اُتر سکتی ہیں۔

نصرتی کا علی نامہ (۱۰۷۶ھ) اور تاریخ اسکندری (۱۰۸۳ھ) اور مومن کی "اسرار عشق" (۱۰۹۳ھ) اس نوع کی امتیازی یادگاریں ہیں۔

علی نامہ دراصل علی عادل شاہ ثانی کے عہد کی تاریخ ہے، ضمناً بادشاہ کی مدح میں جو قصائد کہے تھے۔ وہ شامل کر دیئے ہیں، ادب اور تاریخ دونوں کو اس کتاب میں جس طرح آمیزش دی گئی ہے۔ وہ نصرتی کے سحر نگار

قلم کا حق ہے۔

اخلاقی شاعری۔ اخلاق اور موعظت کا میدان شعر و سخن کی مشق کیلئے بہت کافی طور سے کامیاب ثابت ہوا ہے، گلستاں، بوستاں، حدیقہ سنائی وغیرہ جیسے شاہکار دکنی شعرا کے لئے ایک اچھا ماڈل ثابت ہوئے۔ اس خصوص میں رازی کی تصنیف "تحفہ" (۱۰۴۵ھ) اخلاقی مثنوی کا گویا تا حال معلوم شدہ پہلا نمونہ ہے، اسی زمانہ کی ایک دوسری تالیف "پند نامہ شغلی" بھی قابل قدر ہے۔

معاشرتی شاعری۔ معاشرتی موضوعات کسی خوش فکر شاعر کے لئے بہت ترغیب دہ میدان فکر ہوتے ہیں۔ روزمرہ کے حالات اور گذرنے والے واقعات کو شاعری کا لباس پہنا کر لطیف اور پاکیزہ جذبات کا مرقع بنا دینا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

سنترے فروخت کرنے والیوں کی آوازوں کو جہاں ایک دکنی عصری شاعرہ نے انگریزی شعر کا ایک لطیف موضوع بنا ڈالا، وہاں قدیم دکنی شاعروں نے عید، نوروز، شب قدر، ولادت، سالگرہ، شادی بیاہ، ضیافت، محرم وغیرہ جیسے پامال موضوعات میں حسن و زیبائی پیدا کر دی۔ قطب شاہ، ظل اللہ عبداللہ۔ شاہی، نصرتی، شوقی، وغیرہ کی تراوش فکر، نزاکت اور لطافت کو پوری

طرح نمایاں کرتی ہے، نیز اس وقت کے رسم و رواج، طور و طریق، عادات و اطوار کو کافی طور سے واضح کرتی ہے۔ غرض معاشرت کا ہر پہلو صاف طور سے پیش نظر ہو جاتا ہے۔

نیچرل شاعری۔ شمالی ہند میں غزل گوئی کی زمین جس طرح پامال ہوئی اور وہاں کے شعرا کی فکر زلف و گیسو میں جس طرح اُلجھ گئی۔ اس کی بنا پر عام طور پر یہ خیال ہے کہ اردو شاعری نیچرل شاعری کے بازار میں تہی مایہ ہے اور اب عام خیال یہ ہے کہ جدید اُردو شعرا نے اس موضوع میں جو ساز چھیڑا ہے۔ وہ دراصل مغربی مضراب کا ہی ایک سُر ہے۔

لیکن یہ قصہ بھی اب ایک تقویم پارینہ کا مصداق ہے۔ دکنی شعرا کی مشق سخن اس موضوع میں بھی کسی طرح شرمندہ نہیں ہے، مناظر قدرت سے طبیعت میں جو سرور پیدا ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی اچھے نظم نگار کی نظم میں منعکس نہ ہو۔ تو تعجب کا مقام ہوگا۔

سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کے کلیات میں پھول پھل، ترکاری، باغ حوض، محل، چاندنی رات وغیرہ جیسے حالیہ موضوعات پر کئی مثنویاں اور قطعے موجود ہیں اور یہ کسی طرح پست معیار کے نہیں ہیں۔ نصرتی کا قصیدہ جو موسم

سراپا پر لکھا گیا ہے۔ ہر طرح قابل ستائش ہے اسی طرح دھوپ کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ نصرتی کی قادر الکلامی کا شاہد ہے۔

صوفیانہ شاعری کسی اسلامی قوم کی زبان میں شعر لکھے جائیں۔ تو اس میں تصوف و سلوک کو بھی ایک خاص موضوع قرار پانا اب نہیں تو پہلے بہت ضروری تھا، دکنی زبان کے ارتقا کی ایک خصوصیت امتیازی یہ ہے۔ کہ فقرا و مشائخ طریقت نے بھی اس کی غور و پرداخت میں اپنا وقت صرف کیا ہے۔ لامحالہ خود دکنی شاعری میں تصوف و سلوک بھی ایک خاص موضوع قرار پا گیا خواجہ بندہ نواز، میراں جی شمس العشاق شاہ برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ قادر، شاہ من عرف وغیرہ جیسے صاحبان طریقت نے اپنے کلام میں سلوک اور تصوّف کے کئی دقیق مسائل حل کئے ہیں۔

قصائد۔ انسان کے جذبہ شکر گزاری نے شاعری کی زبان میں اپنی جو روئداد بیان کی ہے، وہ ہر زبان کے ادب کا ایک زیور ہے۔ دکنی قصائد بھی دکنی ادب کا ایک قابل قدر سرمایہ ہیں۔ اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ کئی شعرا نے قصائد لکھ کر اپنا زور بیان دکھایا۔ مگر افسوس ہے کہ جس ذخیرہ کا ہم کو اب تک پتہ چلا ہے۔ اس میں صرف چند ہی ایسے خوش نصیب شعرا

قطب شاہ ظل اللہ اور عبداللہ شاہی اور نصرتی ہیں۔ ان میں سے بھی اوّل تین شعرا کے قصیدے عام طور پر دستیاب نہیں ہو سکتے۔ البتہ علی عادل شاہ شاہی اور نصرتی کے قصیدے قابل ذکر ہیں۔

یہ قصائد فارسی قصیدوں کی طرز پر لکھے گئے ہیں، وہی تشبیب، وہی گریز، وہی مبالغہ آمیز مدح ممدوح اور وہی دُعا لیکن ہر شاعر نے دکنی ماحول کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ جدّت ضرور پیدا کی ہے، شاہی کے قصائد کا زور بیان الفاظ کی شوکت، شاہانہ طمطراق داد کے قابل ہے۔

نصرتی نے جس خوبی اور عمدگی سے قصیدہ کے پیرایہ میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے اور پھر جوش خیالات کی جدت تشبیہ اور استعارات کی ندرت یہ سب حق یہ ہے۔ کہ زندگی جاوید کے مستحق ہے۔

مرثیہ۔ شاعروں کے جذبات شکر گزاری نے جس طرح قصیدہ کی صورت اختیار کی۔ اسی طرح حسرت اور غم نے مرثیہ کا ڈھنگ اختیار کیا، دکنی مراثی آج بھی رولا سکتے ہیں، افسوس ہے کہ چند مرثیوں کے علاوہ اس صنف ادب پر بھی اب تک تاریکی چھائی ہوئی ہے +

قدیم سے قدیم جو مرثیہ ہم کو دستیاب ہوا ہے۔ وہ وجہی کا ہے شعرائے گولکنڈہ کے منجملہ قطب شاہ ظل اللہ، عبداللہ، وجہی، غواصی، لطیف، سیوا مرزا وغیرہم کے مرثیے دستیاب ہو چکے ہیں، اور شعرائے بیجاپور کے منجملہ شاہی، نصرتی، ہاشمی اور مرزا وغیرہ کا نام مرثیہ نگار کی حیثیت سے قابل تذکرہ ہے ہم نے کئی مضامین کے ذریعہ اس صنف ادب پر بحث کی ہے، اب یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔

دکنی شاعری کے خصوصیات - اس ساری ساحت کے بعد دکنی شاعری کی بعض خصوصیتوں پر سرسری طور سے کچھ کہنا ضروری ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں شمالی ہند کی شاعری کا موضوع زیادہ تر صرف حسن و عشق، شاہد و ساقی، گل و بلبل کے محدود دائرے میں گھوم کر رہ گیا۔ لیکن ہماری دکنی شاعری نے صرف حسن و عشق کی داستان نہیں بیان کی۔ بلکہ جہاں اس نے حسن و عشق کے بہترین جذبات اور خیالات کے موتی پروے۔ وہیں اخلاق اور تصوف کا گراں بہا سرمایہ بھی مہیا کیا اگر ایک طرف رزمیہ شاعری اور تاریخی واقعہ نگاری کا ذخیرہ موجود ہے۔ تو دوسری طرف مرثیہ گوئی اور مناظر نویسی کا وافر مواد موجود ہے۔ معاشرت اور تمدن

کے متعلق بھی میدان خالی نہیں ہے۔ مضامین کی یہ گوناگونی دکنی شاعری کی اولین خصوصیت ہے۔

دوسری خصوصیت زبان کی سادگی اور عام فہمی ہے، دکنی شاعری کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے مشکل اور ثقیل لغات اس میں نہیں دیئے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے لفظی خزانہ کو ایک گنج نامحدود کی صورت حاصل تھی۔

قدیم دکنی شاعری کی تیسری خصوصیت اس کے عمدہ تشبیہات اور لطیف استعارات ہیں، بڑی بات یہ ہے کہ تشبیہہ اور استعارے سب زیادہ تر اپنے احول سے ماخوذ ہیں۔

خاتمہ۔ یہ خصوصیات اہم اور قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ دیگر خصوصیات بھی ہیں جن کا اظہار طوالت کا موجب ہوگا۔

مگر یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے اسلامی علوم اور آداب میں انحطاط شروع ہوچکا تھا، اصابت فکر و رائے کا ٹوٹا پڑ چکا تھا۔ شرح اور حاشیہ کی گردش میں ارباب علم و فن سرگرداں تھے، قومیت یا اخلاق کے بلند اور اعلیٰ جذبات کی نشو و نما اس زمانہ کی شاعری کی دسترس سے بالکلیہ باہر

تھی، اس لئے اس وقت کی شاعری میں اس امر کی تلاش کہ انہوں نے زندگی کی صلاح اور اخلاق عامہ کی بہتری اور زندگی کے لئے کوئی اعلیٰ نصب العین مقرر کرنے میں کیا نقطۂ نظر قائم کیا تھا۔ تو محض فضول ہے۔

اس زمانہ میں کسی شاعر کو بلند پایہ قرار دینے کا معیار غالباً صرف یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے اپنی محدود چار دیواری میں کس حد تک کامیابی حاصل کی اور فن کے پرکھنے کے جو ظاہری اور رسمی قواعد مقرر ہو گئے تھے، ان پر اس کا کلام کس حد تک پورا اترتا ہے۔

اس اصول کے تحت اگر ہم قدیم دکنی شاعری کا جائزہ لیں۔ تو ہم کو ناکامی نہیں ہوتی۔ بیسیوں شاعروں کا کلام بلاشبہ اقران و امثال میں بہت بلندی پر نظر آتا ہے ؏

(المو سی حیدرآباد)

ولی کا غیر مطبوعہ کلام

(یورپ کے دواوین سے)

ولی اورنگ آبادی کا کلام اب تک متعدد مرتبہ نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ سے بھی شائع ہو چکا ہے اور ابھی حال میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے نہایت اہتمام سے متعدد دیوانوں سے مقابلہ کر کے ولی کے کلیات کو زیور طبع سے آراستہ کیا ہے، اس کے بعد کوئی مزید اضافہ کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، مگر انگلستان کے ذخیرہ کے مدنظر ہنوز اس کلیات کو نامکمل کہنا ناگریز ہے۔

انگلستان میں ولی کے پندرہ دیوان ہیں۔ جن کی صراحت حسب ذیل ہے:-

۱- انڈیا آفس	۸ مخطوطے	(۴) کیمبرج	۳ مخطوطے
۲- برٹش میوزیم	۱ مخطوطہ	(۵) اکسفرڈ	۲ مخطوطے
۳- اڈانبرا یونیورسٹی	۱ مخطوطہ	جملہ	۱۵

ان دیوانوں کے مدنظر نہ صرف ہم اس کے شائع شدہ کلیات میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ بلکہ بعض دیگر حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا نام ولی محمد تھا اور وہ دکن کے باشندے تھے، یہاں سب سے قدیم دیوان ۱۱۴۴ھ کا مرتبہ ہے۔

اس کے قبل کہ غیر مطبوعہ کلام پیش کیا جائے مختصر طور پر ہر دیوان کی صراحت بے موقع نہ ہوگی۔

انڈیا آفس (۱) دیوان نمبر ۱۱۳، ورق (۱۱۰) سائز ۹½ × ۵½ سطر ۱۱ تا ۱۷، خط نستعلیق، کاتب، حفیظ اللہ، سنہ کتابت دوم ربیع الثانی ۱۳ سنہ جلوس محمد شاہ (۱۱۴۴ھ) اس میں (۳۶۵) غزل، دو مستزاد، ستائیس رباعی چالیس فرد۔ نو مخمس، دو ترجیع بند، دو مثنویاں، چار قصیدے درج ہیں، ہر ورق پر جھلی چسپاں کی گئی ہے۔ تاکہ بوسیدہ کاغذ تلف نہ ہو، مگر صاف طور سے پڑھا جا سکتا ہے، نہایت خوشخط ہے، جلد انڈیا آفس میں بنوائی گئی ہے یہ دیوان اس لئے قابلِ قدر ہے۔ کہ یورپ کے دیوانوں میں سب سے قدیم ہے۔

(۲) دیوان (۲) ورق (۲۱۲) سائز ۷½ × ۴½ سطر ۱۱ تا ۱۲ خط نستعلیق تاریخ

کتابت ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۲۴ جلوس محمد شاہ (۱۱۵۵ھ)، اس میں ۳۷۶ غزل سے زیادہ ہیں، کیونکہ بعض حاشیہ کی تعداد شامل نہیں کی گئی ہے۔ اس کے بعد دس رباعی (۴۶) فرد، دو مستزاد، دو بازگشت، دو ترجیع بند، ایک چار در چار ایک مثلث، سات مخمس، اس کے بعد پھر تین مستزاد، دو قصیدے اور ایک مثنوی درج ہے۔

اس نسخہ میں جابجا الفاظ کی اصلاح کی گئی ہے، مثلاً "کہتا ہوں" کو "لکھتا ہوں" بنایا گیا ہے وغیرہ حاشیہ پر متعدد اشعار زیادہ کئے گئے ہیں، اس دیوان پر دو مہر ہیں، ایک میں "محمد عبید اللہ ولد حافظ محمد احمد ۱۱۸۶ھ" اور دوسرے میں محمد احمد ۱۱۶۸ھ مرقوم ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دیوان اُن کی ملک رہا ہے۔

اس میں دیگر اصحاب کے متعدد فارسی شعر بھی درج ہیں اور بعض خانگی یادداشتیں بھی ہیں، بعض اندراجات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ گجرات میں مرتب ہوا ہے، اس دیوان کا کاتب محمد نور الدین علی ہے۔

(۳۱) دیوان نمبر ۱۵۵ ورق (۱۳۴) سائز ۸½ × ۴¾ سطر ۱۱ تا ۱۵ خط نستعلیق تاریخ کتابت   ذیقعدہ ۱۱۵۶ھ کاتب محمد نقی ولد سید ابوالمعالی قریشی

بزرگ ہیں جن کے ساتھ ولی نے دہلی کا سفر کیا تھا۔

اس دیوان میں اول (۳۸۸) غزل اس کے بعد چار قصیدے، ایک ترجیع بند، پھر ایک قصیدہ، تو مخمس (۲۶) رباعی (۲۹)، فرد۔ تین مستزاد پھر ایک ترجیع بند، اور آخر پر ایک اور قصیدہ درج ہے، ابتدائی اوراق خوشخط ہیں، اس کے بعد زشت خط ہو گیا ہے۔

اولاً بسم اللہ کے ساتھ بیس غزل ردیف الف کی خوشخط درج ہیں، اس کے بعد ایک صفحہ پر چند دیگر فارسی اشعار لکھے گئے ہیں، اس کے بعد پھر بسم اللہ کے ساتھ غزلوں کی ابتدا ہوئی ہے، کچھ تو مکرر درج ہوئے ہیں، اور کچھ نہیں ہیں، دیوان کے آخر علاوہ دیگر فارسی اشعار کے فراقی کی ایک غزل اور ایک عربی دعا مرقوم ہے، کتابت کے بعد مقابلہ کیا گیا ہے، جا بجا اصلاح اور حاشیہ پر الفاظ درج ہیں، اس دیوان کے سرورق پر درج ہے۔

"تصنیف مغفرت پناہ میاں ولی محمد متوطن دکن۔"

اور آخری صفحہ پر مرقوم ہے:۔

"تمت تمام شد دیوان مغفرت نشان میاں ولی محمد مرحوم متوطن دکن تاریخ دوئم شہر ذیقعدہ ۱۱۵۶ھ بروز پنج شنبہ بوقت صبح تحریر یافت مالک و

کاتب ایں دیوان عاجز المذہب محمد تقی ولد سید المعالی است کسے

دعوی کند باطل است۔

(۴) دیوان نمبر ۱۱۶، ورق (۱۱۶) سائز ۸ × ۵ سطر ۱۳ تا ۱۷، خط نستعلیق، تاریخ کتابت

اور نام کاتب وغیرہ کی صراحت نہیں ہے۔ مگر کاغذ اور خط کے مدنظر اس کو بھی

بارہویں صدی ہجری ہی کا تصور کرنا چاہیئے۔

اس میں اول چار قصیدے، ایک قطعہ، اس کے بعد دو مثنویاں درج ہیں

اس کے بعد ایک صفحہ خالی چھوڑ کر غزلوں کی ابتدا کی گئی ہے۔ جن کی تعداد (۲۴۷)

ہے، اس کے بعد تین مستزاد، دو ترجیع بند (۲۳) رباعی، چالیس فرد، ایک قطعہ،

اس کے بعد پھر تین غزل اور پھر ایک قصیدہ درج ہے، اس کو بھی جلّی سے

جوڑا گیا ہے۔

اس دیوان پر فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہ نسخہ کالج کی ملک رہا ہے۔

(۵) دیوان نمبر ۱۱۷ ورق ۱۰۶ سائز ½۹ × ½۵ سطر ۱۱ تا ۱۴ خط نستعلیق تاریخ

کتابت درج نہیں، اس میں (۲۲۱) غزل، گیارہ رباعی، چار مستزاد، تین مخمس،

ایک بازگشت، ایک چار در چار، ایک مثلث، ایک ترجیع بند اور دو قصیدے

درج ہیں، دیوان کے آخر حسب ذیل عبارت درج ہے :۔

"چہاردہم جزو دیوان ولی بموجب فرمودۂ بہ جوکرج جیو سلمہ اللہ تعالے بخط

ناپختہ (؟) خادم بروز دسہرہ اتمام یافت"

۶۔ دیوان نمبر ۱۱۸ ورق ۸۵ سائز ۶ × ۸¾ سطر ۱۱ تا ۱۳ خط نستعلیق،

تاریخ کتابت، نام کاتب وغیرہ درج نہیں ہے، بہ لحاظ کاغذ اور خط تیرھویں

صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے، اس میں ۲۰۷ غزل، دو مستزاد۔ دو مخمس درج ہیں

۷۔ دیوان نمبر ۱۱۹، ورق ۱۰۷، سائز ۶ × ۹½ سطر ۱۱ تا ۱۴ خط نستعلیق، یہ دیوان

ناقص اول اور ناقص الآخر ہے۔ اس لئے تاریخ کتابت وغیرہ معلوم نہیں

ہوسکتی، بہ لحاظ شان خط و کاغذ بارہویں صدی ہجری کا ہے۔ اس میں ۱۴۱ غزلیں ہیں

۸۔ دیوان نمبر ۱۲۰، ورق ۷۲، سائز ۷ × ۱۲ سطر ۱۱ تا ۲۱ خط نستعلیق، تاریخ کتابت

۲۷ ذوالحجہ ۱۲۸۰ھ، کاتب غلام محمد۔

اس دیوان میں ۳۰۱ غزل ایک مستزاد۔ ایک مخمس ایک ترجیع بند درج

ہیں، یہ دیوان ولایتی عودسے کاغذ پر لکھا گیا ہے، پہلے صفحہ پر حسب ذیل عبارت

درج ہے :۔

"کتاب ہذا حسب فرمائش جناب سیٹھ صاحب بروزجی سراب جی الیرن

بمقالہ منشی لیسین خان بتاریخ ۱۱؍جولائی ۱۸۸۴ء تسوید شد فقط لیسین خان

اور آخر پر درج ہے :-

"الحمد للہ والمنت کتاب دیوان ولی در بندر سورت اختتام یافت،

تحریر تاریخ ۲۷؍ذالحجہ سنہ ۱۲۸۰ھ الصلوٰۃ والسلام الراقم غلام محمد"

۹- دیوان برٹش میوزیم لندن نمبر ۱۵ ورق ۱۳۴ سائز ۸ × ۶½ سطر ۱۱

خط نستعلیق، تاریخ کتابت ۲؍ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ھ بمقام بوین پلی۔

اس میں صرف غزل ہیں، اکثر مقامات پر حروف، مصرع اور شعر کی جگہ چھوڑ

دی گئی ہے، معلوم ہوتا ہے۔ کاتب سے وہ الفاظ حل نہیں ہوئے۔

۱۰- دیوان مملوک اڈنبرا یونیورسٹی نمبر ۳۷۸، ورق ۱۱۹ سائز ۹ × ۶½ خط

نستعلیق۔ دیوان کے آخری اوراق کرم خوردہ ہیں، اس لئے تاریخ کتابت

وغیرہ جو درج ہے معلوم نہیں ہوسکتی۔ بہ لحاظ کاغذ و شانِ خط ۱۲ویں صدی

ہجری کا ہے، اس میں ۴۶۲ غزل، ایک ترجیع بند، گیارہ مخمس، تین مستزاد،

تین رباعی، دو فرد اور ایک قصیدہ درج ہے۔

۱۱- دیوان کتب کیمبرج یونیورسٹی (نمبر ۳۵۸۰ Add)، ورق ۱۰۲، سائز

۶¼ × ۶½ سطر ۱۴، خط نستعلیق، خوشخط جدول سرخ، تاریخ کتابت ۲۶؍صفر

سنہ ۲۲ جلوس محمد شاہ ۱۱۵۳ھ۔

اس دیوان میں ۲۴۱ غزل، تین مستزاد، ایک بازگشت، نومخمس، دو ترجیع بند، چار قصیدے، ایک قطعہ، دو مثنویاں، ۲۳ رباعی ۱۲ فرد درج ہیں، خاتمہ پرحسب ذیل عبارت درج ہے:۔

"دیوان ولی بحسب فرمائش رفعت و عوالی پناہ خانصاحب مہربان محمد نسار (نثار ؟) چیپو مرقوم شد بتبت وششم شہر صفر سنہ ۲۲ محمد شاہ۔

اس دیوان کو بھی لکھنے کے بعد مقابلہ کیا گیا ہے، اکثر اشعار وغیرہ حاشیہ پر بنائے گئے ہیں، اس دیوان کی ایک خصوصیت یہ ہے، یہ گارسی ڈی ٹاسی کی ملک رہا ہے (Garcin - de - Tasy) کیونکہ اس کے دستخط موجود ہیں، جلد قدیم ہے، ممکن ہے۔ کتابت کے زمانہ کی ہو۔

۱۲۔ دیوان کتب خانہ کنگ کالج کیمبرج نمبر ۱۶۴، ورق ۹۱، سائز ۶ × ۱۰، ۱سطر ۱۴۔ خط نستعلیق، تاریخ کتابت وغیرہ درج نہیں ہے، سرخ جدول ہے، بلحاظ شان خط نیز حصہ دیں صدی ہجری کا ہے، صرف غزل ہیں جن کی تعداد ۳۲۲ ہے۔

۱۳۔ دیوان کتب خانہ کاپر کالج کیمبرج (Cop er College) نمبر ۸۴ سائز ۵ × ۱۰ ورق ۹۵ سطر ۱۰، تاریخ کتابت ۲۵ ربیع الاول سنہ ۱۲۱۲ھ کاتب

آتما رام خط نستعلیق۔

اس میں ۲۴۷ غزل، دو مستزاد، چار رباعی، ایک ترجیع بند، تین مخمس درج ہیں، دیوان کے آخر حسب ذیل عبارت درج ہے :۔

"بخط بندہ احقر آتما رام بتاریخ ۲۵ ربیع الاول سنہ ۴۰ مطابق سنہ ۱۲۱۲ روز جمعہ وقت دوپہر شاہ عالم بادشاہ غازی۔"

۱۴۔ دیوان کتب خانہ اکسفرڈ یونیورسٹی نمبر ۴۶ E ورق ۱۲۵ سائز ۵/۸ ۵ × ۳/۴ ۴ سطر ۱۱ تا ۱۵ خط نستعلیق، تاریخ کتابت وغیرہ درج نہیں مگر کاغذ اور نشان خط کے لحاظ سے بارہویں صدی ہجری کا ہے، اس میں ۳۴۷ غزل مگر ۲۱۳ غزل کے بعد درمیان میں ایک مستزاد اور ایک بازگشت درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد باقی غزل درج ہیں۔ غزل کے ختم پر جو صفحہ ۱۰۱ پر ہوئی ہے۔ "تمت تمام شد دیوان ولی" لکھا گیا ہے اور اس کے بعد دس مخمس، ایک ترجیع بند پانچ قصیدے اور پھر ایک ترجیع بند، ۲۶ رباعی، بیس فرد درج ہوئے ہیں حاشیہ پر بعض الفاظ کے معنی لکھے گئے ہیں اور بعض جگہ اشعار اضافہ کئے گئے ہیں

۱۵۔ دیوان آکسفرڈ، نمبر ۵۸۶ C2، ورق ۹۵، سائز ۹ × ۱/۸ ۵ سطر ۱۷ خط نستعلیق، تاریخ کتابت ۲ رجب سنہ ۱۱۵۳ کاتب امام الدین

اس دیوان میں ۳۶۲ غزل، اس کے بعد ایک ترجیع بند، تین مخمس، ایک قصیدہ ایک مثنوی درج ہیں۔ دیوان کے آخر حسب ذیل عبارت درج ہے:-

"بعون الملک الوہاب حسب الامر حافظ محمدی ولد خوجہ محمد فاضل مرحوم اسکنہ اللّٰہ فی دار الجنان در عہد خلافت بادشاہ جمجاہ خلایق بارگاہ محمد شاہ بادشاہ غازی . . . . . (؟) منصور فی المعارک والمغازی کاتب الحروف شیخ امام الدین ساکن الدکریہ (؟) بتاریخ دوئم رجب المرجب ۱۱۵۳ھ روز شنبہ نسخہ دیوان بوقت چہار گھری روز آمدہ بتصحیح . . . . (؟) این صحائف پرداخت۔"

ان دیوانوں کے متعلق مصنفین کیٹلاگ نے جو فرو گذاشتیں کی ہیں۔ کہ ان صراحت کا یہ موقع نہیں ہے، البتہ چند دیگر امور ضرور قابل تذکرہ ہیں۔

ان دیوانوں سے ولی کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ان کی زندگی سے اب تک مرتب ہوتا رہا ہے اور بلحاظ مذہب وملت ہر شخص نے اس کی قدر کی ہے، جہاں مسلمانوں نے اس کو مایۂ صد افتخار خیال کیا، وہاں ہندو اصحاب نے بھی اس کو قدر کے ہاتھوں لیا، اسی طرح پارسی اقوام نے اس کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا ہے، اسی طرح یورپ نے قدر کی ہے۔

دیوان نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام ولی محمد صحیح ہے اور وہ درحقیقت

دکن کے باشندے تھے، نیز یہ کہ ۱۱۵۶ھ میں وہ بقید حیات نہیں تھے۔

دیوان نمبر ۴ امیں ولی کی غزل ہوا ہے رشک چنپے کی کلی کون لٹ کے

حاشیہ پر ناصر علی کا اردو جوابی شعر حسب ذیل درج ہے :-

باعجاز سخن گر اوڑ چلے تون — نہ پہنچیگا ولی ہرگز علی کون

دیوان نمبر (۱) کا ایک ورق درمیانی موجود نہیں ہے، اگرچہ مصنف کیٹلاگ

نے پنسل سے جو نمبرات قائم کئے ہیں۔ وہ برابر ہیں۔ مگر صفحہ ۵۳ ذیل کے

شعر پر ختم ہوتا ہے۔

چاہو کی ہو ولی کے نمط جگ میں دوربین

انکھیاں میں سرمہ پیو کے خاک چرن کرو

اور صفحہ ۵۴ پر ذیل کے مقطع کے ساتھ صرف تین شعر ہیں :-

ولی مت حاسدان کے ہاتھ سون دل کون مکدر کر

کہ آخر دلسون جاوی گا غبار غیار آہستہ آہستہ

اس سے ظاہر ہے کہ وہ صفحہ جس پر اس کا مطلع اور ما بقی شعر تھے نہیں ہے

نیز دیگر غزل جو اس پر ہونے چاہئیں۔

مثنویاں جن دیوانوں میں درج ہیں، ان کے اشعار کی تعداد تقریباً سب میں ایک ہے اور وہی دو مثنویاں ہیں۔ جو کلیاتِ ولی میں بھی درج ہو چکی ہیں،

انڈیا آفس کے کل دیوانوں کی جلدیں نئی بندھوائی گئی ہیں، البتہ نمبر ۳۱ میں قدیم زمانہ کی جلد بھی شامل ہے، میں اب ایسے کلام کو پیش کروں گا۔ جو یہاں کے دیوانوں سے دستیاب ہوا ہے اور کلیات میں موجود نہیں ہے اور چونکہ کلیاتِ ولی نہ صرف مخطوطوں سے مرتب کیا گیا ہے بلکہ مطبوعہ دیوانوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ذیل کا کلام غیر مطبوعہ ہے بالکل صحیح ہے۔

قصیدہ، مستزاد، بازگشت، مثلث، چار در چار کے متعلق مجھے کچھ صراحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس صنف کا کوئی مزید کلام دستیاب نہیں ہوا ہے۔

مخمس۔ کلیات میں کل پندرہ مخمس شائع ہوئی ہیں۔ جن میں سے تیرہ تو یہاں کے دیوانوں میں بھی موجود ہیں۔ مگر دو کا یہاں پتہ نہیں چلا اس کے برخلاف ذیل کے تین مخمس کلیات میں نہیں ہیں۔ وہو ہذا:-

مخمس

یہ برہ کی تاریکیوں کی جاوی   چلنے کی پکار کیوں کی جاوی
جان دار کی پار کیوں کی جاوی   دل یار کو چھوڑ کیوں جاوی
زخمی سہے شکار کیوں کی جاوے

بھرتا ہوں جہاں جگ سوں ہزار   اس بند میں آہٹو ہوں لاچار
کیونکہ ہو برہ میں مست ہوشیار   جب لگ نہ ملی شراب دیدار
انکھیاں کا خمار کیوں کی جاوی

جب عشق کی فوج نے آئی گھیرا   حیران ہوا ہوا اس سن میرا
اس دن سوں ہوا ہوں تیرا چیرا   یکساں ہے ہمیشہ حسن تیرا
جنت سوں بہار کیوں کی جاوی

یہ دل تری دیکھنے کو روی   ہر شام صبح میں تل نہ سوی
یہ عمر عزیز غم میں کھوئی   انکھوانکے اگر مدد نہ ہووی
مجھ دل کا غبار کیوں کی جاوی

عاشق کی یہی ہے جگ میں تاباں   معشوق کی تانو بیر بکاناں
نہیں کام ہر ایک کا اس میں آناں   ممکن نہیں اب ولی کا آناں

ہے عاشق زار کیوں کی جاوی

یہ خمسہ دیوان نمبر ۲ میں ہے :-

دیگر

اے یارِ من بھلا ہے گا نیچ اس کے بہت جفا ہے گا
جانِ من اس اوپر فدا ہے گا ... مز مبتلا ہے گا
عشق بازوں : نیچ شکا ہے گا

جانِ من اس طرف نزول آیا کر ایک دو بات خوش سنایا کر
ہر کسی کون گلے نہ لایا کر بات کہہ کر سبھی بھلایا کر
اس سون تیرا بہت بھلا ہے گا

جانِ من ہر کہون پھر است کر سخن بد کون سنا مت کر
بانکہ دشمندہ سون ملامت کر ان دخل باز کون لیا مت کر
زانکہ بسیار بیہدہ د؟ ہے گا

تہمتان لوگ کرتے ہیں مجھ پر سب ترے واسطے سنے دلبر
توں مرا یار ہو کسی سون نہ ڈر لاک تلوار گر پڑی سر پر
سر تری راہ پر فدا ہے گا

ورنہ کھچوں جو ہیں تلوار ملک ہندوستان کروں گلزار
جس کے سر پر لگالی مارّں وار یکسوں دو کروں دو دوسوں چار
تیغ میری سوں لاقتا ہے گا

در کفِ یار کا نسۂ تنگ است یار من دیدنش بسے رنگ است
شکر للہ کہ یار ہمرنگ است یار من درجہاں عجب رنگ است
رنگ بار رنگ آشنا ہے گا

یار میرا ہے ہمچو شیریں بر سارے خوبصورتوں میں ہے گا نر
نام رکھا ہوں میں جس کا اژدر مرد اوست مرتضیٰ حیدر
دلربا یوے دلربا ہے گا

اے ولی توں مثال سیمیں بر ہمچو جوگی ہو گشتہ ام در در
یار میرا جو ہے گا جادوگر سحر آنکھوں سنے کیا مجھ پر
نگہ اس کی ہیں کیا بلا ہے گا

یہ خمسہ صرف دیوان نمبر (۲) میں ہے :- دیگر

حضرت نبیؐ کے نور سیں سب جہاں نورانی ہوا
روشن علی کی آل پر جیو جان قربانی ہوا

جامی نظامی مست کھو اب شعر خاقانی ہوا
حب الوطن کی مصر سوں اب یوسف ثانی ہوا
تیرا غم مجھ دل منی اب ہمدم جانی ہوا

معشوق کی منزل منی آواز آیا جرس کا
کرتا جفا جور و ستم دیکھو حیا بی ترس کا
دنیا منی ثابت ہوا کچھ خوف ناہین عرش کا
در در پکارہی ہو پھروں مشتاق تیری درس کا
جل بل برہ کی آگ میں لعل بدخشانی ہوا

اس ملک ہندوستان منی مشہور کامل کا شرف
صابن لگا دھو یا کرو منہ تا نہیں غم کا حرف
ہر یک سوں جا را رتا پری کم ذات کا جو ہے نظرف
راکھی فقیروں کا کمل شاہان کی مسند پہ شرف
ہما کو جس کا بوریا تخت سلیمانی ہوا

ناصح منع کرتا مجھے ہیں مست اپنی حال سوں
دیکھی عجب ہم نے صفت معشوق کے خط خال سوں

اب چھوٹنا مشکل ہوا اس بند کی جنجال سون
سن یہ غزل کلمہ پڑا آکاس اور پاتال ہون
دنیا کی چاروں رکن میں دور مسلمانی ہوا

یہ دل کبوتر ہو مرا گیرا پرا شاہین کا
جل بل انگارا ہو رہا یہ کام ہے نہیں دین کا
پوچھو اگر بہسرِ خدا تک دکھ دفا مسکن ہوا
اس سیس پر قائم اچھو لک سایہ محی الدین کا
معشوق میرے کون مدد محبوب سبحانی ہوا

رباعی - کلیاتِ ولی میں کل (۲۹) رباعیاں شائع ہوئی ہیں - جو یہاں کے دیوانوں میں بھی درج ہیں - مگر ان کے سوا ذیل کی رباعیاں یہاں کے دیوانوں میں موجود ہیں - جو کلیات میں نہیں ہیں :-

نگاہ تیز و پلک تیز و غمزہ آتش تیز کئے ہیں دل سوں مری ملکہ بوسہ تیز تیز
رقیب پر چلی جو چلی بس یو خاک کرنی تھی جو حشر لگ در پکاری بریز بریز

(دیوان نمبر ۱)

دیگر

باج تجھ درد کی جگ میں درد بے مجھے　　　نہیں ہمدم دوجا بجز غیر دم سرد مجھے
جب کہ دیکھا ہوں تیرا اُپ نظر پر اور نہیں　　　عشق تیری نے کیا زر کی نمن زرد مجھے

(دیوان نمبر ۱ ورق ۸۸-الف)

دیگر

تحصیل علم کوں ہوئی یو مکہ کتاب بس ہے　　　دانائے منتخب کوں یو انتخاب بس ہے
مجھ حال کا کرے گر آ کر سوال دلبر　　　تو لاجواب ہو تا آتا جواب بس ہے

(دیوان نمبر ۲ ورق ۱۵۸-الف)

دیگر

جیکہ وہ رشکِ پری جلوہ گرِ ناز ہوا　　　دل کی تسخیر کوں مظہرِ اعجاز ہوا
سبزۂ خط نے رخِ یار کوں بخشتا ہے جلا　　　دیکھ یہ رنگ عجب آئینہ پرداز ہوا

(دیوان نمبر ۵ ورق ۵۸-الف)

دیگر

یوسفِ حسن آج سستا ہے　　　جا کہ لیلیٰ کو جیو ترستا ہے
مدعی کوں کہو کہ جیو دنوں کا　　　وہ نہ دیون کا جو جیو میں بستا ہے

(دیوان نمبر ۲ ورق ۵۹-الف)

دیگر

آہ سوں مجھ جگر میں چھید ہوئی　　　فاش مجھ عاشق کی تہہ ید ہوئی
اس سیہ دلسوں جا کہو یاراں　　　روی دیدی مری سفید ہوئی

دیوان نمبر۲ ورق ۱۵۹-الف و دیوان نمبر۵)

دیگر

تجھ یاد سوں سینہ ہے مرا روشن باغ　　　جس باغ کے دیکھے سوں ہوا لالہ داغ
روشن باغ میں ننگ غم کا محل باندھا ہوں　　　میں آہ کے حسن بیچ کئے لالہ چراغ

(دیوان نمبر ۸ ورق ۹)

دیگر

شاخ گل ہے یا نہالِ راز ہے　　　سرو قد ہے یا سراپا ناز ہے
دود آہ شوق مشتاقاں نہیں　　　خط نہیں یہ حسن کا آغاز ہے

(دیوان نمبر ۵ ورق ۹۲)

دیگر

مہربانی و لطف دلربا　　　سابقا تھا سو اب نہیں دستا
یا مگر خواب وہ زمانا تھا　　　کہ مجھے خواب میں نہیں دستا

(دیوان نمبر ۵ ورق ۹۲)

دیگر

خوبرو کون جمال لازم ہے   عشق کون تب خیال لازم ہے
حسن کون خط و خال لازم ہے   مسکین طوطی کون فال لازم ہے

(دیوان نمبر ۵ ورق ۹۲)

غزل۔ کلیاتِ ولی میں کل (۴۷۳) غزلیں شائع ہوئیں، جو مختلف دیوانوں سے جمع کی گئی ہیں، اس لئے کسی ایک دیوان سے اس قدر غزلوں کا دستیاب ہونا ناممکن ہے۔

پندرہ دیوانوں سے کلیاتِ ولی کا مقابلہ کر کے غیر درج شدہ غزلوں کا پیش کرنا ایک بہت بڑے وقت کا متقاضی تھا اور میں اپنے قلیل وقت میں اس سے زیادہ مصروف نہیں ہو سکتا تھا۔ جس قدر کہ ہوا ہوں، اس پر بھی بلاشک کہا جا سکتا ہے۔ ان دیوانوں میں متعدد غزلیں ایسی ملیں گی۔ جو کلیات میں نہ ہوں۔

اس کے علاوہ خود اختلافِ اشعار بھی ایک خاص صورت پیدا کر سکتا ہے مثلاً کلیاتِ ولی میں درج ہے۔

اے دوست تیری یاد میں دل کو کمال ہے — نقش مراد آئینہ نیر اجمال ہے

لازم ہے درس یار تحصیل رات دن — ہر مدرسے کے بیچ یہی قیل و قال ہے

(صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰)

اس کے برخلاف یہاں کے دیوان نمبر ۱ میں اس طرح ہے۔

اس رشک ماہ کا جسے ہر دم خیال ہے — دل اس کا رشک خوبی بدر کمال ہے

لازم ہے درس یار کی تحصیل اے ولی
ہر مدرسے کے بیچ یہی قیل و قال ہے

کلیات ولی میں درج ہے :-

ترا قد دیکھ اے سیّد معالی — ہوئی روشن دلاں کی فکر عالی

اس کے برخلاف یہاں کے دیوان میں درج ہے :-

ترا قد دیکھ اے سید معالی — سخن فہماں کے ہوئی ہے فکر عالی

غرض کہ اس قسم کا مواد بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے :-

اسی تفصیل میں غزلوں کے متعلق جو بعض حواشی کلیات ولی مطبوعہ انجمن ترقی اردو میں درج ہیں ان کے متعلق بھی یہاں کے مواد سے روشنی ڈالنی غیر مناسب نہیں ہے۔

غزل نمبر ۲ کلیات: کسی دیوان میں زیر بحث شعر نہیں ہے

غزل نمبر ۵۹ کلیات: غزل موجود ہے۔ مگر زیر بحث شعر نہیں ہے۔

غزل نمبر ۷۳ " : زیر بحث شعر نہیں ہے۔

غزل نمبر ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۲: یہاں کسی نسخہ میں نہیں ہیں۔

غزل نمبر ۱۶۶: کسی دیوان میں زیر بحث غزل نہیں ہے۔

غزل نمبر ۱۹۰: کسی دیوان میں نہیں ہے

غزل نمبر ۱۹۲: " " "

صفحہ نمبر ۱۹۸ پر ایک غزل کے پانچ شعر درج ہیں، یہ غزل بھی دستیاب نہیں ہوئی ہے۔

ولی کی مثنویاں اور وہ مجلس۔ جامع کلیات ولی نے دو مثنویوں کو درج کر کے لکھا ہے۔

ایک مثنوی غالباً ولی کی وہ مجلس کا ابتدائی حصہ ہے اور اس کے بعد

وہ مجلس کا قطعۂ تاریخ بھی درج کیا گیا ہے، مگر یہ صراحت نہیں ہے۔ کہ وہ قطعہ کس کس دیوان میں موجود ہے۔

مجھے "وہ مجلس" کے ولی کی تصنیف ہونے سے اختلاف ہے، میری رائے ہے۔ کہ ولی اورنگ آبادی نے "وہ مجلس" نام تصنیف نہیں کی، میں اپنی تائید میں حسب ذیل امور پیش کرتا ہوں۔

ا۔ ولی کے اب تک جس قدر دیوان دیکھے گئے اور جن میں مثنویاں درج ہیں، اگر ایک مثنوی اس کے "وہ مجلس" کا ابتدائی حصہ ہے۔ تو اس کا صرف اسی قدر حصہ ہر دیوان میں درج ہونا ایک تعجب انگیز امر ہے، یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ کل دیوان ایک سے نقل ہوئے ہیں، اور یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ہر جامع دیوان نے کیوں وہ مجلس کے ابتدائی حصہ کو اپنے دیوان میں نقل کیا، مثنوی کا صرف اسی قدر حصہ دیوان میں ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ ولی نے اسی قدر حصہ کہا تھا۔

(ب) "وہ مجلس" کوئی تصنیف کسی ولی کی اب تک دستیاب نہیں ہوئی۔ نہ تو ہندوستان کے کتب خانوں میں اور نہ یورپ میں اس کا پتہ چلا، اس سے قیاس ہو سکتا ہے۔ کہ ولی کی وہ مجلس کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے

ج - یورپ کے کسی دیوان میں "وہ مجلس" کا قطعہ تاریخ درج نہیں ہے۔ خصوصاً سب سے قدیم دیوان ۱۱۴۴ھ اور ابوالمعالی کے فرزند کے مرتبہ دیوان میں اس کا نہ ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ولی نے وہ تاریخ کہی ہی نہیں۔

ان وجوہ سے میں وہ مجلس کو ولی کی تصنیف خیال کرنے سے قاصر ہوں میرا خیال ہے۔ کہ "وہ مجلس" جو ولی سے منسوب کی گئی ہے۔ دراصل وہ ولی ویلوری کی "روضۃ الشہدا" ہے، خصوصاً جبکہ روضۃ الشہدا کا بیان دس مجلسوں میں بیان کیا گیا ہے اور ہر مجلس کا پہلا شعر مجلس ہی کے نام سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً

کروں ہیں مجلسِ اول میں تحریر وفات سیّدِ عالم کا تقریر

کروں ہیں مجلسِ دوئم پُرغم وفاتِ فاطمہؓ کر کر رقم

قلم ہو غم کے صحرا کا مسافر لگیا چلنے دہم مجلس میں اک سر

اس طرح "روضۃ الشہادۃ کا دوسرا نام" وہ مجلس" ہو سکتا ہے، پھر تاریخ

تصنیف کے شعر قریب قریب ایک ہوگئے ہیں۔ چنانچہ روضتہ الشہدا میں درج ہیں :-

کیا ہون ختم جب یو درد کا قال   اگیارا سو اوپر تھا تیسوان سال
ولی اب کہہ قلم اور ختم کر یا ب   نبی اور آل اوپر نزول صلوات

کلیات میں جو قطعہ درج ہے وہ حسب ذیل ہے :-

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال   گیارہ سو پوتھا اکتالیسواں سال
کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول   ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کاتبوں کی غلطی سے سہو کتابت ہوئی ہے۔

بہر حال جب تک وہ مجلس نام کوئی کتاب ولی کی دستیاب نہ ہو اور اس میں ولی کی مثنوی کا وہ حصہ جو دیوانوں میں درج ہے، موجود نہ ہو۔ میں اس کو ولی کی تصنیف خیال کرنے میں تامل کرتا ہوں۔

فردیں۔ کلیات ولی میں کل ۹۰ فرد درج ہیں بعض اور فردوں کا پتہ چلتا ہے جو کلیات میں نہیں ہیں۔ مثلاً دیوان نمبر ۱ و ۳ میں درج ہیں۔

ترشی چین و شکر لب یار   حق میں میرے ہے شربت لیموں

(صفحہ ۸۹)

گناہاں کی سینہ نامے سوں کیا غم ہے پریشان کو
جسے یہ زلف دست آویز ہے روزِ قیامت کو

کیوں نہ اسکوں صافی حاصل مثال ارسی
اپنی جوہر کی حیا سوں سر بسر پانی ہوئی

(ص ۹۰)

روز و شب یک برس اگر برسے   نہ بھرے کو کہ کا نگر تالاب

(ص ۹۰)

تجھ جام لب سوں بوند پڑی خاک جم مین گر
ملے جام مثل لالہ نکالے دو بولی سر

(ص ۹۰)

دیکھ کر سب سے سینے تراس مجھے   لے گئی نیند پیو کے پاس مجھے
ترے ساغر چشم طلسمی تے نین   کیا یک دو رہین مجنون مجھے

ہے ترے لب سوں اے شکر گفتار   بات کہاں نبات سوں شیرین
(صفحہ ۹۰)   (معارف ۱۹۳۰ء)

ولی کا غیر مطبوعہ کلام

(حیدرآباد کے ایک دیوان سے)

ایک زمانہ تھا کہ اردو شاعری کی ابتدا ولی سے قرار دی جاتی تھی اور اُسے اردو شاعری کا "بابا آدم" کہا کرتے تھے، مگر اب کہ ولی سے دو صدی پیشتر کی شاعری کے بکثرت نمونے مل گئے ہیں۔ اِس خیال کی تردید ہوگئی ہے۔ شمالی ہند اور دکن کا کوئی قدیم اور جدید تذکرہ ایسا نہیں ہے جس میں ولی کا ذکر نہ ہو اور اس کے کلام کا کوئی نہ کوئی نمونہ نہ پیش کیا گیا ہو، یورپ کے محققین نے بھی ولی کے متعلق بہت کچھ تحقیق و تلاش کی ہے اور اس کا کلام شائع کیا ہے۔ مگر باوجود اس کے اس شاعر کے متعلق متعدد امور ایسے ہیں۔ جو اب تک مختلف فیہ رہے ہیں۔

ولی کا نام مختلف تذکرہ نویسوں نے مختلف بتایا ہے۔ چنانچہ اتنے نام اس سے منسوب کئے گئے ہیں شمس الدین، شمس ولی، ولی اللہ، محمد ولی ولی محمد، ان میں سے کوئی ایک نام صحیح ہوسکتا ہے اور یہ نام ولی محمد ہے نام کی تحقیق کے لئے شمالی ہند کے تذکروں کے علاوہ ہم کو دکن کے قدیم

تذکروں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے، کیونکہ شاعر کے اہل وطن کے قول کو ترجیح ہے خصوصاً جب کہ ان تذکرہ نویسوں کا زمانہ ولی سے قریب تر بھی ہے۔ مگر دکن کے قدیم تذکروں یعنی گلشن گفتار[1] چمنستان شعرا[2]۔ اور ریاض حسینی[3] میں بھی کسی قدر اختلاف ہے۔ حمید نے شاعر کا نام ولی محمد لکھا ہے۔ شفیق اور فتوت نے محمد ولی۔ بخلاف اس کے جو دیوان[4] ابو المعالی کے بیٹے محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں "ولی محمد" نام لکھا گیا ہے ابو المعالی، ولی کے خاص دوست اور رفیق تھے۔ اس لئے اُن کے بیٹے کا ولی کے نام کو غلط لکھنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ یہی نام حمید نے بھی بتایا ہے اور حمید کا تذکرہ دکن کا سب سے پہلا تذکرہ ہے۔ ان تمام باتوں پر نظر کرکے یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے شاعر کا نام ولی محمد تھا۔

ولی کے وطن کے متعلق جو اختلاف ہے۔ اس پر جامع "کلیات ولی" مولانا احسن مارہروی نے تفصیل سے بحث کی ہے اور بخوبی ثابت کیا ہے، کہ ولی

---

[1] مصنفہ خواجہ خان حمید (سنہ ۱۱۶۵ھ میں تصنیف ہوا) حیدر آباد سے شائع ہوا
[2] مصنفہ لچھمی نرائن شفیق (۱۱۷۵ھ میں تصنیف ہوا) انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔
[3] مصنفہ خواجہ عنایت اللہ فتوت (۱۱۷۵ھ میں تصنیف ہوا) ہنوز شائع نہیں ہوا
[4] یہ دیوان انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہے۔ دیکھو "یورپ میں دکنی مخطوطات" صفحہ ۴۸۲

گجرات کا باشندہ نہیں تھا۔ بلکہ دکن ہی اس کا اصلی وطن تھا۔ احسن صاحب نے خود ولی ہی کے دو شعر نقل کئے ہیں۔ جن کے بعد ولی کے دکھنی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شفیق اور قنوت اور محمد تقی ولی کے اورنگ آبادی ہونے پر متفق ہیں اور دکن میں سوا اورنگ آباد کے کسی شہر کو ولی کا وطن ہونے کا دعویٰ بھی نہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ ولی اورنگ آباد (دکن) کے اصلی باشندے تھے۔

تاریخ وفات کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ بعض اصحاب ۱۱۵۵ھ قرار دیتے ہیں اور بعض ۱۱۴۲ھ قدیم دکھنی تذکروں میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے۔ مولف "اردوئے قدیم" نے ۱۱۴۲ھ قرار دیا ہے مگر حال میں مولوی عبد الحق صاحب کی تحقیق نے ۱۱۱۹ھ ثابت کیا ہے۔

ولی کی تصنیفات کے متعلق میں نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں تفصیل سے بحث کی ہے (ص ۴۶۴) یہاں صرف اسی قدر کہہ دینے کی ضرورت ہے۔ کہ دیوان کے سوا اُس کی کوئی اور تصنیف صحیح طور پر اس کی جانب منسوب نہیں کی جا سکتی۔ دکھنی شعرا کے حسب عادت کوئی طویل مثنوی ولی نے نہیں لکھی۔ ولی کا کلام اب تک کئی بار شائع ہوا ہے اور سب سے آخر "انجمن ترقی

اردو" کی جانب سے ولی کا کلیات بڑی کاوش اور تلاش کے بعد نہایت اہتمام سے شائع ہوا ہے اور اس میں متعدد قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا مواد یکجا ہے۔ مگر اب بھی ولی کے بعض قلمی دیوانوں میں ایسا کلام ملتا ہے۔ جو نہ کسی مطبوعہ دیوان میں ہے اور نہ "کلیات ولی" میں۔ یورپ کے پندرہ نسخوں میں غزلوں کے سوا جس قدر کلام غیر مطبوعہ تھا۔ اس کا ذکر ہو چکا ہے افسوس ہے کہ یورپ کے قیام کے زمانے میں مجھے اتنا وقت نہیں ملا۔ کہ غزلوں کا بھی مقابلہ کرتا۔

دیوان ولی کا ایک ایسا ہی نسخہ راقم الحروف کے بزرگ مولوی خلیل اللہ صاحب کے کتب خانے میں ہے۔ جو ۱۱۵۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ جو کلام "کلیات ولی" میں نہیں داخل ہے۔ مگر اس نسخے میں ملتا ہے۔ وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

پہنچہ ترے ہاتھ کا پیچدار ہے دستار سے جی کتیں مثل مار
جو بیٹھا ہے مرے دل میں غبار رہیوں یو چیرا ترا جعفری نوک دار
پٹکہ کمر میں ترا دیکھ کر ہوا ہے یو ایک دل مرا پار پار
تیر سے پہ دلی کے بوالہوساں تمام کیئے ہیں یو بستر مرا داغ دار

خماری تیرے نین کی یاد کر   ولی کے انکھاں سوں لہو دھار دھا

پھرتے ہیں تیرے عشق سیں مجنوں ہو یاراں ہر طرف
گرتے ہیں تیرے برہ کے یکسر پو گاران ہر طرف

یو خال ہندو دیکھ کے تجھ کہ ہوئے ہیں کافراں
تسبی مصلا ڈال دے کے دین داراں ہر طرف

ہو گئے عاشقاں تجھ جو اُن کے دل اپر ،
شمشیر آبرو سیں تیرے لاگے جو دھاراں ہر طرف

گلشن میں ہے تجھ رشک سیں لالہ گریباں چاک کر
جیوں تجھ درس کے خوف سیں رنگیں اناراں ہر طرف

کھایا ہے سنبل سر بسر بے جاں آپس ہیں دیکھ کر
زلفاں کوں تجھ رخسار پر پکڑے بو ناراں ہر طرف

ہر پلک تیری چشم سیں ہر خوبرو کے جی پہ یوں
لاگیں ہے کاری سخت جیوں خنجر کے دھاراں ہر طرف

ہر جھاڑ پر تجہ عشق سیں پرتیاں ہیں قمریاں مست ہو
اپنی گلی میں بہا کر بڑھا کے ہاراں ہر طرف
ٹک تجہ حسن کوں دیکھ کر سب ہوش اپنا کھوے کر
پڑتے ہیں تیرے منقبت سب گلعذاراں ہر طرف
پڑنے ولی کے نین سوں انجھواں ایسی شدت ستے
برسے ہے جیوں بادل ستے کرکے سو باراں ہر طرف

دوست مت رکھو رقیب بدگو کوں سُرخ روئے نہ دے سیہ رو کوں
کار عاشق تو راست بازی ہے کج نکو کر سجن تو اپنے آبرو کوں
گیسوئے تابدار دلبر کے دام ہیں میرے دل کے آہو کوں
دل عشاں بند ہوتے ہیں جب وہ کھولے آپس کے گیسو کوں
خون عاشق سوں شوخ چشم ولی! آب دیتا ہے تیغ ابرو کوں
ہوا ہے رشک مہر و مشتری کون سجن کی دیکھ دستار زری کوں
نہیں ہے مشک کون کچھ قدر جب سوں معطر کی ہے زلف عنبری کوں
ہو دیں مجنوں صفت ہر نقش دیوار اگر دیکھیں وہ اس رشک پری کوں

کیا تجھ رشک لب نے لعل کوں خوں   کہو جا یو حقیقت جوہری کوں
ولی آتا ہے بیہوشی سوں مدہوش   نظر کر تجھ گلابی بکتری کوں

پڑیا ہے رشک میں سورج رخ سید معالی سوں
رہا ہے زرد ہو ہو چندر اس کے لب کی لالی سوں
دیا ہے داغ لالا نے اپس دل رشک سیں دیکھو
جو دیکھا اس کے پر جامہ اُنے رنگ گلابی سوں
خجل ہو دیکھ کر اس کے چمن میں غنچہ لب کوں
چنبیلی کی ہوئی کلیاں ھر ایک ڈالی سوں
چلے جب انجمن میں وہ یقین ہے اس کے پاواں سوں
اوٹھیں ہو ہو کے سب نسندے عزیزاں نقش فانی سوں
کشش تل اس کے چہرے کی کہاں جرأت بشر کے ہے
عطارد جو ہوا حیراں آپس کے فسکر عالی سوں
شب تاریک کون جاگا کہاں ہو اس کے گھر بھتر
پڑے جب چکنیں چندنا جو اس مکہ کی اجبالی سوں

ہوا ہوں عاشقی کے ملک کا میں جب سیتی صوبہ

چلے معزول ہو بختوں میری تسدن بحالی سوں

ولی توں شعر اپنے کی نہ کر تعریف ھـــــہ کس کن

ہنسے گا تجھ پہ بے غایت گھر کر(؟)کوئی خیالی سوں

چشم تیرے جو مست و غلطاں ہیں　　عبیرے میں . . . . . ہیں

یو جو دو ہونٹ و چشم مست ہوئے　　تار گیسو کے کیوں پریشاں ہیں

رحم کر، لطف کر دکھا درشن　　ہجر تیرے میں یار بے جاں ہیں

تیرے پلکاں بہور ن کماں ان کے　　عاشقاں جان و دل سوں قرباں ہیں

تجہ زنخداں کے چاہ کے بھیتر　　یوسف مصر آج حیراں ہیں

خاتم حسن دیکھ تیرے ہات　　تجہ اطاعت میں سب سلیماں ہیں

دیکھ کر تجھ لباں کی یو سرخی　　خونِ دل لعل رشک مرجاں ہیں

آج بازار حسن میں تیرے　　مشتری زہرہ اور کیواں ہیں

صد ہزاراں شمع زین میانے　　سوز سوں، مکہ ترے کے گریاں ہیں

عشق تیرے کا جو ہوا ہو مریض　　دنگ اس کی دوا میں لقماں ہیں

آفرین شعر پروئی کے سن بولتے وہ کہ جو سخنداں ہیں

حسن کا تخت تجکوں میسر ہوئیجیو مکہ تیرا ماہ و سال (؟) ہوئیجیو

سرو شمشاد سب چمن میانے قد ترا دیکھ سر نگوں ہوئیجیو

دوست جو غیر تیرے مکہ کا ہے دشمن چرخ نیلہ گوں ہوئیجیو

جو نین تیرے مکہ کوں نا دیکھے نت رواں اس نین سوں خون ہوئیجیو

جگ کے خوباں کا قد ترے آنگے لحظہ و لمحہ . . . ؟ ہوئیجیو

قد ترا دیکھ خم جو نہیں ہوتا اس کا تن مثل بید مجنوں ہوئیجیو

تیرے دیدار کا جو نہیں طالب حق کے دیدار سوں برس ہوئیجیو

شعر تیرے کا شوق عالم میں روز و شب' اے ولی! افزوں ہوئیجیو

صاف دل کوں اگر مدام رکھو جام جمشید کا مقام رکھو

گر تمہیں تاب انتقام نہیں بے سمجھ مت کسی سے کام رکھو

خیال کی مت کرو طرف داری خاطر زلف مشک فام رکھو

ناز کی سرکشی کوں دیکھوں گا آج میرا نیاز نام رکھو

تیغ آبرو کی جب وو جھاڑا ہے   کئی ہزاراں کوں جی سیں مارا ہے
ایک غمزے سوں چشم کے اُننے   کئی چکاروں کلنیں پچھاڑا ہے
اس کی صورت کوں حق مصور ہو   کھینچ کیا ناز سوں اتارا ہے
ہر پلک عاشقوں کے جی کے تئیں   کاٹنے کوں لیس ایک آرا ہے
کان کے در کی کیا کروں تعریف   پہلو میں ماہ کے جیوں تارا ہے
اس کے سر طرۂ مقیشی کا   کیا جھلک اور عجب جھکارا ہے
آج اس سیدا کی خوبی کا   خیل پریوں میں کیا پکارا ہے
حق سیں مغرور ہو کے پھرتا ہے   ہے ولی یار کیا بچارا ہے

جنبی کی کلی رشک سوں ہر کھلی   تو پہنتا سجیا سر پو جب صندلی
گلاں چھوڑ کے سب چمن کے سجن!   کریں شور بلبلاں تیرے آگلی
تری تیغ ابرو کی دہشت سیتی   بجنی فلک کے اوپر بجلی
اگرچہ جلیں سب شمع پر پتنگ   ہیں تجھ شمع پر شمع ساری جلی
ترے لب ہنستے کوں کہاں پہنچتی   اگر کوئی بوے شکر کی ڈلی
پری دیکھ تجھ مکھ کی جھلکار کوں   قدم بوس کرنے کو آوے چلی

فراموش قانون حکمت کرے اگر ملکہ کوں دیکھے ترے بوعلی
پڑے گر تیری پیچ میں زلف کے ولایت بسر جائے اپنی ولی

زبس نرم ہیں پانو کے اُس تلے کہ ریشم پہ رکھتے ہیں انہنی ؟ چھلے
گرائے مستے بوے کی غش کرے وہ جب عطر جامے پہ اپنے ملے
ادب سیں اُسے سرو سجدہ کریں کہ جب وہ مٹکتے چمن میں چلے
نظر کرم سوں ایک شوخ کی چمن میں گلاں کئی ہزاراں گلے
وہ مکہ دیکھ روشن سورج آپ سوں اپس تن کنتیں جال کرتے چلے
حرکت کو اس کان میں دُر کی دیکھ دل عاشق کے مانند پارا ہلے
کرے مشتری رشک جب اس ہاتھ پر کٹاری جو اس شوخ کے جھل جھلے
ولی کے بچن دل کے دریا ستی نکلتے کہ جیسے واراں ہر...

لدھی میری طرف لالن تم آتے نہیں سو کیا معنی
چھبیلا تک اپس کا مکہ دکھاتے نہیں سو کیا معنی

جدائی کے . . . . ہو ظالم تو میری توجہ کوں
که مجھ اس دکھ کی پھانسی سوں چھڑاتے نہیں سو کیا معنی
کیا ہوں جان و من اپنا فدا تیری محبت میں
اجھوں لگ بات دل مجھ سناتے نہیں سو کیا معنی
ولی اس بات کی (؟) ہے رات دن افسوس مجھ دل میں
که میری بات تم خاطر میں لیاتے نہیں سو کیا معنی

تیرے ہونٹاں کی لالی سوں معالی! چھپی پانوؤں میں جا منہدی کی لالی
ترا قد دیکھ تجھ پانوؤں پر جھک جھک پڑے شمشاد کی ڈالی پہ ڈالی
بیان تجھ زلف کی سیاہی کا کیا کہوں کہ نہیں ہے مثل اس کی رات کالی

یہ غزل نامکمل ہے کیونکہ اس کے بعد کا ایک ورق نہیں ہے۔ اس دیوان میں ایک مستزاد ایسا ہے۔ جو "کلیات ولی" (ص ۱۷۴) میں بطور سادہ غزل کے درج ہے :۔

میں سورۂ اخلاص ترے رو سوں لکھا ہوں اے معنی الفت
بسم اللہ دیوان تجھ ابرو سوں لکھا ہوں عنوان محبت

تجھ چشم کی تعریف کوں آہو کے نین پر | از وقت بینش
اکثر قلم نرگس جیا دو سوں لکھا ہوں | تصویر نزاکت
اے موے میاں! وصف ترے موے میاں کی | با حال پریشانی
وحشی ۔۔۔۔ کمر پر[۱] قلم مو سوں لکھا ہوں | دائم کلفت
تجھ طرۂ طرار کی تعریف کوں اے شوخ | ایسا رحیا سوں
سنبل کے چمن میں گل شب بو سوں لکھا ہوں | ہنگامۂ وحشت سوں
اے مردمک چشم اوپر[۲] حال کا ولی کا | کر اپنے کرم سوں
پیکاں کے قلم کر آپس انجھوں[۳] سوں لکھا ہوں | انکھیاں کی حکایت

(ہندوستانی ماہ جنوری ۱۹۳۳ء)

۱۔ کلیات: "چیتے کی کمر"۔

۲۔ کلیات: اس مردمک چشم طرف

۳۔ کلیات: "آنسو ۔ ۔ ۔ پلکاں"۔

وجہی مرثیہ گو کی حیثیت سے

وجہی کی شخصیت اب محتاج تعارف نہیں رہی۔ اس کی تصانیف میں سب سے پہلے "سب رس" کا پتہ چلا۔ جس پر رسالہ اردو میں مولوی عبدالحق صاحب نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد یورپ کے ذخیرہ سے مثنوی "قطب مشتری" دستیاب ہوئی۔ اس کے نام اور مصنف کے متعلق بلوم ہارٹ مصنف کیٹلاگ نے کوئی صراحت نہیں کی تھی۔ اس کے متعلق میں نے رسالہ معارف میں صراحت کی ہے۔ میرے دوست ڈاکٹر مولوی سید محی الدین صاحب قادری نے تفصیل سے اس پر مضمون لکھا ہے جو مکتبہ میں شائع ہوا ہے۔

وجہی کا نام اس کا سنہ پیدائش اور وفات سب تاریکی میں ہیں ہم کو نہیں معلوم اس کا کیا نام تھا؟ وہ کب پیدا ہوا؟ اور کب فوت ہوا؟ مگر تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں موجود تھا اور شاعر کی حیثیت سے نامور ہو چکا تھا۔ محمد قلی (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے عہد میں اپنی مثنوی قطب مشتری کی ۱۰۱۸ھ میں تکمیل کی۔ اس میں اس نے

ابراہیم قطب شاہ کی اس طرح مدح کی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے
کہ وہ سلطان کے زمانہ میں موجود تھا چنانچہ اپنی مثنوی میں لکھتا ہے

آتا قطب کی مدح کر اختیار — جو رہے یو قیامت تلک یادگار
ابراہیم قطب شاہ راجہ دہراج — شہنشاہ ہے شاہ شاہاں ہیں آج
عدل بخشش ہور داد اس تے اچھے — سدا خلق سب شاد اس تے اچھے
جتے پادشاہاں ہیں سینسار کے — بھکاری ہیں سب اس کے دربار کے
سلیماں تے فاضل ہے اس بخت بل — پڑے دیو جن سب ہیں اس حکم ل
اسی شاہ عادل کے غصّہ تے ڈر — لیا ہے گگن کون پون پیٹ پر
تناول ہے اس عدل کے خوف منے — کہ بجلیاں کھڑیاں کا پتیاں پن منے

وجہی کی دوسری تصنیف سب رس ۱۰۴۵ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ اس سے
واضح ہو سکتا ہے۔ کہ وہ ۱۰۴۵ھ تک نہ صرف زندہ تھا بلکہ تصنیف کر سکتا تھا اگرچہ
خیال ہو سکتا ہے کہ ۹۸۸ھ کا شاعر ۱۰۴۵ھ تک کس طرح زندہ رہا مگر یہ کوئی طویل
عمر نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر ۹۸۸ھ میں اس کو پچیس ۲۵ سال کا فرض کیا جائے۔ تو ۱۰۴۵ھ میں
۸۲ سال کی عمر ہوگی۔ جو ناقابل یقین نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ بعض دیگر شہادتوں
سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ کہ دونوں کا مصنف ایک ہی وجہی ہے ؎

ا۔ قطب مشتری کا وجہی غواصی کا ہمعصر تھا۔ جس کے ثبوت میں اشعار ذیل پیش کئے جاتے ہیں :-

اگر غوطے لاک برس غواص کھائے   تو یک گوہر دنت تھا سو لک نہ پائے
بو موتی نہیں دو جو غواص پائیں   یو موتی نہیں دو جو کس ہات آئیں

ب۔ سنہ ۱۰۴۱ھ میں ایک وجہی دکھنی شاعر زندہ تھا جس نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے فرزند کی تاریخ تولد کہی تھی "آفتاب از آفتاب آمد پدید" اس کے بعد غواصی کی تاریخ کا ذکر کیا گیا ہے۔

(تاریخ نظام الدین احمد مخطوطہ انڈیا آفس)

اس سے واضح ہے کہ سنہ ۱۰۴۱ھ میں وجہی جو دکنی شاعر تھا زندہ تھا۔ اور نہ صرف زندہ تھا۔ بلکہ نظم بھی کہا کرتا تھا اور اس کو سلطان کا تقرب حاصل تھا اور غواصی سے کسی بات میں فوقیت رکھتا تھا۔ کیونکہ نظام الدین احمد اگرچہ غواصی کا بڑا مداح اور اس کے کمال کا معترف ہے لیکن وجہی کا ذکر مقدم کرنا ضروری تصور کرتا ہے۔ یہ تقریباً ناممکن ہے۔ اسی قدر قریب زمانہ میں ایک ہی تخلص کے دو شاعر ایک ہی مقام میں موجود ہوں اور پھر وہ بہ لحاظ فن مشہور اور معروف ہونے کے علاوہ بادشاہ کا تقرب بھی رکھتے

ہوں۔ دربار شاہی میں باریاب ہوں۔ بغرضکہ قطب مشتری اور سب رس کا مصنف ایک ہی شخص کو قرار دینا ضروری ہے۔

وجہی کب فوت ہوا؟ یہ بھی معلوم نہیں۔ مگر ۱۰۸۱ھ میں موجود نہیں تھا اس کو مرے عرصہ گذر چکا تھا۔ کیونکہ طبعی نے اپنی مثنوی "بہرام و گل اندام" میں اس طرح ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کو مرے عرصہ ہو گیا۔

جیسا کہ بیان کیا گیا۔ وجہی ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا شاعر ہے۔ غالباً اس نے کم عمری سے شاعری شروع کر دی تھی۔ کیونکہ قطب مشتری سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا مصنف کہنہ مشق شاعر ہے۔

وجہی کے زمانہ میں گولکنڈہ میں ہر طرف علمی فضا تھی۔ شعر اور شاعری کا چرچا تھا۔ کئی ایک مشہور شعرا مثلاً محمود۔ فیروز۔ احمد وغیرہ کے کارنامے موجود تھے مگر وجہی نے خاص وقعت اور امتیاز حاصل کر لیا تھا اور اس کا اعزاز اس قدر بلند تھا۔ کہ وہ سلطان قلی کو بہ حیثیت ہیرو پیش کرتا ہے۔ اور اپنے ہمعصروں کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ اس کی نظر میں کسی شاعر کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ وہ اپنے عزت و مرتبے اپنی قابلیت و لیاقت

اپنے شعرو شاعری کا کسی کو مد مقابل تصور نہیں کرتا۔ دوسرے شعرا اس کے مقابل ہیچ ہیں۔

وجہی جس طرح شعر گوئی میں یکتائے زمانہ تھا۔ اسی طرح نثر نویسی کا ملکہ رکھتا تھا سب رس اس کی بیّن شاہد ہے۔

اگرچہ اس زمانہ (۱۰۴۵ھ) میں غواصی کا طوطی بول رہا تھا اور وہ دربار قطب شاہی میں ملک الشعرا کے درجہ تک پہنچ چکا تھا۔ وجہی کی وہ عزت نہیں تھی۔ جو سلطان قلی کے دربار میں تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے۔ کہ ملا نظام الدین احمد اپنی تاریخ میں غواصی کی تو بڑی تعریف و توصیف کرتا ہے اور وجہی کا ذکر یوں ہی کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ . . . . وجہی کو غواصی کے مقابل شکست ہو چکی تھی۔ مگر وہ دربار سے ممنوع نہیں ہوا تھا۔ قصائد اور تاریخیں کہہ کر پیش کرتا تھا۔

وجہی بڑا خوش قسمت ہے۔ کہ اس کی تصنیف سے نظم و نثر دونوں کے نمونے موجود ہیں۔ اس کے قصائد کا پتہ چلتا ہے۔ گو وہ اب ناپید ہیں۔ آج ہم وجہی کو بہ حیثیت مرثیہ گو پیش کرتے اور مرثیہ کا نمونہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے علمی کارناموں سے ہم ناواقف نہیں ہیں۔ ان کی علمی قدر دانی اور علم پروری کی زندہ یادگاریں تحریری صورت میں صدہا موجود ہیں۔ جن کی صراحت موجب طوالت ہے۔

چونکہ دونوں سلطنتوں کا شاہی مذہب امامیہ تھا۔ اس لئے ان کے یہاں مجالس عزا کا خاص دستور تھا اور عام طور پر مرثیہ گوئی ہوتی تھی اس ماحول کا نتیجہ تھا۔ کہ اکثر نامور شعرا ضرور مرثیہ کہا کرتے تھے اور پھر کئی ایک شعرا نے خاص مرثیہ گوئی کو اپنا پیشہ کر لیا۔ سوائے مرثیہ کے کچھ کہا ہی نہیں کرتے۔

عادل شاہی عہد کے مرثیہ گویوں میں ہاشمی اور مرزا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح قطب شاہی شعرا میں شاہی۔ کاظم اور مرزا کا نام یادگار رہے گا۔ ان خاص مرثیہ گویوں کے علاوہ دیگر شعرا بھی مرثیہ کہا کرتے۔ چنانچہ قطب شاہی شعرا سے احمد وجہی اور غواصی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کے مرثیے آج بھی موجود ہیں معلوم ہوتا ہے۔ زمانہ سلف میں اکثر بیاضوں میں ان مرثیوں کو جمع کرتے تھے۔ تاکہ مجالس عزا میں ان کو سنایا جائے۔ اس قسم کے متعدد بیاض ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ ان میں سے دو اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ ایک میں تو تقریباً کل ہاشم علی

برہان پوری کے مرثیے ہیں اور دوسری میں انہی شعرا کے مرثیے جمع کیے گئے ہیں۔
ایک اور بیاض کنگ کالج کیمبرج کے کتب خانہ میں ہے۔
ہمارے خاندانی کتب خانوں میں متعدد بیاضوں کا پتہ چلا ہے۔ ان میں سے آج کل ایک بیاض ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم کے کتب خانہ کی ہے۔ اس بیاض میں وجہی کا ایک مرثیہ دس شعر کا موجود ہے۔
اس کے متعلق صراحت سے پہلے اصل مرثیہ پیش کیا جاتا ہے۔

مرثیہ حضرت حسینؑ

حسین کا غم کرو عزیزاں — انجو نین سوں جھرو عزیزاں
بنا جو اول ہوا ہے غم کا — عرش گگن ہور دہرت ہلایا
قضا میں سوں جوں لکھیا الٰہی — کریا حسین پر ادھی سمایا
نبیاں و لیاں کے انجو انسوں کھرے — یو غم حسین کا حسنم بھولایا
دلاں میں ود لگی چھوہ تے چٹکیاں — یو غم نے سلگا دھرک لگایا
یو کیا بلا تھا یو کیا جفا تھا — مگر قضا تھا سو حق دکھایا
محب دلاں کوں اجل کا ساقی — پیالے غم کے سو بھر پلایا

یو کیا اندیشہ اندیشس کیتا　　فلک شہاں پر ستم خدایا
حسین پہ یاراں درود بھیجو　　کہ دین کا یو دیوا جلایا
تمارے دہی کوں یا اماماں
نہیں تمن بن یو اس کوں سایا

یہ کوئی طویل مرثیہ نہیں ہے اور نہ اس میں مبالغہ اور قوت بیاں کا اظہار کیا گیا ہے۔ چھوٹے قصے تلوار کی تعریف گھوڑے کا وصف۔ صبح کا سماں۔ جنگل دھوپ کا منظر کچھ نہیں ہے۔ اُس وقت کی روزمرہ زبان میں غم حسین کا اظہار مقصود ہے۔ دوستوں کو مخاطب کرتا ہے۔ اے دوستو حسین کا غم کرو آنکھوں سے آنسو بہاؤ۔ یہی سب سے پہلا غم ہے قسمت میں جو جو لکھا وہی ہوتا ہے اور تم تو کیا غم حسین نے انبیا اور اولیا کو بھی رولایا ہے۔ غم نے دلوں کو زخمی کر دیا اور جگر میں آگ لگادی ۔ یہ ستم یہ جفا خدا کو دکھانی تھی دکھائی ساقی اجل نے غم کے پیالے پلائے افسوس فلک نے شہنشاہ ہی پر ظلم و ستم ڈھایا دوستو حسین پر سلام کہو۔ درود بھیجو جو دین کا ستون ہے۔ آخر پر دعا کرتا ہے کہ دہی کو آپ کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔

اس سے بہتر اس سے جامع اس سے واضح اس سے صاف کوئی مرثیہ

نہیں ہوسکتا جس طرح سادہ الفاظ میں وجہی نے غم حسین کو بیان کیا ہے وہ تعریف کا محتاج نہیں ہے۔

وجہی کی شاعری کا نمونہ قطب مشتری اور نثر نویسی کا کمال سب رس سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس مرثیوں کا کوئی کافی ذخیرہ نہیں ہے جس سے وجہی کی مرثیہ گوئی پر اظہار خیال کیا جا سکے۔ مگر یہ بلا خوف کہا جا سکتا ہے۔ وہ مرثیہ بھی کہا کرتا اور اچھے مرثیے لکھ سکتا تھا۔

(مکتبہ حیدرآباد ماہ ۱۳۴۰ف)

چند دکنی مرثیہ گو

مجھے یہاں اس سے بحث نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا دکن سے ہوئی یا شمالی ہند سے؟ مگر بقول نصیر حسین خاں خیال شمالی ہند میں ہمایوں کے دوبارہ واپس ہند آنے کے پیشتر مجالس عزا اور مرثیہ گوئی کا دستور نہ تھا۔ مگر اس کے کم و بیش نصف صدی پہلے دکن میں ان کا رواج تھا۔ ابتداً تو محتشم کاشی کے بند پڑھے جاتے تھے۔ مگر اس کے بعد بہت جلد دکنی مرثیوں کا آغاز ہوگیا

دکنی مرثیوں کا ایک مجموعہ اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں دیکھا گیا ہے۔ ایک اور بیاض کنگ کالج کیمبرج میں ہے۔ ہمارے خاندانی کتب خانوں میں متعدد بیاضیں ہیں۔ جن میں سے ایک ہمارے پیش نظر ہے۔

ان بیاضوں میں مرثیے۔ نوحے۔ سلام سب کچھ موجود ہیں۔ ان کے مرثیوں کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

۱۔ بیاض مملوکہ اڈنبرا یونیورسٹی دیوان حسینی سے موسوم ہے۔ اس میں ہاشم علی برہان پوری کے تقریباً (۲۵۰) مرثیے۔ نوحے اور سلام کے علاوہ قادر کا ایک نامکمل مرثیہ ہے۔

۲۔ بیاض اڈنبرا یونیورسٹی گویا اول الذکر کا تکملہ ہے۔ کیونکہ قادر کا مرثیہ اس میں مکمل ہوا ہے۔ اس میں (۸۰) شعرا کے ۳۰۰ مرثیے۔ نوحے وغیرہ ہیں ان دونوں بیاضوں کے اوراق کی تعداد (۲۴۷) ہے۔ ان کے متعلق مصنف کیٹلاگ کی صراحت حسب ذیل ہے:۔

"مراثی حضرت علیؓ۔ آنحضرتؐ اور حسینؓ مصنف ہاشم علی جو اردو کا ایک ابتدائی شاعر تھا۔ یہ ہاشم ولی اور قاسم کے پہلے گذرا ہے۔ یہ جہانگیر کے زمانہ میں بیجاپور میں رہتا تھا۔ ۱۰۳۰ھ اور ۱۰۵۶ھ میں بھی زندہ تھا۔ ایک

اور ۱۰۴۶ھ جو صفحہ (۳۵) پر درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ تصنیف اسی سنہ میں ہوئی ہے۔ ہاشم شیخ احمد فاروقی کا مرید تھا جن کا انتقال ۱۰۳۴ھ میں ہوا ہے

ہاشم علی چند دیگر کتابوں کا بھی مصنف ہے ایک فارسی دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ چند اشعار کاظم اور رفادر کے بھی ان جلدوں میں شامل ہیں، مصنف کی یہ صراحت صحیح نہیں ہے۔ اس کا زمانہ گیارہویں صدی نہیں۔ بلکہ بارہویں صدی ہجری ہے۔ آگے چل کر اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

۳۔ بیاض کنگ کالج اس میں (۳۲) شعرا کے تقریباً ۱۵۰ مرثیے ہیں۔ درمیانی ایک ورق پر تاریخ کتابت حسب ذیل درج ہے:۔

"تمت تمام شد بدست فقیر العباد غلام نبی ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۵۷ھ ہجری۔"

۴۔ بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین مرحوم اس میں (۴۳) شعرا کے (۴۱۱) مرثیے ہیں۔ تاریخ کتابت درج نہیں۔ مگر یہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم کو ان کے والد کے ترکہ میں ملی ہے۔ مولوی صاحب کے والد نواب سالار الملک کا انتقال ۱۲۸۳ھ میں ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ اس کی کتابت ۱۲۸۳ھ سے پہلے ہوئی ہے۔

اگرچہ ان بیاضوں میں اکثر مشترک اصحاب کے مرثیے ہیں مگر کئی ایک ایسے ہیں جن کے مرثیے دوسری بیاضوں میں نہیں ہیں۔ علیٰ ہذا کسی میں ایک شخص کے مرثیے زیادہ ہیں۔ تو دوسری میں دوسرے شخص کے مثلاً اڈنبرہ کی بیاض میں مرزا کے صرف (۱۶) مرثیے ہیں۔ مگر مولوی صفی الدین مرحوم والی میں اس کے (۳۴) مرثیے ہیں۔ ان میں سب سے نایاب یہی آخرالذکر قرار دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اس میں قطب شاہی عہد کے قدیم ترین شعرا مثلاً وجہی غواصی۔ عبداللہ قطب شاہ لطیف وغیرہ کے مراثی موجود ہیں۔

دکنی مرثیے شمالی ہند کے مرثیوں سے چند امور میں فوقیت رکھتے ہیں۔

ا۔ ان مرثیوں سے صاف طور پر مرثیہ پن ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا اصلی مقصد امام حسین اور اہل بیت کا غم کرنا اور آنسو بہانا ہے۔ کوئی مرثیہ اس خصوصیت سے خالی نہیں ہے۔

ب۔ مرثیوں میں ادبی شان بھی پائی جاتی ہے۔

ج۔ دکھنی مرثیوں میں جذبات نگاری کے جوہر موجود ہیں، انسانی جذبات کی تفصیل واضح طور پر کی جاتی ہے

د۔ دکھنی مرثیوں میں ہندوستانی فطرت کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، ہندوستانی ماحول کا اثر ان کے مرثیوں میں پایا جاتا ہے، ہندوستانی ماں، ہندوستانی بیوہ۔ ہندوستانی بہن، ہندوستانی دلہن کی جھلک اُن کے مرثیوں میں نظر آتی ہے۔

ہ۔ ان مرثیوں میں سیرت نگاری کا حق بھی ادا کیا گیا ہے، ان میں نہ صرف بیانی سیرت نگاری ہے۔ بلکہ مکالمے کے ذریعہ بھی سیرت نگاری کی گئی ہے۔

و۔ روایات کو بھی نظم کیا گیا ہے مگر فرضی روایات اور افسانے ان کے مرثیوں کا جزوِ اعظم نہیں ہیں۔

ز۔ اکثر مرثیوں سے مصنفین کے متعلق تاریخی حالات معلوم ہوتے ہیں شاعر کے نام اور وطن اور ان کے ہم عصروں کی صراحت معلوم ہوتی ہے

ح۔ مبالغہ اور تصنع کو زیادہ کام میں نہیں لایا گیا ہے۔

دکھنی مرثیوں کا ذکر تین دور میں کیا جاسکتا ہے یعنی قطب شاہی و عادل شاہی مرثیہ گو۔ دورِ مغلیہ کے مرثیہ نویس اور عہد آصفیہ کے مرثیہ گو سردست ہم صرف دو ابتدائی دور کے مرثیہ گو کا تعارف کراتے ہیں۔

قطب شاہی عہد کے جن شعرا کے مراثی دستیاب ہوئے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں :-

۱- سلطان قلی (۲) وجہی (۳) غواصیؔ (۴) عبداللہ قطب شاہ (۵) لطیف (۶) شاہی (۷) کاظم (۸) مرزا۔

ان کے علاوہ نہیں معلوم اور کتنے مرثیہ گو تھے۔ بہت ممکن ہے۔ کہ خود ان بیاضوں میں ان کا کلام شامل ہو۔ جن کے زمانہ سے ہم واقف نہیں۔

اسی طرح بیجاپوری شعرا سے علی عادل شاہ - ہاشمی - مرزا قابل ذکر ہیں جن کے مرثیے ہمیں دستیاب ہوئے ہیں۔

(۱) وجہی وہ خوش نصیب شخص ہے۔ جس کی تصنیف سے نظم و نثر دونوں کے نمونے موجود ہیں۔ مثنوی قطب مشتری جس کی تصنیف ۱۰۱۸ھ میں ہوئی ہے۔ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔ ہم کو اس کا ایک مرثیہ ملا ہے جس پر ہم نے علیحدہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے یہاں اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

(۲) غواصی - اس کی شخصیت اب محتاج تعارف نہیں رہی۔ دکنی ادب کی کچھ اس نے خدمت کی ہے۔ وہ فراموش نہیں ہو سکتی۔ افسوس اس کی

پوری لائف سے ہم اب بھی واقف نہیں ۔ کسی کو نہیں معلوم اس کا نام کیا تھا اور کہاں پیدا ہوا؟ کس خاندان سے تھا؟ ہم کو اس کی نسبت جو کچھ معلومات ہیں۔ ان کا ماحصل یہ ہے :۔

غواصی سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا عمر میں وجہی سے چھوٹا تھا سلطان محمدؐ کے زمانہ میں اس کی شاعری چمکی ۔ مگر سلطان کے دربار تک رسائی نہیں ہوئی حتیٰ کہ اس نے اپنی تصنیف "سیف الملوک بدیع الجمال" مکمل کر دی ۔ اس زمانہ میں وہ اگرچہ شاہی ملازم تھا ۔ مگر دربار تک باریابی نہیں ہوئی تھی ۔ اس کو تمنا تھی ۔ کہ سلطان تک رسائی ہو جائے ۔ آخر اس کی امیدوں کے موافق وہ حضور سلطانی میں پیش ہوا اور عزت و شوکت حاصل ہوئی ۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں اس کا خاص رسوخ تھا ۔ سلطان کی توجہات اور عنایات سے ہمیشہ سرفراز ہوا کرتا ۔ سفیر شاہی کی حیثیت سے بیجاپور روانہ کیا گیا ۔ جہاں خوب آؤ بھگت ہوئی واپسی کے وقت قیمتی تحائف حاصل ہوئے ۔

مذہب کے لحاظ سے وہ سنی تھا ۔ بلوم ہارٹ نے یہ بالکل غلط لکھا ہے کہ غواصی شیعہ مذہب کا پیرو تھا ۔ وہ اپنی تصنیف میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

کی مدح نہایت خلوص اور عقیدت سے کرتا ہے۔ اس نے خود اپنے شیعہ نہ ہونے کی صراحت سیف الملک میں کر دی ہے۔ چنانچہ برٹش میوزیم کے ایک ناقص نسخہ میں لکھتا ہے :-

فدا ہوں انند دلیوں کے اوپر
سنور رافضی خارجی کاٹ کر

آخر زمانہ میں اس کی حالت بالکل بدل گئی تھی۔ وہ دنیا کو ترک کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اپنے دنیادار ہونے پر لعنت ملامت کرتا ہے۔

اس کا انتقال کب ہوا یہ بھی معلوم نہیں۔ البتہ بہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے زمانہ میں فوت ہوا۔

فی الوقت اس کی دو تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو مثنوی سیف الملک و بدیع الجمال جس کی تصنیف ۱۰۳۵ھ میں ہوئی اور دوسری مثنوی طوطی نامہ جس کو اس نے ۱۰۴۹ھ میں مرتب کیا۔ اس کی اردو تصانیف کا قیاس ہوتا ہے۔

(۱) مثنوی یوسف۔ زلیخا۔

۲۔ مثنوی لیلی مجنوں۔ مگر بسر دست یقین کے ساتھ اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

اب تک یہ نہیں معلوم تھا۔ کہ غواصی مرثیہ نویس بھی تھا۔ معلوم ہوتا ہے اکثر قطب شاہی شعرا مثنویوں وغیرہ کے ساتھ مرثیہ بھی کہا کرتے تھے۔ ہمیں غواصی کے دو مرثیے دستیاب ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ کوئی طویل مرثیے نہیں ہیں بلکہ (۱۰) اور (۹) شعر کے ہیں۔

ان کے متعلق کسی مزید صراحت کے پہلے ان کو درج کیا جاتا ہے۔

مرثیہ حضرت امام حسینؑ

دستا نہیں کروں کیا او بیان کربلا کا — پھرتا ہوں زار ہول ہیں حیران کربلا کا

اسمان تے خدایا جبریل اوتر کو آیا — روتا او پرتے لایا فرمان کربلا کا

کمر باند کربلا ہیں کرشکر ہر بلا ہیںؑ — کیوں ہے کہ کربلا ہیں کہ سلطان کربلا کا

ہے دکھ بڑا یو سب تے نین کس قرار تب تے — پکڑیا حسین جب تے میدان کربلا کا

دکھ سر ملک تے بیں ماتم زدے ہوئے ہیں — رو رو دریا کئے ہیں اسمان کربلا کا

چندا سکہ سوں سوتا اس کی سوں عمر کھوتا — تاریاں سوں روز روتا فرمان کربلا کا

جلتا ہے سور جوتی دنیا کہری ہے روتی   کان تے ہوا یو کوئی مہمان کربلا کا

منجہ سکہ نہیں ہے دو کہ تن میں ہال چھن چھن   لاگیا ہے رات ہور دن منجہ دہیان کربلا کا

رو رو کہ دلبسارا منجہ شاد کرنے ہارا   سو ہے حسین پیارا سو شہ جان کربلا کا

غوّاصیا معطر عالم کون سب کیا ہے

گویا یو مرثیہ ہے ریحان کربلا کا

(از بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین مرحوم)

دیگر

ماہ محرم سوز سون آیا اہل دل منے سیر سون

رونا عالم یک ریز سون کیا کام کیتا ہائے ہائے

کیوں حیف نہیں آیا تجھے کن بند سکلایا تجھے

یو کام کیوں بھایا تجھے کیا کام کیتا ہائے ہائے

کر بادشاہی پر ہمم شاہان کون دیتا غم یو غم

مظلوم پر کرنے ستم حیفی نہ کھایا ہائے ہائے

دکہ شاہ زادے کون دیا بدنامی اپنے سر لیا

آخر او کافر کیوں کیا اپنا چ تبا یا ہائے ہائے

موراک کہنی بہا گلے جوگی جنگم پرنے چلے

ازادسون دیتا ک تے سب تن جلایا ہائے ہائے

روتے ملک سب عرش لگ سج تارا اپنا جھلک

مشرق ستے تا مغرب تلک اندکار ریا یا ہائے ہائے

غم سون کر بیت الحزن یعقوب نے کھویا نین

شیرین کے بہانے کوہ کن آپ چپو کھوایا ہائے ہائے

بولے غواصی مرثیہ سن روئے دکن کے ادلیا

ہر سال کا یو مرثیہ کیا کام کیستا ہائے ہائے

(از بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین مرحوم)

ان کے ملاحظہ سے واضح ہو سکتا ہے۔ مرثیہ صرف اظہار غم کے لئے مخصوص تھا۔ ان کا مقصود یہ تھا غم حسین پر صف ماتم قائم کی جائے اور آنسو بہائے جائیں۔ کوئی فرضی اور جھوٹے روایات بیان کر کے مرثیہ کو طول نہیں کیا۔ عربی اور فارسی کے الفاظ بہت کم استعمال ہوئے ہیں۔ مبالغہ اور تصنع حدِ اعتدال سے زیادہ نہیں۔ اپنے وطن کا اظہار اور اپنے ہر سال مرثیہ کہنے کا ذکر بھی کر دیا گیا۔

(۳) سلطان عبداللہ قطب شاہ۔ گولکنڈہ (حیدرآباد) کے قطب شاہی سلسلہ کا ساتواں تاج دار ہے ۱۰۳۵ھ میں سریرآرا سلطنت ہوا اور ۱۰۸۳ھ تک حکمرانی کرکے فوت ہوا اپنے باپ دادا کی طرح علم دوست اور علم پرور تھا۔ بڑے بڑے نامی گرامی علماً اور اہل کمال سلطان کے دامن دولت سے وابستہ تھے جن کے منجملہ چند یہ ہیں:۔

علامہ فہامی میر مجدالدین جو علامہ میر محمد مومن کے فرزند اور فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ سیادت پناہ میر سید محمد اسفرانی عمدۃ الفضلا قاضی حسن قاضی ظہیرالدین محمد الحسنی حکیم عبدالجبار گیلانی۔ مرزا محمد جوہر تبریزی۔ مرزا حمزہ استرآبادی مرزا فضل اللہ شیرازی۔ مرزا محمد مشہدی۔ قاضی عطاءاللہ گیلانی

سلطان کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی۔ فارسی کے بلند پایہ شاعر مثلاً مولانا رونقی۔ ملا خلقی۔ نوراللہ قیصری وغیرہ ہم سلطان کے دربار میں تھے اسی طرح دکنی شعرا کا جمگھٹا تھا۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

وجہی۔ غواصی۔ ابن نشاطی۔ جنیدی طبعی۔ امین۔ لطیف وغیرہ
سلطان کی علمی قدردانی اور علم پروری کی طویل داستان ہے۔
سلطان کو شعر و سخن کی دلچسپی کے ساتھ شعرگوئی کا بھی خاصہ ملکہ تھا۔ ضخیم

دیوان کا مصنف ہے جس کا ایک نسخہ نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں
ہے ۔ چونکہ ہم نے دیوان دیکھا نہیں ہے ۔ اس لئے اس کے متعلق کسی
تشریح سے قاصر ہیں ۔

اس زمانہ کے رواج کے مطابق سلطان مثنوی غزل رباعی وغیرہ کے ساتھ
مرثیہ بھی کہا کرتا تھا یقین ہے اس کے دیوان میں متعدد مرثیے ہوں گے
مگر چونکہ ہماری بیاض میں صرف ایک مرثیہ ہے ۔ اس لئے اسی کو پیش
کر دیا جاتا ہے ۔

یہ مرثیہ مرثیہ حضرت امام حسینؓ سے موسوم کیا گیا ۔ کل بیس شعر ہیں :-

علی ہور فاطمہ کرتے ہیں دو نو آج زاری بھی
حسن کا ہور حسین کا دو کہ لے آیا جنگ پو خواری بھی
حسین جب چلے لڑنے سراں نہیں پر لگے پڑنے
شہیداں ہر طرف چڑنے لگیا یو دو کہ پیاری بھی
وصیت یوں کئے جاتے نکو رو تم آپ بہاتے
نہیں تو پھر کونین انی اجل آئی ہماری بھی
یتیماں کو سنبھالو ہور عنبر لبی میں سکھا لو ہور
بھوت مہراں سون پالو ہور رہیں گے یادگاری بھی

پریگا غم تمن پر جب میرا غم یاد کرنا تب
یو دو کہ یاد آویگا ہر یک کر ونین اشکباری بھی
سوتے یو غم حرم سارا مسلم ہونرا دہارا
سو ماری کل گلا نعرا پکڑ کر بے قراری بھی
شہر بانو کہی آ کر کہ اسے بینسار کے سرور
منجے غربت منے بہا کر نجاؤ چھوڑ باری بھی
منجے کے جاوتے یوں جال تمن بعد از میرا کیا حال
کرو مت غم منے پائمال دیو درس تماری بھی
علی اکبر کہنے میں جانوں سو پیاساں ہیں جو پانی لاتوں
زخم کھا کر آئے پھر اب لگا نوں بھی ہے مشک ساری بھی
دیکھو طفلاں منگے پانی ذرہ مہربانی
ستم سوں تیر مارا نے کئے اد نابکاری بھی
حسین پانی پیئے اسے یزیداں تیر برسائے
سو پانی پینے نہیں پائے لگے مکہ لہو کی دہاری بھی
بغیر از ظلم بیدادی نہ تھی اس وقت کچھ شادی
ہوئی قاسم کی دامادی دیکھو تقدیر یاری بھی

سو دیدیاں نبوت بودند کر جو خوشیاں سات پیوند کر
حرم کون لے چلے بند کر پر باجگ سب اندھاری بھی

عروس آکر پکڑ دامن چلے تو شوہو جب جھو جن
نشانی کچھ دیو منجکن سو پیارا ستین تماری بھی

حسین کا وقت جب داتیا شمر نے آ گلا کاتیا
حرم کا دیک سینا پیا تپا دینا اور اپکاری بھی

ننگے پاوان چلے آئے سو پاوان کون چھلے آئے
اگن دیکھین چلے آئے نکتے دو سنداری بھی

کپت کنی سینے بیٹھ آ قیامت کچھ نہ اندیشہ
اپن مارا یا اپلے تیشہ تو پایا گرفتاری بھی

یزید دیکھا حسین کا سر پھرایا پیت سون پھر پھر
سو دیکھو لعنتی کافر کیا کفر اختیاری بھی

کرو اے دوستاں ماتم ثواب ہے بہت کرنا غم
مدد ہوویں گے امام ہر دم کی ہے امیدواری بھی

حسین کا دکھ دل میں آن لگا یک چپٹ سون اتم دہان
کرے قطب عبداللہ سلطان دو کتو سوں شہر یاری بھی

۴۔ علی عادل شاہ بیجاپور۔ سلاطین قطب شاہی کی طرح بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین علم وہنر ہی کے سرپرست تھے۔ علی عادل شاہ ثانی اس سلسلہ کا آٹھواں تاجدار ہے جس نے ۱۰۶۷ھ سے ۱۰۸۳ھ تک حکمرانی کی۔

اس کا دورِ حکومت ترقی علم وفن خاص کر اردو کی ترقی کے لئے مشہور ہے۔ اس کا دربار باکمالوں کا مجمع تھا۔ دور دور سے اہل علم وفضل آکر اس کے دامن دولت سے وابستہ ہو جاتے تھے۔ اس کے زمانہ میں بیجاپور علم وہنر کی قدردانی کے لحاظ سے رشک بغداد اور قرطبہ بنا ہوا تھا۔ ہر ایک مورخ نے سلطان کی تعریف کی ہے اس زمانہ کے مشاہیر علما کی طویل فہرست ہے جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

قاضی نوراللہ جنہوں نے اس کے دورِ حکومت کی بہترین تاریخ لکھی شاہ کمال الدین، علامہ فتح اللہ شیرازی۔ میر ابراہیم ابن علامہ حسین ابوالحسن مکونہ۔ ارسطو زمان، ملا احمد، میر نعمت اللہ، شامیراں جی مصطفیٰ خان کیانی وغیرہ۔

سلطان کو شعر وسخن سے خاص ذوق تھا۔ اسی ذوق وشوق کا

نتیجہ تھا۔ کہ بیجاپور میں گھر گھر شعر و شاعری کے تذکرے ہونے اور شاعری کی مجلسیں قائم ہوتی تھیں۔ اس زمانہ کے کئی ایک شعرا مشہور ہیں۔ مثلاً ملک الشعرا نصرتی، حکیم آتشی، عبد القادر نوری، مقیمی، دولت، امین شاہ ملک، ایاغی، مرزا، ہاشمی وغیرہ ان میں سے کچھ تو صرف فارسی گو تھے اور مابقی اردو اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اُن کے کارنامے آج تک محفوظ ہیں۔

سلطان علی خود بھی اچھا شاعر تھا۔ نصرتی جو ملک الشعرائی کے درجہ پر فائض تھا۔ خود سلطان کا شاگرد تھا۔ افسوس ہے سلطان کا دیوان[1] یا مثنویاں دستیاب نہیں ہوئیں۔ اس لئے جو کچھ کلام دستیاب ہوتا ہے۔ وہ گویا ایک نایاب خزانہ ہے۔

ہم کو سلطان کا ایک مرثیہ دستیاب ہوا ہے جس کے ۱۲ شعر ہیں زبان کے لحاظ سے اس کو بہت صاف کیا جا سکتا ہے۔

مرثیہ حضرت امام

شہ کے غم سوں دل ہے نالاں ہائے ہائے

جگ برستی جوں اچھالاں ہائے ہائے

---

[1] اب سلطان کا کلیات دستیاب ہو چکا ہے اور اس کی صراحت قبل ازیں کر دی گئی ہے

جگ کے سرور دل کے لہو سوں بہر چلے
پہور کر پلکھاں سکے بالاں ہائے ہائے
یک شگفتہ گل نہ اس غم سوں رہیا
ہر خزاں میں نونہالاں ہائے ہائے
دم تڑے کی دل میں وک سوں لہو جمیا
تو پنچتے کہن میں لعلاں ہائے ہائے
اس سدیاں کوں کھول انکیاں ویک توں
بے بر دشر کے ادو ہالاں ہائے ہائے
کربلا کی سب زمیں رنگیں ہوئی،
لہو بری دلدل کے نالاں ہائے ہائے
تن گگن کا پھو کر بجر کیا
آہ کے تیراں کے بہالاں ہائے ہائے
نہیں شفق جگ پہ پنجہ کر ستے ملک
لہو بہری سو اور مالاں ہائے ہائے
بر میں لاشے زمین کے پیت پہر
حیف او صاحب جمالاں ہائے ہائے

کر خوشی ہور خرمی کے گر پرے
آہ کے چھنٹے میں نالاں ہائے ہائے

اس دکھوں بھر کے اتنی سب تن منے
نت جلیں انکھیاں ہلالاں ہائے ہائے

نت کر عادل[1] علی یکدل ستے
شہ کا ماتم ماہ و سالاں ہائے ہائے

(ایضاً)

(۵) لطیف (گولکنڈہ) غلام علی خاں لطیف قطب شاہی عہد کا قزلباش امیر تھا امامیہ مذہب کا پیرو تھا۔ شاعری یا مرثیہ گوئی اس کا پیشہ نہیں تھا۔ بلکہ بطور تفنن الطبع شاعری کرتا۔ ان کو اپنی امارت اور شرافت کا بڑا فخر تھا۔ اس کے متعلق اپنی مثنوی میں جا بجا صراحت کی ہے۔ ان کو اپنے حیدر آبادی ہونے پر بھی ناز ہے۔

لطیف بڑا پر گو شاعر تھا۔ پانچہزار پانچ سو شعر کی مثنوی صرف ایک سال کی قلیل مدت میں لکھ دی۔ جو ظفر نامہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں محمد حنفیہ کا ایک فرضی قصہ منظوم کیا گیا ہے۔ اس کی تصنیف ۱۰۹۵ھ

---

[1] اگرچہ سلطان کا تخلص "شاہی" تھا ممکن ہے کبھی اپنے نام کا بھی اظہار کیا ہو۔

میں ہوئی ہے۔ غالباً یہ ان کے آخر زمانہ کی تصنیف ہے۔

عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں یہ موجود تھے۔ اپنے مرثیہ میں انہوں نے صراحت کر دی ہے۔ وہ غواصی کے زمانہ میں موجود تھے۔ غالباً غواصی کے عہد میں یہ نوجوان ہوں گے۔

لطیف کا کوئی مرثیہ یورپ میں نہیں ہے۔ ہمارے خاندانی بیاض میں ان کا ایک مرثیہ ہے جس کے (۲۵) شعر ہیں۔ طرز عبارت کے لحاظ سے اس کو بھی صاف کہنا چاہیئے۔

مرثیہ حضرت امام حسینؓ

اے اہل درد اشک سوں انکھیاں کوں تر کرو
نکلیا ہے پھر یو ماہ محرم نظر کرو
نازل زمین پو سر تے ہوا غم حسین کا
ماتم زدیاں کو ایک طرف تے خبر کرو
پھر تن کے عود سوز میں غم کی انگار آج
جیواں کوں عود ہور دلاں کوں اگر کرو
سلطان کربلا کی غریبی کوں یاد کر
ٹکڑے جگر کوں ہور دلاں کوں خنجر کرو

ہے ڈر اگر تمن کون قیامت کے دھوپ کا
سایہ کون اہل بیت کے سر کا چھتر کرو

جہاں لگ خوشی دنیا کی ہے سب ناخوشی ہے
ہور اس ناخوشی تے بات میری سن حذر کرو

شیرِ خدا کی بات میں یک رنگ خاک ہو،
آسماں ہور زمین کے اوپر فخر کرو

سنسار کے گھراں کون بقا نہیں فنا ہے۔ لو
تکیہ تم اس گھراں پون یوں بسر کرو

خلقت میں یو وجود ہے پتلا جو خاک کا
ہرگز نہ اعتبار تم اس کے اوپر کرو

گر دیندار ہے تو دیو دین کون رواج
یعنی بشر ہو خدمت خیر البشر کرو

منگتے ہے سرخ رو تمہیں دو جہاں میں تو
امرت کنکول ہور زبان کون شکر کرو

امت نبیؐ کی ہو نہ پلو باند لیو پاپ،
دوزخ میں ست ستم نہ آپس پر عذر کرو

خلق محمدؐ کرم مرتضےٰ علیؓ

انسان ہور عین یو اپنا سپر کرد
دل میں بقا کے گھر کا اگر ہے ہوش من
نیکی کے دام خرچ کرو جنت میں گھر کرد
بیدرد ہے جکوئی خوش اس تے خدا نہیں
مرد ہو گلے میں درد کے یک دم کدز کرد
ایمان جون چراغ ہے عاقبت کے دار کا
بار اگے نہ تیوں جتن اس دل بہتر کرد
منکینے ہے چو کے سار جو سب کون عزیز اچھے
امرت کنکوں ہور زبان کون شکر کرد
بے دین ہو یزید کیا دین میں خلل
لعنت مدام اس کے اوپر سر لبر کرد
گر شہ علی ہے بات میں ثابت قدم نہیں
آیات ہور حدیث ہور سب میں اثر کرد
جو کوئی تمنکون جیودی پیدا کیا اول
ذکر چلو نپت نہ آپس کون نذر کرد

دولت اوپر ابد کی نظر ہے تو دل کون آج

گنجینۂ محبّت اثنا عشر کرو

سینے اوپر تے کار ستو لغض کا کلنگ

دل دل کون صاف دل کون پنم کا چندر کرو

اوڑنے فلک کے بام پو اشتیاق تو

پیدا ہی کے سار سعادت کے پر کرو

آل عبا کے غم سون جنم آج صرف کر

محشر کے دیس ذوق خوشیاں من اثر کرو

غوّاص کے زمانے اچھے ہے لطیف تو

اے عارفان ہو یاد نہیں یو اچھر کرو

(بیاض صفی)

(٦) ہاشمی۔ بیجاپور۔ علی عادل شاہ ثانی کا ہمعصر ہے۔ سید شاہ ہاشم کا مرید تھا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ مادر زاد اندھا تھا مثنوی۔ دیوان اس کی یادگار ہیں مثنوی یوسف زلیخا ١٠٩٩ھ میں مرتب کی ١١٠٩ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ ریختی کا بھی یہی موجد ہے اس کے پہلے اس قسم کی غزلیں

کسی نے موزوں نہیں کی۔ مگر یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے۔ اس قسم کی نظم کا خاص نام اس وقت تھا یا نہیں؟ میرا خیال ہے۔ چونکہ اس قسم کی یہ ابتدائی کوشش تھی۔ اس لیئے اس کا کوئی خاص نام نہیں تھا۔ زمانہ مابعد میں اس کو ریختی سے موسوم کیا گیا ہے۔

مصنف بساتین السلاطین نے تعریف کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

"دیگر از جملہ ہندی گویان ان زمانہ میاں ہاشمی است۔ کہ بفیض لعاب دہن مبارک حضرت پیر دستگیر شاہ ہاشم قدس سرہ زبان شیریں بیان کشادہ در میان سخنوران گوی سبقت بردہ۔ ترجمہ یوسف زلیخا را بمحاورۂ آن وقت نظم آوردہ و دیوان غزل مشتمل بر مضامین سنجیدہ و تلازمات شعریہ ہم داد کہ مقبول طباع افتادہ در اشعار طرازی نادر روش غریب در زبدہ است کہ ہیچ کس برآوردن سیاقت نزادہ۔ با وجودے کہ بصیر مادر زاد بود"

(صفحہ ۹۲ ب انڈیا آفس)

غرض کہ ہاشمی کی قابلیت مسلمہ تھی۔ دیگر شعرا کی طرح وہ حسب رواج مرثیہ

بھی کہا کرتا۔ مگر افسوس اب سب ناپید ہیں۔ ہم کو اس کا ایک مرثیہ اڈ نبرہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا۔ افسوس ہم نے پورا نقل نہیں کیا جو کچھ نوٹ کیا گیا یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

دل بستہ مصطفےٰ کا تابوت لے چلے ہیں،
فرزند مرتضےٰ کا تابوت لے چلے ہیں
سلطان دو جہاں کا سردار اولیا کا
مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں
حضرت حسین حسن کا شاہ زمین زمن کا
حضرت نبیؐ سنگا تابوت لے چلے ہیں
حضرت کے تھے نواسے حیدر کے تھے خلاصے
ہوئے شہید پیاسے تابوت لے چلے ہیں
اے ہاشمی شہاں کا سلطان دو جہاں کا
مقبول ادس جوان کا تابوت لے چلے ہیں

(از بیاض اڈنبرہ یونیورسٹی)

یہ مرثیہ زبان کی صفائی کے لحاظ سے ممکن ہے ہاشمی بیجاپوری کا تھا

نہ کیا جائے۔ مگر ہاشمی کے دوسرے کلام کی صفائی کو دیکھا جائے ۔ تو پھر اس مرثیہ کو ہاشمی بیجاپوری کا تصور کرنے سے کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا۔

گولکنڈے اور بیجاپور کے یہ چند شعرا ہیں ۔ جن کے دوسرے کلام کے ساتھ مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں ۔ یعنی ان شاعروں کا دوسرا کلام مثنوی قصائد غزل وغیرہ بھی موجود ہے ۔ یہ شعرا مرثیہ گوئی کا پیشہ نہیں رکھتے تھے

اب عہد عادل شاہی اور قطب شاہی کے چند ایسے شعرا پیش کئے جاتے ہیں ۔ جن کا گویا پیشہ ہی مرثیہ گوئی تھا۔ نہیں معلوم ایسے بھی کتنے شعرا تھے جنھوں نے مرثیہ گوئی کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا ۔ یہاں ہم صرف چار نام پیش کرتے ہیں یعنی کاظم (گولکنڈہ)، شاہی (گولکنڈہ) مرزا (گولکنڈہ)۔ مرزا (بیجاپور)

۱۔ کاظم ۔ ان کا نام کاظم علی اور کاظم تخلص تھا ۔ گولکنڈہ (حیدرآباد) کے باشندے تھے ۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں موجود تھے ۔ کثرت سے مرثیے کہے ہیں ۔ جو عام طور پر شہرت رکھتے ہیں ۔ آڈنبرہ یونیورسٹی کے بیاض میں ان کے دس مرثیے موجود ہیں ۔

ان مرثیوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ۔ کاظم کا اسلوب بیان نہایت شگفتہ ہے ۔ ان میں نہ صرف مرثیہ پن موجود ہے ۔ بلکہ ادبیت کی شان بھی

پائی جاتی ہے ۔اس لحاظ سے کاظم اپنے زمانہ کا ایک اعلیٰ اور بلند پایہ مرثیہ گو قرار دیا جاسکتا ہے ۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ کاظم کے دس مرثیے اڈنبرہ کی بیاض میں موجود ہیں۔ان کے اشعار کی تعداد (۲۰۴) ہے افسوس ہے کہ کوئی مرثیہ مکمل ہم نے نوٹ نہیں کیا بطور نمونہ ان کا کلام پیش کیا جاتا ہے :-

تم اپنے دلبراں کی خبر لو علی ولی
بے تاج سروراں کی خبر لو علی ولی

نیزوں اوپر سراں کی خبر لو علیؑ ولی
ظلم و ستم کی گراں کی خبر لو علی ولی

آرام دل سکینہ بے تاب کون نہیں
انکھیاں میں اس کے رات خواب کون نہیں

کہیں اتنہا یو درد کے اسباب کون نہیں
غم ہائے بے کراں کی خبر لو علی ولی

ایک دوسرے مرثیہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

آج پڑے رن میں بے جان حسینا   ظلم و ستم سوں بن منے حیران حسینا

جدکا دل ہیں لے چلے ارمان جینا　　　پائے نہیں اس درد کا درماں جینا

ایک اور مرثیہ کے چند شعر۔

پیئے نہیں ابن حیدر آج پانی　　　پورکاریں دین کے رہبر آج پانی

کہاں روتے زمین پر آج پانی　　　مگر در حوض کوثر آج پانی

دہن سو کا کہاہے کاظم غم سوں میرا　　　نہیں یہاں آسرا میرا تیرا

قلم کرتا نہیں کاغذ پہ پھیرا　　　سہا ہی کون نہ رہبر آج پانی

مندرجہ بالا انتخابات سے کاظم کے مرثیہ کا اندازہ واضح ہو سکتا ہے

(۲) شاہی۔ شاہ قلی خاں گولکنڈہ کا مرثیہ گو تانا شاہ کے ندیموں سے تھا پہلے تو فوج سے تعلق تھا۔ مگر علمی قابلیت کے باعث بہت جلد شاہی کو شاہی تقرب حاصل ہو گیا۔ مذہب کے لحاظ سے اس کو بڑا سخت تعصب تھا۔ اپنے مرثیوں میں صحابہ کی شان میں بڑی گستاخی کی ہے۔

مرثیہ گوئی میں اس کو خاصی مہارت تھی اور اس کے مرثیے عام طور پر مشہور اور مقبول تھے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب کے سپاہیوں نے ان کو زبانی یاد کر لیا تھا۔ ان کے ذریعہ وہ شمالی ہند میں بھی پھیل گئے جہاں اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں بھی پڑھے جاتے تھے۔

اس کے دو مرثیے اڈ بزہ والی بیاض میں اور ایک مختصر مرثیہ مولوی صفی الدین مرحوم والی بیاض میں موجود ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کے مرثیے نہایت بلند پایہ ہیں۔ واقعہ نگاری کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ ادبی حیثیت کے سوا زبان کے لحاظ سے بھی وہ اعلے درجہ کا شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

ہائے غریب یتیم زمانے عابد تیری زاری ہے،
باپ کا مرنا دکھ کا بھرنا تس پر یوں بیماری ہے
تیغ کھڑی لے دشمن سر پر واویلا دکھ بیماری ہے
درد مصیبت عابد تم پر آج کے دن بسیاری ہے
جبرئیل کہیں بتلاؤ مجھ کو نام ہے کیا اس وادی کا
سنا جب کربل یہی ہے تنقل حسین علی سے ہادی کا
کہا بہشت سے پیام لیا یا عابد تیری وادی کا
کٹھن گھڑی ہو پوتے میرے تجھ پر کیا سنگ ساری ہے

(۱۳) مرزا قطب شاہی۔ مرزا ابوالقاسم نام۔ مرزا تخلص تانا شاہ کا مصاحب تھا اس کے گرفتار ہونے پر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ مرثیہ گوئی میں ید طولی رکھتا تھا

قدیم تذکرہ نویسوں نے مرزا کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعض شعر نقل کئے ہیں۔ مگر کسی نے اس کے مرثیہ گو ہونے کی صراحت نہیں کی۔ ہماری تحقیقات کے لحاظ سے یہ مرثیہ گو تھا۔ کثرت کے ساتھ مرثیے کہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، کہ اس نے بڑی عمر پائی۔ کیونکہ سنہ ۱۱۵۰ھ تک زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔

مرزا نے مختلف عنوان کے تحت مرثیے کہے ہیں اور اکثر طویل ہیں مثلاً قصہ امام حسین کے عنوان سے ایک مرثیہ ہے۔ جس کے (۱۷۸) شعر ہیں۔ قصہ امام قاسم کے مرثیہ کے (۲۱۶) شعر۔ قصہ حر شہید کے (۱۶۷) شعر مرثیہ حضرت امام کے (۲۷) شعر ہیں۔

ان مرثیوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کیا بلحاظ واقعہ نگاری اور کیا بلحاظ اسلوب بیان اور طرز ادا اور کیا بلحاظ لطف زبان مرزا اپنے وقت کا کامل الفن مرثیہ گو تھا۔ اگرچہ زبان کی صفائی کے لحاظ سے وہ سلیس نہیں ہیں لیکن کلام میں بلا کا اثر ہے۔

ذیل میں مرزا کے مرثیوں سے کچھ انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے ہمارے دعوے کی تائید ہوسکتی ہے:۔

قصہ حسین والے مرثیہ میں اصغر کی شہادت کا حال

کہوں دکھ درد اصغر کا او نور چشم سرور کا
شہ غازی کے جوہر کا کرو زاری مسلمانان
عزیزان دل ہوا پر خون پوسن اصغر کے ماتم کون
کئے معصوم شہادت سون کرو زاری مسلمانان

حسین اصغر کون منگائے ان کے تیرے تو لسبلاتے
بزان لشکر کنے لائے کرو زاری مسلمانان
جبتاں پر ہانک تب مارے کے لے سنگہ دلاں سارے
برائی میں نہ تم ہارے کرو زاری مسلمانان

مرزا کا مزید کلام ملاحظہ ہو :۔

ہوئی جب تشنگی غالب امام انس و جاں ادپر
خبر یوں سن کے پانی نے آپس میں بیچہ کھایا ہے
شہیداں کا لہو ؟ پر یا جب کربلا ئے بنا تے
فلک تعظیم سوں اسکون شفق کرنے اپایا ہے

ہوا تن سے جدا جب سر شہنشاہ دو عالم
گگن سرکات سورج کا شفق کے لہو میں بہایا ہے

"رات" کی صراحت۔

محنت قبل کی رات ہے اہل حرم پر گھات ہے
دل چور اس غم سات ہے تیرے فراقوں یا حسین
یوں رات جگ غمناک ہے عالم پو سب دتیاک ہے
پرخون جگر دل چاک ہے تیرے فراقوں یا حسین

جنگ کا دن تاریخ فوج کی تعداد کا ذکر

شہ پر یوں جب دن گھریا ماتم رہیا جگ میں پو سوز
تب محرم کی دہم تاریخ تھا ہور جمعہ روز
شہ کنے چالیس پر ادے تیس ہور دو تھے سوار
ظالماں کے دل سے تب تھے سواراں بیس ہزار

انتخاب بالا سے مرزا کے کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اڈنبرہ والی بیاض اور مولوی صفی الدین مرحوم والی بیاض میں اس کے متعدد مرثیے ہیں۔ جن کی صراحت طوالت کی موجب ہو گی۔

(۴) مرزا (بیجاپوری) علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا نامور مرثیہ گو تھا جس نے سوائے مرثیے کے کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ مرثیہ کا اس قدر شوق تھا کہ انتقال کے وقت بھی ایک مرثیہ کا عنوان ہی لکھ رہا تھا۔ بادشاہ کا تقرب حاصل تھا۔ مگر کبھی کوئی قصیدہ لکھا اور نہ مدح گوئی کی۔ بادشاہ نے خود اس سے خواہش کی۔ مگر اس نے مدح کے بجائے ایک مرثیہ میں بجائے اپنے تخلص کے بادشاہ کا نام لکھ دیا۔

مرزا اپنی مرثیہ گوئی کو ایک مذہبی فرض تصور کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس کو خواب میں بھی اس کی تلقین ہوتی تھی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے مرزا اپنا مرثیہ سنا رہا تھا۔ ذیل کے شعر کے

ولاں پاکھاں اناراں کر کہو سینہ طبق میا نے

مصرعہ ثانی کے لئے مضمون نہ مل رہا تھا۔ اس پر مدہوشی طاری ہوئی۔ دیکھا کہ آنحضرت صلعم تشریف فرما ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ

بنی ملکے محشر کون یوں تحفہ کر لے جاتا ہے

. . . .

(ص ۹۲ بساطین السلاطین برٹش میوزیم)

اس کی شہادت یوم عاشورہ ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مرثیہ لکھ رہا تھا۔ کسی ظالم نے خنجر سے ہلاک کر دیا۔ شاہ مرتضیٰ قادری کی درگاہ میں دفن کیا گیا۔ افسوس ہے سنہ وفات معلوم نہیں ہو سکتا۔ مگر بہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ سنہ ۱۰۸۳ھ کے قبل اس نے شہادت پائی۔

مصنف بساطین السلاطین نے مرزا کا ذکر تعریف کے ساتھ کیا ہے چنانچہ لکھتا ہے:-

"یکے از شعرائے مقبولین آں زماں مرزا مرثیہ خوانست کہ زبانِ خود وقف حمد و نعت حضرت سید المرسلین و منقبت آئمہ طاہرین نمود۔ ہرگز بداحدے از شاہ و گدا شعر نہ گفت۔ مرثیہ ہائے بے شمار کہ در ماتم شہدائے کربلا گفت زبان زد خاص مردم دکن و دیگر بلاد گردید۔" (صفحہ ۹۲)

چونکہ ہم کو مرزا کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ اس لئے اس کے کلام کے متعلق کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ مگر یہ ظاہر ہے جس شخص کی تمام عمر ہی مرثیہ گوئی میں بسر ہوئی ہو۔ تو اس کا کلام کس پایہ کا ہو گا

ذیل میں ایک مرثیہ کے چند شعر لکھے جاتے ہیں۔ جو بعض اندرونی شہادتوں کے لحاظ سے بیجاپور کے مرزا کا مرثیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

شریعت اساسی پہ ایتا ستم　　حقیقت شناسی پہ ایتا ستم
نبیؐ کے نواسے پہ ایتا ستم　　سب اُمت کے آسے پہ ایتا ستم
دیا زہر پانی میں با ظالماں　　سولاگا کلیجے کوں جا کر نداں
جگر ٹوٹہ حسنؓ کا پڑا بے گناہ　　مدینہ کے باسی پہ ایتا ستم
حسینؓ ابن حیدر خدا کا ولی　　جگر گوشۂ فاطمہؓ اور علیؓ
برورج وہ دوہ کا بدر جلی،　　تشنہ کر گہراسی پہ ایتا ستم

مبارک بدن سوں ہوا سر جُدا
اسی غم سوں کہتا ہے مرزا سدا
کیا کیا وہ بدبخت نے اے خدا
شہنشہ پیاسے پہ ایتا ستم

قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے یہ چند مرثیہ گو ہیں۔ امید ہے۔ کہ اس صراحت سے ان کے کلام کا ایک خاکہ ذہن نشین ہو جائے گا۔

دورِ مغلیہ

ہم قطب شاہی اور عادل شاہی مرثیہ گویوں کا تعارف کرا چکے ہیں۔ اب دورِ مغلیہ کے چند مرثیہ گو پیش کئے جاتے ہیں۔

دکن کی اسلامی سلطنت دہمنہ محمد تغلق کے عہد میں قائم ہوئی اور دہلی کا تعلق منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد تقریباً تین سو سال تک شمالی ہند سے جنوبی ہند کا تعلق نہیں رہا۔ مگر اکبر اعظم وہ پہلا شخص ہے جس نے ۹۹۵ھ میں پھر سے دکن کی فتح کا ارادہ کر کے حملہ کیا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے بعد عالمگیر نے دکن کی فتح کا ارادہ مستحکم کر لیا۔ ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور اور ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ فتح ہو کر سلطنت دہلی میں شامل ہو گئے۔ اس طرح اب پورا جنوبی ہند مغلیہ سلطنت کا جزو ہوگیا۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں سے شعرائے اردو کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ اُن کے ساتھ بے حد مراعات کی جاتیں۔ انہیں ان کی تصنیفات کا معقول صلہ دیا جاتا تھا۔ نہ صرف سلاطین بلکہ امراء دکن بھی اردو کی سرپرستی کرتے تھے، اِن قدردانیوں کے باعث عام طور پر شعر و شاعری کا رواج ہوگیا تھا

قابل افراد بلا کسی صلہ کی اُمید یا قدردانی کے اب اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اس طرح اب سلطنتوں کی شکست سے اردو کی ترقی پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ البتہ شعرائے دکن کا مرکز بیجاپور اور گولکنڈہ کی بجائے اورنگ آباد ہوگیا۔

اورنگ آباد کا نام ابتدا میں کھرکی تھا جس کو نظام شاہی سپہ سالار ملک عنبر نے ۱۶۱۰ء میں اپنا صدر مقام قرار دیا تھا۔ اس وقت سے اس کی رونق اور چہل پہل بڑھتی گئی حتیٰ کہ شاہ جہاں کے صوبیدار اور قابل جانشین اورنگ زیب نے اُس کو اورنگ آباد سے موسوم کرکے ۱۶۵۳ء میں اپنا صدر مقام قرار دیا۔ دہلی کے تخت پر جلوہ گر ہونے کے بعد بھی گولکنڈہ اور بیجاپور کے فتح کے خیال سے زیادہ عرصہ تک یہاں ہی قیام رہا اور پھر ان کی فتح کے بعد تو اورنگ آباد ہی سلطنت مغلیہ کا دارالحکومت قرار پاگیا۔

سلطنت ہند کے مستقر ہونے کے باعث شمالی ہند علی الخصوص دہلی کے امرا۔ روسا۔ علما۔ شعرا کثرت سے اورنگ آباد میں آباد ہوگئے اور پھر گولکنڈہ اور بیجاپور کے باکمالوں کا مرکز بھی یہی ہوگیا۔ اس طرح اورنگ آباد نہ صرف سلطنت دہلی کے حکومت کا مرکز بنا۔ بلکہ نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی تمدن اور تہذیب کا بھی سنگم بن گیا اور خاکِ اورنگ آباد باکمال

شعرا اور ادیبوں کے جمگھٹوں سے رشک گلزار ہوگئی۔ اس زمانے کے اردو شعرا کی فہرست طویل ہے۔ جنہوں نے ملک سخن سے داد لی اور اپنے کارنامے یادگارِ زمانہ چھوڑے۔

قاضی محمود بحری نے مثنوی من لگن لکھی۔ محمد امین نے مثنوی یوسف زلیخا مرتب کی۔ ذوقی نے وصال العاشقین وغیرہ لکھی ضعفی نے مثنوی عشق صادق۔ اشرف نے جنگ نامۂ حیدر۔ عشرتی نے مدحِ جیلانی وغیرہ مرتب کئے اس طرح بیسیوں شعرا آسمانِ شہرت پر درخشاں ہوئے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۰۹۸ھ میں اورنگ زیب نے پورے دکن پر قبضہ کر لیا۔ اس کے اڑتیس ۳۸ سال بعد یعنی سنہ ۱۱۳۶ھ میں آصف جاہ اوّل نے اپنی حکومت قائم کی۔ اس قلیل مدت میں بھی صدہا باکمال لوگوں کا ظہور ہوا جو اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ جن میں سے چند شعرا کے نام اوپر بیان کئے گئے ہیں۔

اسی قلیل عرصہ میں مرثیہ گو بھی بیسیوں ہوئے۔ جن کے مرثیے اب بھی موجود ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں:۔

ذوقی۔ احمد۔ اشرف۔ امامی۔ رضی۔ ولی وغیرہم

ذیل میں ان کے کلام کو مختصر وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

ذوقی۔ شاہ حسین نام اور ذوقی تخلص تھا، مرشد نے بحر العرفان لقب دیا تھا۔ شاہ خان محمد کے مرید تھے۔ غالباً بیجاپور وطن تھا۔ صوفی تھے شاعری پیشہ نہیں تھا۔ درویش منش متوکل تھے۔

عالمگیر کے عہد میں موجود تھے۔ انتقال کا سنہ معلوم نہیں۔ غالباً ۱۱۳۰ھ کے قریب انتقال فرمایا۔

ان کی کئی تصنیفیں مشہور ہیں جن میں سے ایک مثنوی وصال العاشقین ہے جس کو انہوں نے ۱۱۰۸ھ میں مرتب کیا ہے۔ اس میں وجہی کی سب رس کو نظم کیا ہے۔ دوسری مثنوی ماہ نامہ ہے جس میں شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی مدح کی گئی ہے۔ اس کی تصنیف بھی ۱۱۰۹ھ میں ہوئی ہے، انڈیا آفس میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ ان مثنویوں کے علاوہ انہوں نے غزلیں اور مرثیے بھی کہے ہیں۔ غزلیں مولوی عبد الحق معتمد انجمن ترقی اردو کے پاس اور مرثیے اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہیں۔

ذوقی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہنہ مشق شاعر تھا۔ اس کے مرثیے اکثر غزل نما ہیں۔ زبان تو صاف ہے مگر اثر کم ہے۔ ذیل میں نمونہ پیش کیا جاتا ہے

اے شمع بزم مرتضیٰ گھر آج آتے کیوں نہیں

تاریک ہے تم بن جہاں جلوا دکھاتے کیوں نہیں

وہ جاہل دوزخ وطن آئے ہیں بادل کے تمن

جو برق تیغ صف شکن شہ جگمگاتے کیوں نہیں

وہ شمع بزم مصطفیٰ بادِ اجل سوں گل ہوا

سب سوز دل سوں تن ہو اسد ایاں گلاتے کیوں نہیں

چھوڑو سکل دنیا کے کام دن رین تا یک اے خاص عام

ماتم کے آتش میں مدام تن کوں جلاتے کیوں نہیں

سنتے ہو تم اے مومناں شہ کی شہادت کا بیاں

سب خاک و خوں کے درمیاں تن کو ملاتے کیوں نہیں

سلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

شمس الضحیٰ پر سلام بولو   بدر الدجا پر سلام بولو

شیر خدا پر سلام بولو   آل عبا پر سلام بولو

ذوقی کہتا ہے صبح و مسا میں   اس رہنما پر سلام بولو

(از بیاض اڈنبرہ یونیورسٹی)

(۲) احمد۔ اس تخلص کے بھی دکن میں متعدد شعرا ہوئے ہیں۔ جو اپنے قوت
بیان کے باعث شہرت رکھتے تھے قطب شاہی دور میں ایک احمد تھا۔ جو
وجہی کا معاصر ہے مگر غالباً اس نے مرثیے نہیں کہے مغلیہ دور کا یہ دوسرا
احمدؐ دکنی ہے جس کے مرثیے مشہور ہیں۔

شمالی ہند کے تذکرہ نویسوں نے احمد کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں
کی۔ میر حسن اور قائم احمد کو گجراتی بیان کرتے ہیں۔ عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعرا میں
اس کو غلام احمد علی کے نام کے ساتھ برہان پوری لکھتے ہیں۔ اسپرنگر نے بھی
اسی احمد کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے ان دونوں احمدوں کا وجود بھی ہو۔ مگر
ہم جس احمد کے مرثیے پیش کرتے ہیں۔ وہ ان دونوں سے جدا ہے۔ اس کا
نام حکیم احمد تھا اور یہی تخلص کرتا تھا برہان پور کا باشندہ ہے غالباً یہیں ہی فوت ہوا ہے

اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے سات مرثیے ہیں جن کے (۱۶۰) اشعار ہیں
مولوی صفی الدین والی بیاض میں اس کے تین مرثیے
ہیں جن کے (۵۰) شعر ہیں۔ اڈنبرہ کے سات مرثیوں کے جملہ دو مرثیے
تو امام حسینؑ کی مدح میں قصیدے ہیں۔ دو مرثیوں میں آپ کے خاندان
کی تباہی اور بے سروسامانی حیرانی و پریشانی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ایک

مرثیہ دونوں بیاضوں میں مشترک ہے۔ اس طرح ہم کو متیم احمد کے تو مرثیے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن کے (۲۰۵) شعر ہیں۔ نمونہ کلام:۔

مرثیہ حضرت امام حسینؑ

حیف گھایل حسین تن تیرا جسم پر خون ہے پیرہن تیرا
تو کہاں ہور کیدھر تن تیرا کیوں بسیرا ہوا ہے رن تیرا

نہیں ملیا بوند کس کیتن پانی
سخت طفلاں کی سر پو حیرانی
حیف اصغر نے تجھ کوں رومانی
جگسوں پیاسا گیا تن تیرا

تیر لگ کر سوں لہو جو اچھی تھی وا مصیبت میں بال پن تیرا
اے توں دلبر حسینؑ کے اصغرؑ آج روتا نہیں توں (؟) ہٹ کر

تیر لگ حلق سب لہو سوں بھر
کیوں چھوڑ پی لے رہا دھن تیرا

۳۔ **اشرف**۔ سید اشرف اسی زمانے کا باکمال شاعر تھا۔ اس کی مثنوی اور مرثیے قابلیت کی یادگار ہیں

قائم اور شفیق نے اپنے تذکروں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ولی کا ہمعصر بتاتے ہیں۔ اس کے برعکس خواجہ خان مصنف "گلشن گفتار" نے اس کو ولی کا شاگرد لکھا ہے۔ مگر ان سے اس کے حالات پر کچھ روشنی نہیں پڑتی اس کی مثنوی بھی اس کے حالات واضح نہیں کرتی۔

مثنوی کی تصنیف سنہ ۱۱۲۵ھ میں ہوئی۔ اس کا نام جنگ نامہ ہے۔ برٹش میوزیم میں ایک نسخہ محفوظ ہے۔

اڈنبرہ میں اس کے تیرہ مرثیے ہیں جن کے (۱۴۰) شعر ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے:۔

بالو کیں اصغر نہیں اب میں جھولاؤں کس کے تئیں
سونا ہوا ہے پالنا اب میں سولاؤں کس کے تئیں

نہلا کے میں کپڑے پہنا اس کون بتاتی گل نمن
وہ پھول سا مکھا نیمن اب میں بتاؤں کس کے تئیں

سوتا تھا وہ جب نیند بھر چپنے اٹھاتی دور کون
بیدرم ہے دیکھو آج وہ اب میں جگاؤں کس کے تئیں

جب مسکراتا وہ بچا تیں شاد ہوتی دل منے
بے جان پڑا ہے گود میں اب بہلاؤں کس کے تئیں

جب شہ کو غمگیں دیکھتی لے جا کے دیتی گود میں
سوتا کفن وہ اوڑھ کر کفن اب لے جاؤں کس کے تئیں
جاتے تھے شہ جب ان منے اصغر کو میں چھاتی لگا
دکھ میں بھولاتی اس کہاں اب میں کھلاؤں کس کے تئیں

اشرف کے ایک دوسرے مرثیہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

کہاں ہے وہ ولی والی حیدر حسن میرا
کہاں ہے وہ حسین ابن علی صفدر شکن میرا
اگن سوں ماتم شہ کے جلا ہے بدن میرا
برنگ برق خرمن سوز دل ہے ہر سخن میرا
لگا ہے بسکہ تیر ماتم شہ دل منے کاری
شہید کربلائے غم ہوا ہے جگ میں من میرا
ہوس گلگشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل
محبت کی گلی ہیں شاہ دین کے ہے وطن میرا
جو کوئی ہے صدق دل سوں وہ سزا دار آل پیغمبر
اے اشرف اس کے پگ کی خاک ہے کحل نین میرا

ان اشعار سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ اشرف کا کلام کس قدر صاف ہے۔ اس کے مرثیوں میں ادبی شان بھی پائی جاتی ہے :-

(۴) امامی۔ یہ بھی اسی زمانے کا مرثیہ گو ہے، اس کے متعلق تذکرہ فتوت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ برھان پور اس کا وطن تھا اور مہر کنی اس کا پیشہ' مرثیوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ شیعہ مذہب کا پیرو تھا۔ اور اس کا اعتقاد تھا۔ کہ وہ حضرت امام حسین اور آپ کے خاندان کا مداح اور پیرو ہے، اس طفیل اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے اٹھ مرثیے ہیں' ان کے دیکھے سے واضح ہوتا ہے۔ کہ امامی کا اسلوب بیان دلکش ہے' اس کے مرثئے ڈرامائی اثر رکھتے ہیں اور پھر ان کی زبان بھی بہت صاف ہے جس سے دھوکا ہوتا ہے۔ کہ وہ بہت بعد کے لکھے ہوئے ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو :-

کیا ظالماں نے ظلم کیا بے حساب آج   مظلوم کربلا میں ہیں عالی جناب آج
اس غم سوں مومناں کوں ہوا پیچ و تاب آج   گویا علی کے گھر کا کھولا غم کا باب آج

تھا آئینہ رسول کو درشن حسین کا
ہے وہ جفا کی گردش درپن حسین کا

زخماں کے جو ہراں ہیں سے تن حسین کا
دستا ہے جوں شفق میں نول آفتاب آج

کیوں عرش فرش پر نہ گرا بے قرار ہو
کیوں تاب لا سکے نہ فلک دیکھ ظلم یو
دنیا سے فدکوں شہ کے شکستہ کیا دیکھیو
سنگیں دلاں نے ظلم کی پی کر شراب آج

یارب بحق خواجۂ کونین مصطفےٰ
یارب بہ حق فاطمہؓ ناموس مرتضےٰؓ
یارب بہ حق جملہ اماماں مجتبےٰ
برلا ہریک مراد امامی شتاب آج

ایک دوسرے مرثیے کے چند شعر :-
محشر میں جب محمد شاہ زمن اُٹھیں گے
سب انبیائے مرسل پرغم حزن اُٹھیں گے

حیدر علی لہو سوں آلودہ تن اٹھیں گے
لیتے لہو کے ہلکاں ہے ہے حسن اٹھیں گے

آلودہ خاک و خون میں دندانِ مصطفیٰ لے،
لہو سوں تر بتر سب دستار مرتضیٰ لے
ٹکڑے حسن کے دل کے جاما حسین کا لے
تربت سیں فاطمہ جب یو بن اٹھیں گے

دریائے غم میں ہرگز کرنا نہیں غواصی
ہرچند توں اتا ہی عالم سنی ہے عاصی
امید تو قوی ہے پائے گا توں خلاصی
کرنے کیتیں شفاعت جب پنجتن اٹھیں گے

۵۔ رضی۔ حافظ رضی الدین، اسی دور کا زبردست مرثیہ گو تھا۔ خواجہ خان حمید صاحب گلشن گفتار نے اس کو ولی کا شاگرد بتاتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں

معلوم ہوتا۔ البتہ دونوں ہمعصر ضرور ہیں ۔

رضی کے مرثیے دکن میں بڑی شہرت رکھتے تھے، اس کے مرثیوں کی تضمین کی جاتی تھیں۔ اڈنبرہ میں اس کے نو مرثیے ہیں۔ جن کے (۸۷) شعر ہیں۔ اس کے مرثیوں کا خاص جوہر سوز و گداز اور مرثیہ پن ہے نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

نالہ و فریاد و واویلا ہے اے پروردگار
غم سیں آل نبی کا دل ہوا ہے بے قرار
ظلم دشت کربلا میں دیکھ بے حد و شمار
امتی محشر تلک روتے ہیں دوکھ سوں زار زار

داغ غم سوں شاہ کے ہر ہر طرف کھلا ہے باغ
لالہ خونیں کفن ہے دل میں تب سوں داغ داغ
پھول بن میں جب ستے پایا ہے اس غم کا سراغ
جامہ اپنے برمنے پہنا ہے سوسن سوگوار

ماتم شہ سوں پڑی خرمن پہ دل کے بے جلی
تب سے حاصل ہوئی افسوس ہم کوں بے کلی
نین جوں بادل کہی ہور راہ جیسے بانسلی
غم کے جنگل میں بجاتا ہوں سدا بے اختیار

اور ایک مرثیہ :۔

آل نبی کے غم سوں بے خود ہوں یوں پکارا
دل مے رود زدستم صاحب دلاں خدا را
دل میں چھپا رکھا تھا حضرت حسین کا غم
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا
بچھڑے حسین سوں جو بے اختیار بولے
باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را
پیاسے فرات کے سب کوثر پہ یوں سنے گے
ہات الصبوح ھبوا یا ایہا السکارا
فریاد واہ ویلا کلثوم کے زبان کا
در رقص حالت آرد پیران پارسا را

کرتے تھے شاہ سب سوں صحرائے کربلا میں
یا دوستاں مروت با دشمناں مدارا

لعنت ہے ظالماں پر جن کے طرف سوں ہر دم
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

آل نبی سوں رکھنا ہر دم منے محبت
اشہی لنا و احلی من قبلہ العذارا

حافظ رضی قرآں میں لعنت ہے ظالماں پر
اے شیخ پاک دامن معذور دار ما را

غم سوں ہے بے قرار میرا دل
دکھ سوں ہے زار زار میرا دل

گلشن غم میں ہے شہیداں کے
لالہ داغدار میرا دل

نت شہیداں کے زخم غم سین
شق ہے جوں ذوالفقار میرا دل

غم کی بجلی پڑی ہے جب سنے
تب سوں ہے شعلہ زار میرا دل

نیم بسمل نمن تڑپتا ہے
ہو کے غم کا شکار میرا دل

گرد غم سوں امام کے اے رضی
کیوں نہ ہو پُر غبار میرا دل

(۶) ولی ۔ دکن کا مشہور شاعر ہے، ان کا نام ولی محمد اور وطن دکن تھا۔ انجمن ترقی اردو کے شائع شدہ کلیات کے سوا جو کلام یورپ وغیرہ میں دستیاب ہوا تھا، وہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔

ولی کے دیوانوں میں کوئی مرثیہ یا سلام شامل نہیں ہے اس سے قیاس ہوتا ہے۔ غالباً ولی نے اس صنف میں طبع آزمائی نہیں کی مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس وقت کے رواج کے موافق ولی نے مرثیے بھی کہے ہیں۔ اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے تین مرثیے ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ ہم نے ان کو مکمل نقل نہیں کیا۔ چند شعر نوٹ کئے گئے تھے جو پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ مرثیے غزل نما ہیں :۔

غوغا ہوا جہاں میں شہ کے وصال کا ۔۔۔ سینے منے پڑا ہے چھالا اس ملال کا

محتاج ہیں جہاں کے محبان تمام ل ۔۔۔ دیدار چاہتے ہیں مبارک جمال کا

جو کوئی کرے زمانہ سوں ادنو کا دُرم

ہے یہ ولی خلاصہ جواب و سوال کا

اے ہادی نیسار تو کیوں جا بسایا کربلا ۔۔۔ اے واقف اسرار تو کیوں جا بسایا کربلا

اے نور چشم مصطفےٰ فرزند نوشاہ مرتضیٰ ۔۔۔ اے دلبر خیر النسا تو کیوں جا بسایا کربلا

تو دوستاں کا جان ہے تیرا ذکر ایمان ہے
تجھ پر ولی قربان ہے کیوں جا لبسایا کربلا

اوس نورِ مصطفیٰ پر بولو سلام یاراں   محبوبِ مرتضیٰ پر بولو سلام یاراں
اوس پاک پارسا پر حیدر کے دلربا پر   اوس لعلِ بے بہا پر بولو سلام یاراں
یو جی ولی فدا کر اوس شاہِ کربلا پر
اوس لائق ثنا پر بولو سلام یاراں

یہ ہیں چند مرثیہ گو جو دورِ مغلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ نہیں معلوم اور کون کون مرثیہ گو تھے جن کے حالات سے ہم ناواقف ہیں۔

نوٹ

قدیم اردو شعرا ہم مخرج حروف کا املا سب سے زیادہ سادہ حرف سے لکھتے تھے۔ مثلاً "س" "ث" اور "ص" کی بجائے "س" "ز" "ذ" اور "ض" "ظ" کی بجائے "ز" چنانچہ اُن کا املا اسی اصول کے مطابق ہے۔

(ادبی دنیا ماہ ۱۹۳۰ - ۱۹۳۱ء)

مرزا کے مرثیے

آج سے تقریباً تین صدی پیشتر دکن میں دو شاعر مرزا تخلص کے گذرے ہیں۔ ایک کا تعلق بیجاپور سے تھا اور دوسرا گولکنڈہ سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں کا زمانہ قریب قریب ایک ہے اور دونوں مرثیے لکھا کرتے تھے ان کے متعلق جو تفصیلات ہمیں معلوم ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

بیجاپور کے مرزا کے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے زمانہ میں تھا۔ سوائے مرثیہ کے کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ مرثیہ کا اتنا شوق تھا۔ کہ مرتے وقت بھی ایک مرثیہ کا عنوان لکھ رہا تھا۔ بادشاہ کا تقرب حاصل تھا۔ مگر کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ بادشاہ نے خود خواہش کی تو ایک مرثیہ میں بجائے اپنے بادشاہ کا نام لکھ دیا:۔

مرزا مرثیہ گوئی کو اپنا مذہبی فرض تصور کرتا تھا۔ اسی انہماک کا نتیجہ تھا۔ کہ اس کو خواب میں بھی اس کی تلقین ہوتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ مرزا کو ذیل کے مصرع کے لئے دوسرا مصرع نہیں مل رہا تھا:۔

دلاں پھاکاں اناراں کر رکھو سینہ طبق میانے

اس پر مدہوشی طاری ہوئی اور آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا:-

بنی آدینگے محشر کون یو تحفہ کر لے جانا ہے

مرزا کی شہادت بھی یوم عاشورہ ہوئی بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مرثیہ لکھ رہا تھا کسی ظالم نے خنجر سے ہلاک کر دیا۔ شاہ مرتضیٰ قادری کی درگاہ میں دفن کیا گیا۔ افسوس ہے سنہ انتقال معلوم نہیں۔ مگر یہ یقین کیا جا سکتا ہے۔ کہ ۱۰۸۳ھ کے قریب اس کی شہادت ہوئی:-

مؤلف بساتین السلاطین نے اس کی بڑی تعریف کی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

"یکے از شعرائے آں زماں مرزا مرثیہ خوان است کہ زبان خود وقف حمد رب العالمین و نعت حضرت سید المرسلین و منقبت ائمہ طاہرین و مرثیہ سید الشہدا و شہدائے کربلا نمودہ ہرگز گاہے زبان خویش در مدح اہل دنیا از شاہ و گدایان وا نمودہ۔ و مرثیہ ہائے او دراں زمان مقبول خاص و عام و مشہور بلاد دکن بودند"

گولکنڈہ کے مرزا کے متعلق جو معلومات ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہ ابوالحسن تانا شاہ کا درباری شاعر تھا۔ جب عالمگیر نے تانا شاہ کو قید کر لیا۔ تو مرزا عبداللہ گنج حیدرآباد میں فقیرانہ طور پر زندگی بسر کرنے لگا۔ اڈنبرہ کی بیاض میں مرزا کے پندرہ مرثیے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا مصنف ۱۱۵۰ھ تک زندہ تھا۔ بعض اصحاب کا خیال ہے۔ کہ یہ کل مرثیے ایک شخص کے نہیں ہو سکے۔ کیونکہ ۱۰۹۸ھ کا درباری شاعر ۱۱۵۰ھ تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ ظاہر ہے اگر (۱۰۸۳ھ) میں جبکہ تانا شاہ تخت نشین ہوا ہے۔ اس کی عمر تیس سال قرار دی جائے، تو ۱۱۵۰ھ میں (۷۹) سال کی عمر ہو گی۔ جو صحیح تصور نہیں کی جا سکتی یہ ہو سکتا ہے کہ تانا شاہ کے زمانہ میں یہ نوعمر ہو اور اس کے مابعد عرصہ تک زندہ رہا ہو۔

اڈنبرا کی بیاض کے علاوہ ہمارے بزرگ مرحوم مولوی صفی الدین صاحب کے کتب خانہ میں ایک بیاض ہے۔ اس میں مرزا تخلص والے شاعر کے پینتیس مرثیے ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ تیقن کے ساتھ ہم ان کو بھی کسی خاص مرزا سے موسوم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمارے پاس اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے۔ کہ یہ مرثیئے ایا بیجاپور کے مرزا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا گولکنڈہ کے مرزا سے۔

مگران مرثیوں کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی عہد کی پیداوار ہیں اور ان کا کہنے والا اپنی تمام عمر امام کی مرثیہ خوانی میں بسر کر دیا تھا۔ بعض اندرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم کی بیاض کے مرثیے، بیجاپور کے مرزا کے ہو سکتے ہیں۔

اس کے قطع نظر یہ مرثیے گولکنڈہ والے مرزا کے ہوں یا بیجاپور والے مرزا کے مگر اس میں کوئی شک نہیں یہ مرثیے ان ہی دو سے کسی ایک کے ہو سکتے ہیں۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اصل مرثیوں کا نمونہ پیش کر دیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے اپنی تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں صراحت کی ہے کہ اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کہ مرثیوں کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ مگر زمانہ مابعد میں شاعری کی اس صنعت نے جو ترقی ایک فن کی حیثیت سے لکھنؤ میں حاصل کی۔ وہ دکھنی مرثیوں کو حاصل نہیں ہوئی لیکن یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ جو بات مرثیہ پن کی دکھنی مرثیوں کو حاصل رہی وہ لکھنؤ کے مرثیوں میں نہیں پائی جاتی۔ دکھنی مرثیوں کا خاص مقصد مجلس عزا کو رلانا تھا۔ وہ اپنے کلام میں سوز و گداز رنج و غم کے مضامین

اس طرح بیان کرتے تھے۔ کہ اصل شہادتوں کا سماں پیش ہو جاتا تھا۔

بعض اصحاب اعتراض کرتے ہیں۔ کہ دکھنی مرثیوں کا مقابلہ دہلی کے مرثیوں سے کرنا چاہیئے۔ نہ کہ لکھنؤ سے۔ یہ اس لئے صحیح نہیں ہو سکتا۔ کہ دہلی میں اس صنف میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف لکھنؤ میں اس کو خاص طور پر ترقی ہوئی۔ مگر اس کے باوجود جو خصوصیت دکھنی مرثیوں کو حاصل تھی۔ وہ لکھنو کو نہیں تھی۔

اڈنبرہ یونیورسٹی کی بیاض میں جو مرثیے مرزا کے دستیاب ہوئے تھے ان کا تفصیلی ذکر ہماری کتاب یورپ میں دکھنی مخطوطات میں موجود ہے اس لئے ان کے قطع نظر یہاں ان مرثیوں کو پیش کرتے ہیں۔ جو ہمارے بزرگ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ پینتیس مرثیے ہیں۔ جن میں بعض خاصے طویل ہیں بعض عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں۔ غزل نما ہیں بعض نوحے ہیں اور بعض سلام ہیں۔

پہلا مرثیہ قصہ حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے موسوم کیا گیا ہے اس کے (۱۰۵) شعر ہیں۔ ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:۔

قصہ کوں شاہ سرور کا حسین بن سر صفدر کا[1]
دونوں عالم کے رہبر کا کرو زاری مسلماناں

اس مرثیہ میں اصغر کا غم قابل ملاحظہ ہے :-

کہوں دکھ درد اصغر کا او نور چشم سرور کا
شہ غازی کے جوہر کا کرو زاری مسلماناں

عزیزان دل ہوا پرخون یوسن اصغر کے ماتم کون
گئے معصوم شہادت سوں کرو زاری مسلماناں

سخت معصومیت جب نھے چھٹے مہینے کی عمر سب تھی
بلا کی پیاس کی تب تھی کرو زاری مسلماناں

. . . .

انھا یک کافر سنگ دل ہوا دوزخ اسے حاصل
دیا سردار کون دکھ مشکل کرو زاری مسلماناں

---

[1] ہمارا یہ اصول رہا ہے کہ اشعار کو کاتب کو نقل کیا جائے تاکہ ناظرین کو اصل مخطوطہ میں جس طرح مذکور ہے۔ اس کا پورا اندازہ ہو جائے۔ یہاں بھی اسی اصول کے تحت کاتب نقل کیا گیا ہے۔ اس لئے اغلاط ہیں ؛

عجب تھا او سگ بد خو حسین دیا پر دکھو
ان کے آ تیر ماریا او کرو زاری مسلمانان
لگیا تیرا حلق بھتر حسین سردار کے سینے پر
ہوئے معصوم شہید اصغر کرو زاری مسلمانان
دیکھے اصغر کون شہ یوں جب چلیا غم سوں دریا تب
اٹھا ڈیرے میں لائے تب کرو زاری مسلمانان
ہوا تھا دل دکھوں پر خون بلا کلثوم زینب کون
کہے یوں شہر بانوں سوں کرو زاری مسلمانان
کہے اصغر کون لایا ہوں اُسے کوثر پلایا ہوں
سو جنت میں سولایا ہوں کرو زاری مسلمانان

اسی مرثیہ میں حضرت امام کا جنگ کے لئے تیار ہونا :۔

بندی دستار تب سر کا حسین سلطان رہبر کا
زرہ پہنی سو حیدر کا کرو زاری مسلمانان
سپر حمزہ کا لیتے ہیں ان پر زینب لے دیتے ہیں
حمائل بر میں کئے ہیں کرو زاری مسلمانان

لئے صمصام ہت سرورسو شمشیر علی صفدر
ہوئے مستعد شیر و نر کرو زاری مسلمانان

جنگ کے لئے مستعد ہوکر میدان میں تشریف لاتے ہیں اور بڑی دیر تک جنگ ہوتی ہے۔ اس کے بعد:۔

غضب سوں حیدری کئے او دل زیر و زبر کئے
زمین اس لہو سوں تر کئے کرو زاری مسلمانان
تر نگ جس صف میں پاتے ہیں سو اس دل کو اچاتے ہیں
دنیا کا سوں پھرلئے ہیں کرو زاری مسلمانان

. . . .

لگے ظالم تیران مارن چریاں زخمان مبارک تن
عرش کرسی لگے کاپن کرو زاری مسلمانان
نبی کے نور دیدے پر لگیا تیسرا پیشانی پر
چریا لہو مکہ نورانے پر کرو زاری مسلمانان

بجسے یو درد مطلق ہے اسے جنت سو برحق ہے
او سب زینت کے لائق ہے کرو زاری مسلمانان
جکوئی اِس غم سوں نت ردئے گنہ سب سوں دہوتے
سو روبشیک ولی ہوئے کرو زاری مسلمانان
کہیا مرزا یو درد و غم نبی کے آل پر ہردم
وصلوات سب عالم کرو زاری مسلمانان

دوسرا مرثیہ قصہ امام قاسم کے عنوان سے ہے۔ یہ بڑا طویل مرثیہ ہے۔ اس کے (۲۱۶) شعر ہیں۔ ذیل کے شعر سے ابتدا کرتا ہے :-

کہوں قصہ شجاعت کا سو قاسم کی شہادت کا
یزید ان کی عداوت کا کہو یاراں صد احیف

قاسم کی شجاعت :-

یکت قاسم ہزاراں پر اٹھے یون اُن سواران پر
کہ جیوں بجلی ہے باراں پر کہو یاراں صد احیف

جکچ ان کو شجاعت تھا سو رو حق نخے عنایت تھا
یو سب ظاہر کرامت تھا کہو یاراں صد اصد حیف

امام قاسم کی شادی ہر مرثیہ نگاری کا عنوان رہا ہے اور اس پر ہر زمانہ میں خیال آرائی کی گئی ہے۔ مرزا نے اس عنوان پر مکالمہ کی شکل اختیار کی ہے۔ ایک بھولی بھالی دُلہن اور ذمہ داری محسوس کرنے والے دولہا کا مکالمہ قابل ملاحظہ ہے:۔

کہے دیکھو نہایت لگ یو ملنا ہے سو ساعت لگ
جدائی ہے قیامت لگ کہو یاراں صد اصد حیف

کہے بولو سو میرے تیں کہ پھر دیدار اب تو میں
ملوں گا بھی تمن سوں میں کہو یاراں صد اصد حیف

کہی اے شہ جوان کامل کہ اے آرام جانو دل
سبب ہے بج پر اب مشکل کہو یاراں صد اصد حیف

وقت نین بات کہنے کا گھڑی تک ٹھیر رہنے کا
سبب ہے رنج سہنے کا کہو یاراں صد اصد حیف

دکھیو عمو کی غم سوں اب ہوا ہے سب جگر خون اب
رہے کیوں تاب منجکوں اب کہو یاران صد احد حیف

منجے سہے کام اس دل سوں یہو تم صبر کی ل سون
صبوری ہور تو دل سوں کہو یاراں صد احد حیف

اگر دیکھیں حسن کی منجہ تین تو اس جگ میں نہ ملسوں کیں
قیامت کون ملوں گا میں کہو یاراں صد احد حیف

یوسن عاروس دیکھے موں کے تمنا قیامت کون
پچھانوں کس نشانی سوں کہو یاراں صد احد حیف

سونے یو بات غازی جون اپس تین کاری جیوں
دیئے تب پہار را کہو یوں یاراں صد احد حیف

کہ قاسم جب ہوئے محشر تو منجکوں وان تمن دھندکر
پچھا نوں اس نشانی پر کہو یاراں صد احد حیف

اسی مرثیہ میں امام قاسم کی ایک شجاعت کی تفصیل ملاحظہ ہو :-

تب اس چاروں کے داغاں سوں دل ازرق ہوا پرخون
اپنے آیا مقابل کون کہو یاراں صد احد حیف

تب او بدبخت بے حرمت کیا قاسم پو کئے ضرب
وسلے اس کون کہان قدرت کہو یاراں صدا صد حیف

شجاعت کا اہتا جو حد سو اس حد سوں شہ مسند
کئے سب ہات اس کے رد کہو یاراں صدا صد حیف

غضب میں آ او شیر نر تب ارزق کے نزدیک آ کر
کئے ایک ہات یوں اس پر کہو یاراں صدا صد حیف

سپر کون پھوڑ سر میں سون گیا تیغ اس جگر میں سون
سٹے دو کر کر کے میں کہو یاراں صدا صد حیف

- -

جب اس قصّے کون میں کھولیا جواہر مرح کے رولیا
تو ہاتف یوں ندا بولیا یاراں صدا صد حیف

کہ مرزا دور فانی یو گذرسے ہے زندگانی ..یو،
رہنگی تجھ نشانی یو کہو یاراں صدا صد حیف

تیسرا طویل مرثیہ جس کے (۱۶۸) شعر ہیں "قصّہ حُر" سے موسوم کیا گیا ہے

حُر کے متعلق بھی ہر ایک مرثیہ نویس نے مرثیے کہے ہیں۔ مرزا کا یہ مرثیہ خاص طور سے قابل ذکر ہے:۔

ابتدا اور تمہید

اد حسین ابن علی گوہر نبی کے درج کا   اد نور چاند سارا مرتضےٰ کے برج کا

جو گگن ہر شب گلان تاریاں سون ہو گلشن دسے
یوں چمن دل کا ایسی داغاں سوں سب روشن دسے
جوں سورج کی تاب سون بیتاب ذرّے بیشمار
یوں ہوے سرورں کے زیر و زبر اوکی ہزار
ایک مبارک ذات پر کی بہار جوں بادل گھرے
یک وجود پاک پر کی تیر جوں بونداں پرے

شہادت کی تاریخ دن اور تعداد فوج کا ذکر:۔
شہ پو یوں جب دن گھریا ماتم رہیا جگ میں یو سوز
تب محرم کی دہم تاریخ تھا ہور جمعہ روز

شہ کنے چالیس پیادے تیس ہور دو تھے سوار
ظالماں کے دل منے تب تھے سواراں میں ہزار

اس تمام صراحت کے بعد حُر کا ذکر شروع ہوتا ہے:-
اس مخالف فوج میں حُر خاص منصدار تھے،
حر کے تابع تب سواراں یک ہزاراس ٹھارہ تھے

حر عمر سے گفتگو کرتے ہیں اور یزید کی فوج سے نکل کر امام حسین کے طرف چلے آتے ہیں۔ امام سے ملاقات ہوتی ہے:-
تب چلے آتے ہیں شہ سوں صدق اپنا جوڑ کر
دین کے منصب کوں لئے او منصب چھوڑ کر
شہ کنے آ اس وقت تازی سوں او غازی اوتر
تب مبارک ہون رکھے شہ کی رکاب پاک پر

او قدم جس کا دیکھو مشتاق سب آفاق ہے
بلکہ عرش و کرسی و لوح و قلم مشتاق ہے

اس قدم پر جہ رکھے سون ہور اپنا آرام پائے
چوں جدا پانی سوں مچھلی لیکو بھی پانی میں بہائے
اس وقت خوش حال ہو دل سوں شہ دوجگ پناہ
پیار سون راکھے مبارک ہات حر کے سر پو شاہ
حشر کون جس ہات سون کوثر لا پلاویں گے سو ہات
مومناں پاویں گے جن ہاتھوں شفاعت کی نجات
پنجہ خورشید تھے دو جگ پو نو افشاں تمام
او مبارک ہات یوں سر لو پرک بولے امام
کون ہے توں تج منے اخلاص کی آتی ہے باس
پیار سوں یوں چلیا آیا ہے منجہ پُر درد پاس
حر یو سن بولے ہے یوں اے سرور دنیا و دین
میں ہوں یک تیرے محبان میں محب کمترین
اس سبب آیا ہوں تا تج پر کروں یو جیو نثار
تجہ اوپر قربان اچھو مردم جیوان کے لک ہزار
یو میرا مقصود ہے اے قرت العین رسولؐ
جانفشاں تجہ پر ہوں میں منجکوں محبت میں قبول

او شہنشاہ دو جگ حر تھے سنے یو بات جب
اس وقت حر پر ہوئے خوش حال ہو فرمائے تب
آج ہے اے حر ہمارے پر سعادت کا شرف
شاہی فیض ابد یعنی شہادت کا شرف
آج یو دن ہے کہ جا جد مصطفٰے اسوں مل رہیں
گلشن فردوس میں عیش سوں خوش دل رہیں

حُر کی حیثیت مہمان کی ہے۔ حر جنگ کی اجازت طلب کرتے ہیں امام اجازت نہیں دیتے کہ مہمان داری ضروری ہے۔ حر اصرار کرتے ہیں آخر امام مجبوراً اجازت دیتے ہیں :۔

شہ حر یوں دیکھے کہ جیو جین کا ہوا حر کا خیال
تب کہے اے حر نجا دیوں شتابی سوں اتال
تک اگر مہمان منج سوں توں رہے تو خوب ہے
اس وقت اے حر تیرا دیدار منجہ اپر دپ ہے
تب یو سن حر یوں کہنے لے ہر دو جگ کے آفتاب
اس سبب چلنے بدل اب قصد منجکوں ہے شتاب

تا اچھوں تیرے شہیداں میں یومن اول شہید
اس شرف سوں حشر کوں سب میں اچھوں افضل شہید
خوش ہوئے سلطان سرور جب سونے حر تے یو بات
تب دیئے حر کوں رضا او شہسوارِ کائنات

قبل ازیں اس امر کا ذکر ہو چکا ہے کہ دکھنی مرثیوں کا اصل مدعا غم و الم کے اظہار تھا تا کہ مجلس عزا کو اشک بار کیا جائے بعض مرثیوں سے اس کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دکھنی مرثیوں میں رنج و غم درد و الم کا اظہار کس طرح ہوا کرتا تھا۔

زخم تن اوپر جب لگے بے حساب — پڑے سرور اس آن میں جون آفتاب
اٹھیا شور ہر شئی میں اس وقت پر — گیا ہانک یو عرش کے تختا پر
دھواں آہ کا اس گگن لگ گیا — سورج غم سوں شعلہ ہو سب جل گیا
نہ کلثوم زینب کوں طاقت رہیا — نہ کچھ شہر بانو کوں راحت رہیا
جتے اہل معصوم ہو رہے یتیم — کھڑیا سب اوپر یو جفا ہور عظیم
دلے ہرگز ان کو نہ آرام تھا — بجز آہ زاری نہ کچھ کام تھا

آیا عاشور جگ میں قیامت بنا ہوا　　ہر شئی کوں پھر حسین کا ماتم نوا ہوا
جل بل کباب غم تے ہوئے سب نبیاں کے دل　　پرخون جب اس دکھوں جگر مصطفےٰ ہوا
عالم تمام غرق لہو میں ہوا کے نین　　یوں غم میں جب حسین علی مبتلا ہوا
رور و ملک فلک میں لہو سوں بھرے دریا　　گویا عرش گگن پو دو جا کربلا ہوا
تارے نہیں عرش کے رنجو ہے گگن پور سب　　ساتوں طبق فلک میں حسین کا عزا ہوا

. . . .

نور دو چشم حیدر کرار تھا حسین　　ویسے اوپر یو ظلم و جفا کیوں روا ہوا
مرزا جکوئی نین سوں لہو اس دکھ کو بہا　　او سرخ رو دو جگ میں حضور خدا ہوا

کرو زاری محباں ہو یو دکھ پر دل جلایا ہے
حسین کا غم دو عالم کوں رکت رنجو رولایا ہے
محرم چاند اس غم تے دیکھو کیوں خم ہو آیا ہے
شفق کے لہو میں غوطہ کھا گگس میں تن چھپایا ہے
نبی کے آل کی کشتی ہوئی جب غرق اس لہو میں
فلک دیکھو چندر کشتی شفق لہو میں دوڑایا ہے

گگن منڈف چندر قندیل جتے تارے دریں ویوے
دسے رونق یو سب اس ٹھار کہ شہ کا عرس آیا ہے

. . . .

حسین کا درد و غم یاران ہوا پرٹھار پر پیارے
گگن اس بہار تی خم ہو زمین لک سر نوایا ہے
حسین ابن علی صفدر دو جگ کا رہنما سرور
ہوا یوں ظلم دیسے پر غم ہر شے رولایا ہے

. . . .

ملائک عرش و کرسی پر رکھے سر غم کے زانو پر
گگن اس درد سوں رو رو انجو دریا بہایا ہے
چندر سورج انکھیا کھولے فلک حیران ہو دیکھے
کہ غم یوں جب گھر یا شہ پر جہاں کیوں تاب لایا ہے
گگن ہر شب دفن کرتا سورج کوں مار مغرب میں
حسین مظلوم ہو جب سوں زمین یو سمایا ہے
فرشتاں کے دلاں سارے سدا جلتے ہیں اس غم تے
دھواں ان کے آہاں کا گگن ہو جگ پو چھایا ہے

دنیا میں جب سینا مرزا حسین کا درد و غم تب سوں
جگر پر زخم کاری ہو دل سب لہو میں نہایا ہے

ایک الوداع مرثیہ ملاحظہ ہو :-

الوداع الوداع شاہ شہیداں الوداع — اے حسین ابن علی دو جگ کے سلطان الوداع
شاہ دو عالم ہوا مظلوم حیراں الوداع — یوں چلیا دنیائے فانی سوں عزیزاں الوداع

یو شفق نہیں ہے گگن پر صبح و شام اس درد سوں — نت لہکا دیں لہو منی دامن گریباں الوداع
اس جفا کی نہ پنچتی ہے گگن کے تن اوپر — نہیں ستارے پھر لویہ سب ٹ ستے ہیں پیکاں الوداع

شہ کے غم کی ہانک گی ہے عرش و کرسی تلک — سخت ہے یو غم جہاں میں نہیں ہے آساں الوداع
جب ہوا یو داغ کاری فاطمہ کے دل اوپر — سب خوشی چھوڑا اس دکھوں رو الوداع

ہے محرم میں حسین کے درد سوں تازے ہزار — دل اوپر ہوتے ہیں مرزا کے یو داغاں الوداع

مرزا کے سلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

حسین علی پر سلام علیک ۔۔۔ دو جگ کے ولی پر سلام علیک
تو اے شاہ سرور سلام علیک ۔۔۔ دو عالم کے سرور سلام علیک
توئی رہنما شاہ کونین ہے ۔۔۔ حسین ابن حیدر سلام علیک
توہی نورِ چشم رسول خدا ۔۔۔ تو ہے سلطان محشر سلام علیک

. . . .

تیرا وصف لکھنے کو ن لوح و قلم ۔۔۔ رہیا ہے مقصر سلام علیک
تیرا مدح مرزاں کے ایمان کا
ہوا زیب و زیور سلام علیک

صفحات ماقبل میں مرزا کے مختلف مرثیوں کا نمونہ پیش ہو چکا ہے۔ اگرچہ ہمارے مقررہ اصول اشعار کو کاتب مخطوطہ سے نقل کرنے کے باعث بعض غلطیاں ضرور ہیں لیکن اس کے قطع نظر اس امر کا صاف طور سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ مرزا کے مرثیے مضمون کے لحاظ سے ضرور اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا کہنے والا کہنہ مشق مرثیہ گو معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے مضمون پر پوری طرح

حاوی ہے۔ اس کا انداز بیان پیچیدہ نہیں ہے۔ اس کے مرثیے اپنے زمانہ کے لحاظ سے صاف ہیں۔ وہ اپنے مرثیوں میں تشبیہ اور استعارہ سے بھی کام لیا ہے۔ مگر اس میں بھی تصنع اور مبالغہ نہیں ہے۔ اس کے مرثیوں سے دکھنی مرثیوں کا خاص امتیاز بخوبی واضح ہوتا ہے۔ ان کا مقصد مجلس عزا کو گرمانا اشک بار کرنا اور حقیقی طور پر بزم ماتم بنانا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ مرزا اپنے مقصد میں کامیاب تھا۔

(رسالہ شہاب حیدرآباد بابتہ ۱۳۴۲ھ فصلی)

ارسطو جاہی ہندوستانی قصیدے

دکھنی شاعری کے جو نمونے اب تک دستیاب ہوئے ہیں، ان سے اس امر پر دلالت ہوتی ہے، کہ دکھنی شاعروں نے اولاً مثنوی کے میدان کو اپنی فکر اور اظہار خیال کا جولان گاہ بنایا تھا، مگر ساتھ ہی قصیدہ اور غزل بھی متروک نہیں تھی۔ تاریخوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ کہ سلاطین قطب شاہی اور عادل شاہی کے درباری شعرا بادشاہوں کی مدح میں ہمیشہ قصائد پیش کیا کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ اب ان کا بڑا حصہ ناپید ہے

ان کے قصائد کا جو حصّہ دستیاب ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ فارسی شعرأ نے اپنے قصیدوں میں اسلوب بیان کے جو لوازم قرار دیئے تھے، وہی ان دکھنی شعرأ نے بھی اپنے قصائد میں اختیار کر لئے تھے سلطان محمد قلی قطب شاہ علی عادل شاہ اور نصرتی کے قصائد سے اس بیان کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔

قصیدے کے لوازم تمہید (تشبیب) گریز، مدح، ممدوح، اس کے اوصاف ذاتی اور پھر تلوار، گھوڑے وغیرہ کی تعریف، آخر پر دعا، یہ سب دکھنی قصیدوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی عربی قصائد کی جو خصوصیات تھیں، ان کو بھی ان دکھنی شاعروں نے کافی طور سے ملحوظ رکھا ہے۔ واقعہ نگاری کے بہتر سے بہتر نمونے دکھنی شعراء نے یادگار چھوڑے ہیں۔

قصیدوں کی زبان عموماً ادق اور وہ اپنے طرز ادا اور انداز بیان کے لحاظ سے مثنوی سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں طمطراق متانت، شوکت لفظی اور مضمون آفرینی وغیرہ کا خاص لحاظ ہوتا ہے۔

تشبیب بھی مختلف قسم کی ہوتی ہے، تشبیب کے بعد گریز کا موقع

آتا ہے، جو قصیدوں کی جان ہے۔ عربی قصائد کی طرح بعض دکھنی قصائد میں بھی گریز کے موقع پر لطافتیں پیدا کردی گئی ہیں۔ گریز کے بعد مدح آتی ہے اس میں کن کن اوصاف کی تعریف ہونی چاہیئے۔ اس کے متعلق مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی تالیف "شعر الہند" میں تفصیل سے بحث کی ہے، اور بتایا ہے کہ اردو کے ابتدائی قصائد (سودا) میں وہ اوصاف جو عربی محققین واضح کرتے ہیں نہیں ہیں، مگر یہ دعوے مبالغہ نہیں ہے۔ کہ دکھنی قصائد میں ان میں سے اکثر امور پائے جاتے ہیں۔

مگر اس وقت ہم کو دکن کے ابتدائی قصائد سے بحث نہیں ہے۔ بلکہ ایسے زمانہ کے قصیدوں کا تعارف مقصود ہے۔ جبکہ لکھنؤ میں مصحفی اور انشا کا دور دورہ تھا۔

(۲)

سلطنت آصفیہ کے وزرا میں ارسطو جاہ کی شخصیت اپنی تدبر و قابلیت اور سیاست کے لحاظ سے خاص طور پر نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے آپ کی سوانح حیات کے متعلق ایک تفصیلی مقالہ شائع کیا ہے۔ میرا بھی ایک مضمون ارسطو جاہ اور روالاجاہ کی مراسلت کے متعلق شائع ہوا ہے

آج ہم آپ کی مدح میں لکھے ہوئے بعض قصیدوں کا تعارف کراتے ہیں۔

ارسطو جاہ کی دیوانی کا زمانہ ۱۱۹۵ھ سے محرم ۱۲۱۹ھ تک ہے، یعنی مرنے تک وہ اسی خدمت جلیلہ سے سرفراز رہے۔ آپ کے دیوانی کے زمانہ میں سلطنت آصفیہ میں بڑے بڑے سیاسی امور رونما ہوئے، مرہٹوں سے لڑائیاں ہوئیں، ٹیپو سلطان سے معرکہ رہا۔ فرانسیسیوں اور انگریزوں کی رقابت کا سلسلہ جاری رہا اور آخر فرانسیسیوں کا اثر ہمیشہ کے لئے زائل ہوگیا۔

اس وقت جن قصائد کا تعارف مقصود ہے۔ وہ ۱۱۹۴ھ سے ۱۲۱۵ھ تک تعلق رکھتے ہیں۔ یہ قصیدے ایک کتاب میں جمع کئے گئے ہیں اور اس کا نام "مجموعہ فصاحت" رکھا گیا ہے۔

اس کے جامع حیدرآباد کے مشہور مورخ اور ادیب شاہ تجلی علی تجلی ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ ۱۲۱۵ھ میں مرتب ہوئی ہے مگر معلوم ہوتا ہے ۱۲۱۶ھ تک اس کا کام جاری رہا۔ کیونکہ جو تاریخیں اس کتاب کے متعلق نکالی گئی ہیں، ان سے ۱۲۱۶ھ ظاہر ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں :-

(۱) ریاض قصائد (۲) قصائد اعظم (۳) دفتر وصف وزیر قابل وغیرہم
۱۲۱۶ھ ۱۲۱۶ھ ۱۲۱۶ھ

اسمٰعیل یار جنگ کی فرمائش سے یہ کتاب مرتب ہوئی ہے، اس میں فارسی اور اردو قصیدے، قطعات تاریخی شامل ہیں، ان کو شعرا کے تخلص کے لحاظ سے ردیف وار جمع کیا گیا ہے۔

یہ قصیدے ۱۱۹۴ھ سے ۱۲۱۵ھ تک مختلف مواقع پر پیش ہوئے ہیں، بعض ارسطو جاہ کے خطاب کی سرفرازی کے متعلق ہیں بعض جشن سالگرہ اور جشن نوروز کے موقع پر پیش ہوئے ہیں، بعض عیدالفطر اور عیدالضحٰے سے متعلق ہیں۔ کوئی ٹیپو سلطان کی فتح پر ہے۔ کوئی پونہ کی واپسی پر پیش ہوا ہے۔ کوئی تولد اولاد کی خوشی یا ان کی شادی بیاہ کے موقع پر پیش ہوتے ہیں۔

"مجموعہ فصاحت" نایاب ہے، اس کے دو حصّے ہیں، ان کے منجملہ دفتر دیوانی و مال وملکی وغیرہ سرکار عالی کے کتب خانہ میں ایک حصہ موجود ہے اس حصہ میں ردیف ص تک بیان ہوا ہے، جس میں (۶۶) شعراء کے قصیدے اور قطعات شامل ہیں۔ دوسرے حصہ میں (۵۴) شعرا کے قصیدے وغیرہ ہونے چاہئیں، کیونکہ ان کی فہرست حصّہ اول میں شامل ہے۔ اس طرح (۱۲۰) شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں مکمل حصہ

موجود ہے۔

زیر بحث مخطوطہ کا حجم (۴۹۲) صفحے کا ہے ہر صفحہ پر (۱۴) سطر ہیں نستعلیق میں لکھا گیا ہے، ابتدا میں ایک طویل فارسی دیباچہ بھی ہے۔ جو اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

(۳)

شاہ تجلی علی المتخلص بہ تجلی امرائے دربار آصفی سے تھے، نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی کے ہمراہ رکاب رہا کرتے۔ علمی قابلیت بہت اچھی تھی، عربی اور فارسی کے بڑے ماہر تھے، فارسی اور اردو کے بہترین شاعر تھے، تصنیف و تالیف کا بڑا شوق تھا۔ "تزک آصفیہ" جو سلطنت آصفیہ کی مستند تاریخ ہے آپ کی یادگار ہے۔

شاعری کے ساتھ مصوری اور خطاطی میں بھی ید طولےٰ رکھتے تھے، بڑے متواضع منکسر المزاج تھے، ہر شخص کے ساتھ اخلاق سے ملا کرتے۔ امرائے عظام یعنی ارسطو جاہ، امیر کبیر شمس الامرا، امیر عالم وغیرہ سے آپ کو خاص اتحاد تھا۔ آپ کے دختر کی شادی میں آصف جاہ ثانی نے آپ کے مکان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کیا تھا۔

تجلی کا انتقال ۱۲۱۵ھ میں ہوا۔ حیدرآباد کے محلہ یاقوت پورہ میں دفن ہوئے۔

شاہ معین تجلّی سے آپ کو بیعت تھی۔ ان سے خلافت بھی حاصل ہوئی تھی جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں (۲۶) شعرا کے قصیدے اور قطعات شامل ہیں۔ ہندوستانی قصائد کی تعداد (۶۸) اور قطعات دو سو سے زیادہ ہیں۔ فارسی قصائد اور قطعات اس کے علاوہ ہیں۔

بلحاظ ردیف شعراء کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

الف ۱۸ شعرا۔ ب ۳ شعرا۔ ت ۵ شعرا۔ ث ایک شاعر۔ ج ۴ شعرا چ ایک شاعر، ح ۶ شعرا۔ خ ۲ شعرا۔ ذ ۲ شعرا۔ ر ۴ شعرا۔ ز ۳ شعرا۔ س ۹ شعرا ش ۶ شعرا، ص ۲ شعرا۔

سب سے زیادہ قصیدے تجلی کے ہیں۔ جن کے اردو قصائد کی تعداد دس ہے۔ اس کے بعد "احسن" کے نو قصیدے ہیں، سب سے طویل قصیدہ تجلی ہی کا ہے جس کے ایک سو چالیس شعر ہیں۔

کئی شعراء کے قصیدے ایک ہی قافیہ و ردیف میں ہیں۔ مثلاً ردیف "دست" اس میں تجلی، ایما، سحر کے قصیدے ہیں۔ ہر ایک کا مطلع ملاحظہ ہو

تجلّی :-

گر وصل گلبدن دے مجھے ایک بار دست　　ہر موسے بہر شکر ہوں پیدا ہزار دست

ایما :-

بے زر جہاں میں کچھ نہیں آتا بکار دست　　بدتر ہے آستیں سے بے اقتدار دست

سحر :-

یا رب دے اوس کا یوں مجھے بوس و کنار دست　　لب لب سے بر سے بر گلے میں ہو ہار دست

"وزارت" کی ردیف میں ایمان اور ایما دونوں کے قصیدے ہیں :-

ایمان :-

پیدا ہے تیرے چہرہ سے یہ شانِ وزارت　　جو دیکھے سو بولے کہ ہے شایانِ وزارت

ایما :-

پھبتی ہے تجھے نام خدا شان وزارت　　ہے ذات مقدس تری شایان وزارت

مزید طوالت کے خوف سے ہم صرف بعض قصائد سے تشبیب، گریز، مدح کے اشعار پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں :-

تشبیب

بحمد اللہ مجھ تک صبحدم پیک صبا پہنچا　　نوید دولت جاوید کو لیتا ہوا پہنچا

کہا مجھ سے کہ اب کیونکر نہ ہو گلگل شگفتہ تو ۔۔۔ کہ داماں اجابت کو ترا دستِ دعا پہنچا
تو اپنے عقدۂ دل کو یکایک کھول جیوں غنچہ ۔۔۔ ترا بھی مقصدِ دیرینہ تا حاجت روا پہنچا

ایمان

ہیں اب کے ایک سال میں پیدا بہار دو ۔۔۔ ایک گل پہ جھوم جھوم کر آئے ہزار دو
گل کوئی شمع کوئی سمجھ بلبل و پتنگ ۔۔۔ قربان ہیں صبح شام بصد اضطرار دو
سیلاں ہے بسکہ جوشِ رطوبت سے باغ میں ۔۔۔ سروِ چمن کے بیچ ستے جوئبار دو
موجِ نسیم آئینہ آبشار سے ۔۔۔ صیقل سا صاف کر دیا رنگ غبار دو
یہاں تک نمو کا زور ہے نکلے زمیں کو چیر ۔۔۔ یک بیج سے گلوں کی بھری شاخسار دو
مثلِ دو دوست بدل و بخاششِ حیات کے بیچ ۔۔۔ جاری ہوئے ہیں نہروں سے اب آبشار دو
دل چاہتا ہے آج رگِ گل میں گوندہ گوندہ ۔۔۔ پہنوں میں کر کے عطر سے پروردہ ہار دو

تجلی

جلوۂ حسن شفق کے کہوں کیا میں مثل ۔۔۔ آتشِ طور بھڑکتی ہے بہر دشت و جبل
رنگ ہے تنگ چمن پر کہ تماشا کیلئے ۔۔۔ شاہدِ نکہتِ گل آتی ہے پردہ سے نکل
جوشِ یکرنگی ہے یہاں تک چمن چاہی ہے ۔۔۔ آشنائی سے کرے سبزہ بیگانہ بدل
باعثِ صافیٔ مرآتِ سکندر ہر حوض ۔۔۔ موجبِ آبروئے عین لطافت ہر منہل

لطفِ تحقیق ہے اس فصل میں تقلید سے باز   سخت جانکاہ ہے بوئے گل کا غذیہ جعل
بسکہ دلکش ہے ہوائے چمنستانِ جہاں   دخل کیا غنچۂ تصویر کا دل ہو بہ بغل
فیض واشد ہے اس ایام میں عام ایسا کچھ   خود بخود ہووے ہے حل عقدۂ ما لاینحل
امر دشوار ہے شاعر بھی غزال معنی   باندھے گرچا ہے بصد رشتۂ فکر اطول
سخن

گریز۔

کب تک کرینگا شکوہ زمانے کے ہات سے   کچھ بھی دیا ہے تجھ کو اگر اقتدار دست
جا اوس کے پاس جس کے تجمل کے روبرو   اقبال و جاہ باندھے میں لیبار دست
ہے وہ جناب اعظم الامرا کہ جس کے پاس   معنی چلے ہیں باندھ کے کئی کئی قطار دست
تجلّی

غیر از گرہ گرہ میں مرے کچھ نہیں رہا۔   لایا ہے پیچ میں ستم روزگار دست
میں اس کی دستگیری کا امیدوار ہوں   ایک دست پر صدقے کیے ہی بکے ہزار دست
یعنی وہ کون اعظم الامرا ہے جس کا نام   ہر امر میں اسی کا ہے حاجت برار دست
ایضاً

لیکن گرہ وہ جس سے کہ دل کی کھلے گرہ   دنیا میں نہیں ہے ایک گرہ کے سوا گرہ

گر چاہتا ہے تو کہ ہو وا شدا دے نصیب　　ناخن سے بستگی کے جو ہو دے رہا گرہ
چل ایک بارگاہ وزارت پناہ میں　　وہ کھئی دنوں سے دل میں جو ہے مدعا گرہ

"تمنا"

آتے میں مجھے طوطی نے بولی نہ خفا ہو　　اس رنگ تحیر سے آئینہ نما ہو
مشہور مثل ہے جسے جی چاہے سو پاس ہو　　وہ نور نظر سامنے ہی جلوہ نما ہو
کس کا ہے تو مداح ترا کون ہے ممدوح　　کوئی ایسا کئیں فخر سے اب وجد ہوا ہو
تب میں نے کہا طوطی سے اے جال کے شاہد　　میں نام سنوا دس کا تو کچھ مدح و ثنا ہو
بولی کہ یہ کیا بولے ہے دیوانہ بشر ہے　　وہ اسم مبارک تو کئی بار سنا ہو
مشہور مہ و مہر کے مطلع سے ہے جگت میں　　جس نیر اعظم کا لوا مہر و سما ہو

"سحر"

الغرض دیکھ کے اس ٹھاٹ کو میں نے پوچھا　　بارے کس واسطے ہیں اہل طرب جمع یہاں
یہ صدا سنتے ہی محفل سے ایک اہل تمیز　　مجھ سے کرنے لگا تفصیل سے اس طور بیاں
وہ جو ہے ابن ارسطوئے زماں کیواں جاہ　　صاحب تاج و لوا بادشہ کون و مکاں

احسن

مدح و تعریف

زر پاشی تیری دیکھ کے ہر صبح آفتاب ‏ رکھتا ہے اپنے چہرہ پہ ہو شرمسار دست
بذل و سخا و جود و کرم فیض و لطف و خلق ‏ کھولے ہیں تیرے سامنے ہفتاد یار دست
حلقہ میں تیرے دام کے ہوں سر چرخ صید ‏ کر دے ہے جب بلند تو بہر شکار دست
تیری سخا کا پایۂ عالی ہے یوں بلند ‏ پہنچا نہیں سپہر کا وہاں زینہار دست
ہو گئے ہیں تنگدست جہاں کے کشادہ دست ‏ پایا ہے جب کرم سے تیرا اشتہار دست

تجلی

اے کرم بخش جہاں فیض عبادت تیری ‏ سینہ دریا ہے صدف دل ہے اور ایماں گوہر
تجھ سے سائل ہو جو ایک جو کا کوئی وقت نماز ‏ دیوے گندم کی جگہ تول کے فی الآں گوہر
لب سے شاہا تیرے نکلے ہے سخن بھی دُر ریز ‏ ہیں ہم شیر و شکر لعل و بدخشاں گوہر

احسان

تجھ تیغ آبدار کا اے دستیار خلق ‏ اوچھا سا گر لگے بسر کوہسار دست
گاؤ زمیں کے کاٹ کے چو رنگ تا بہ تخت ‏ ذرہ خطا کرے نہ تیرا زینہار دست

ایماؔ

جس جائے زور بازو کا مذکور ہو تیری ‏ حسرت سے کاٹنے لگے اسفندیار دست
رستم تیرے حضور ہے ایک ہنسہ پہلوان ‏ پنجہ سے کب کرے تیرے بر در دو چار دست

سرمہ کی طرح خاک ہوا ایک ہی فشار میں ۔۔۔ کر دیوے سنگ لاخ کو تیرا فشار دست

ایضاً

دلدل نسب براق حسب ہے تیرا کمیت ۔۔۔ خنگ فلک ہے اس سے فروتر ہزار دست

جب تھان سے کھلے ہے وہ گلگشت کیلئے ۔۔۔ باندھی ہے اس کے روبرو باد بہار دست

عرصہ یہ شش جہت کا نہایت ہی تنگ ہے ۔۔۔ مت ڈال اس کی باگ پہ اے شہسوار دست

ٹھہرے نہ وہ زمین پہ پھر آسماں سوا ۔۔۔ گر اوس کی پائے وہم دے اضطرار دست

ایضاً

ہاتی تیری سواری کا اتنا ہے سربلند ۔۔۔ پہنچائے آسماں تک اس کا سوار دست

خوبی سیاہ سینہ کی اس کی میں کیا کہوں ۔۔۔ ملتا ہے جس کو دیکھ کے ابر بہار دست

ایضاً

رائے انور کی تیری وصف رقم کرنے کو ۔۔۔ دمبدم صبح کرہی زر خورشید کو حل

بذل گوئی ہے تیری ہم نفس سحر حلال ۔۔۔ اور شکر ریزی گفتار ہے ہم شان عمل

کیا عجب قدرت سخن فیض ہوا ہے لب سے ۔۔۔ شیریں ہو جائے اگر ایک ہی دم میں حنظل

تا کجا شرح کروں میں تیرے اوصاف کو اب ۔۔۔ خوش عادت سے غرض کم نہیں یہ حسن عمل

سخن

اس تفصیل سے قصائد کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے لوازم تشبیب گریز اور مدح کا نمونہ واضح ہو گیا ہے۔

قدیم دکھنی قصائد میں واقعہ نگاری کا بڑا ذخیرہ ہے اگرچہ اس زمانہ کے قصائد میں ایسا مواد زیادہ نہیں ہے تاہم بعض قصیدوں میں واقعہ نگاری کی اچھی صراحت ہوتی ہے۔ مثلاً شاہ تجلی نے ٹیپو سلطان سے جنگ اور پونہ سے واپسی کے موقع پر جو قصائد پیش کئے ہیں۔ ان میں واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے، پونہ سے واپسی کے قصیدہ کا کچھ نمونہ ملاحظہ ہو۔

مشیر ملک گئے جب کہ پٹرنویس کے پاس نگر کے دل میں ذرا اپنی جان کا وسواس

خدا کو بھول کے وہ قوم برہمن خناس اوتارے باغ میں جس جا تھا دیو دکا مراس

وہ بت شکن نے جدھر کو کیا غضب سے نظر

چھپی لبنگ خجالت وو بہوت مثل شرر

بلا کے اس طرح مردود عہد و پیماں سے دغا و مکر لگے کرنے اپنے مہماں سے

ذرہ بھی کچھ نہ ڈرے انتقام سبحاں سے خبر نہ رکھتے تھے کچھ انقلاب دوراں سے

بھوت ماگرچہ کئے وہ معاندین پرخاش

لیا بھول سے نہیں چرخ چنبریں یاداش

یہاں تلک تو کرے سختی وہ ستم گستر بٹھلائے پہرہ بلا اپنے مہماں اوپر
نہ حکم تھا کہ ملے کوئی کسو ستے جا کر برنگ مہرہ بے دست و پا تھے سب ششدر
گراتھا مات سے ہر یک کے کیتین مراد
پھر اوس پہ جور و دغاباز کا تھا حال زیاد

بخوف طوالت اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے، ان اقتباسات سے اس زمانہ کے قصائد کا اسلوب بیان اور پرواز خیال، شوکت لفظی وغیرہ کا پورا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں جس قسم کے قصیدے شمالی ہند میں لکھے جاتے تھے وہی رنگ دکن کا بھی تھا۔

چنانچہ احسن اللہ خان بیاں جن کا تعلق شمالی ہند سے تھا۔ ان کے قصائد بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں اور ان کا انداز بیان بھی یہی ہے، زبان کی صفائی اور اسلوب میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اگر ان قصائد کا انتخاب بھی شائع ہو جائے۔ تو ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی ؛

رہبر دکن سالگرہ نمبر
سنہ ۱۳۵۴ھ

...TON LIBRARY
Date ....
ALIGARH.
... UNIVERSITY
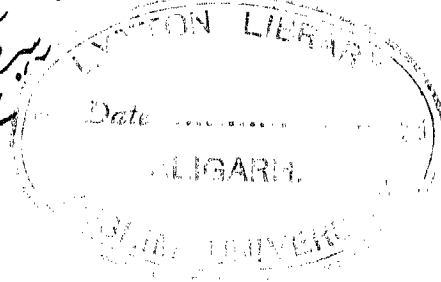
شعر الہند اور دو کہن

زبان اردو پر مولانا شبلی مرحوم کا جس قدر احسان عظیم ہے اتنا اور چند ہی اصحاب نے کیا ہے۔ مولانا نے جس قدر علمی مواد زبان اردو کے خزانہ میں جمع کیا ہے۔ اس سے آیندہ نسلیں مدتوں فیض یاب ہوں گی۔

مولانا کے لائق جانشین مبارکباد کے قابل ہیں۔ کہ انہوں نے دار المصنفین قائم کر کے اپنے قابل استاد کے نام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید کر دیا ہے قلیل عرصہ میں دار المصنفین نے جس قدر اعلیٰ درجہ کی کتابیں ملک اور قوم کے سامنے پیش کی ہیں کسی اور انجمن نے باوجود کافی سرمایہ کے نہیں کیں۔

دار المصنفین کی تالیفات اور تصنیفات میں ہمیں نہ صرف تاریخ و سیر کی کتابیں نظر آتی ہیں۔ بلکہ فلسفہ و ادب اور دیگر علوم و فنون کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ چنانچہ حال میں ایک کتاب شعر الہند شائع ہوئی ہے۔ جو اردو علم ادب کا ایک خزانہ ہے۔ یہ کتاب سلسلہ تالیفات کی چھبیسویں کڑی ہے۔ اور اس کے مؤلف مولانا عبد السلام صاحب ندوی ہیں۔ ذیل میں اس

کتاب کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ تاکہ قارئین کو اس کے مضامین سے آگاہی ہو جائے۔

یہ کتاب چار ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے باب میں اردو شاعری کے آغاز پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد قدما کا پہلا دور شروع ہوتا ہے جس میں اُردُو شاعری کی تجدید اور اصلاح کا بیان ہے۔ اسی سلسلہ میں میر و مرزا (میر تقی اور مرزا سودا) کے کلام کا موازنہ اور مقابلہ بھی کیا گیا ہے اس کے بعد قدما کا تیسرا دور آتا ہے جس میں "لکھنؤ میں شاعری کا آغاز" پر بحث کی گئی ہے اور مصحفی اور انشا کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس بحث کے بعد تلامذہ شعرا۔ قدیم کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ جس میں خان آرزو مرزا مظہر جان جاناں شاہ مبارک آبرو مصطفےٰ خان یک رنگ۔ شرف الدین مضمون۔ شاہ حاتم۔ میر۔ سودا۔ میر درد۔ میر سوز۔ انشا۔ میر حسن۔ جرأت۔ مصحفی۔ بقا۔ دیوانہ ضیا۔ حزین۔ الہام۔ ندیم۔ فغاں۔ بیدار۔ حسرت۔ فقیر اور قدرت کے (۹۱) شاگردوں کا نہایت مختصر ذکر ہے اور ایک ایک دو دو شعر بھی دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد تتبعین شعرائے قدیم کا عنوان آتا ہے۔ اس عنوان میں بتایا گیا ہے۔ کہ کن کن شعرا نے کن کن شعرا کا تتبع کیا۔ اس کے خاتمہ

پر باب اول ختم ہو جاتا ہے۔ جو (۱۸۸) صفحوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں "متوسطین کا پہلا دور" شروع ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا شیخ ناسخ سے ہوتی ہے۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ کہ شیخ ناسخ نے کیا کیا تبدیلیاں کیں اور اسی سلسلہ میں ایک آخری تبدیلی الفاظ کی تبدیلی ہے جس کی ایک طویل فہرست "جلوۂ خضر" سے نقل کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ کو "اردو شاعری کے دو مختلف اسکول" کا عنوان ملے گا جس میں دلی اور لکھنو کے خصوصیات کلام تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کے بعد "اساتذہ دہلی" کا عنوان آتا ہے۔ جس میں اس دور کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور شاہ نصیر۔ ذوق۔ غالب اور مومن کے علیحدہ علیحدہ رنگوں کو دکھایا گیا ہے۔ اس کے ختم پر "متوسطین کا دوسرا دور" شروع ہوتا ہے جس میں تلامذہ آتش و ناسخ پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے۔ کہ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے بعد اردو زبان اور اردو شاعری کی اصلاح میں جو کمی رہ گئی تھی، اس کو اُن کے تلامذہ نے نہایت جامعیت کے ساتھ پورا کیا۔ اسی سلسلہ میں آپ کو تلامذہ غالب، مومن کا بیان بھی ملے گا۔ جو شیفتہ۔ ذکی۔ مجروح۔ حالی۔ انور کے مختصر کلام پر مشتمل

ہے۔ اب دوسرا باب جو (۹۹) صفحات میں ہے ختم ہو جاتا ہے اور تیسرے باب کی ابتدا ہوتی ہے جس میں "متاخرین کا پہلا دور اور ریاست رام پور" کا عنوان ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ غدر کے بعد نواب یوسف علی خان اور کلب علی خاں کی قدر دانیوں نے رام پور کو اساتذہ لکھنو اور دہلی دونوں کی شاعری کا مرکز بنا دیا اور ان کی فیاضانہ کشش نے مومن۔ غالب۔ داغ اسیر۔ امیر۔ منیر۔ بحر۔ خلق۔ تسلیم۔ ضیا اور جلال وغیرہ کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ اسی سلسلہ میں داغ اور امیر کا موازنہ بھی درج ہے۔ اس کے بعد "متاخرین کا دوسرا دور" شروع ہوتا ہے۔ اس میں تلامذہ داغ اور امیر کا بیان ہوا ہے اور بتایا گیا ہے کہ رام پور میں دلی اور لکھنو کی شاعری کے اختلاط نے جو نیا رنگ پیدا کر دیا تھا، اس کو ان لوگوں نے اور بھی چمکا دیا۔ اس بیان پر تیسرا دور جو (۷۰) صفحوں میں ہے ختم ہوتا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان "دورِ جدید" ہے۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ کہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب نے ہمارے شعرا کے سامنے کیا کیا اصلاحی مطالبات پیش کئے اور "مقدمہ حالی" سے یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ اردو شاعری کے متعلق مولانا نے کیا کیا اصلاحی خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اور پھر

مولانا کی شاعری کے نمونے دیئے گئے ہیں ۔ اس کے بعد حسرت موہانی
وفا رامپوری ۔ شوکت علی فانی ۔ محمد علی جوہر ۔ اصغر حسین اصغر ۔ علی محمد شاد ۔
عزیز لکھنوی ۔ شبیر حسین جوش کا کلام نمونۃً پیش کیا گیا ہے ۔

اس کے بعد وطنی شاعری ۔ اخلاقی شاعری ۔ سیاسی شاعری نیچرل شاعری
مناظر قدرت ۔ وصف نگاری ۔ ظریفانہ شاعری ۔ قومی شاعری ۔ تاریخی شاعری
کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے جس میں حالی ۔ شبلی ۔ اقبال ۔ اکبر ۔ محمد اسمعیل
وغیرہ کا کلام پیش کیا گیا ہے ۔

اخیر میں "متفرق نظموں" کا عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں انگریزی
نظموں کے ترجموں کا ذکر ہے ۔ اس طرح یہ باب (۸۶) صفحوں پر ختم ہوتا ہے
کتاب کے مضامین و مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب
میں نفس مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ۔ مجھے یہ دیکھنا مقصود ہے ۔ کہ آیا
فاضل مؤلف نے دکن کی ادبی خدمات کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ یا جیسا کہ
چاہیئے تھا ۔ اُن کا تذکرہ کیا ہے ۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا ۔ کہ انہوں نے
دکن کے حقوق ادا کرنے سے دریغ کیا ہے ۔ تاہم دکن کے متعلق انہی
جو معلومات بہم پہنچائی ہیں ۔ اُن میں بعض فرو گزاشتیں ہیں ، اور بعض کمیاں

رہ گئی ہیں۔ جن کو میں ذیل میں مختصراً بیان کرتا ہوں:۔

۱۔ دیباچہ میں مولانا نے اُردو کے تذکروں کی فہرست دی ہے اور اس میں بجولہ گارسن ڈی ٹاسی اور چند دیگر تذکروں کا ذکر کیا ہے۔ مگر اس میں دکن کے کسی تذکرہ کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ دکن میں بھی کئی ایک تذکرے لکھے گئے ہیں۔

۲۔ اردو شاعری کے آغاز کو مختصر طور پر قلمبند کیا گیا ہے۔ جو ناکافی اور تشنہ ہے۔ ابتدائی شاعری جو دکن سے وابستہ ہے اس کے متعلق قابل مؤلف نے اول تو کچھ نہیں لکھا ہے۔ جو لکھا ہے۔ وہ تحقیق اور وسعتِ معلومات پر مبنی نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً:۔

ا۔ لکھتے ہیں۔ کہ "سلطان قلی کے مجموعہ کلام کو دیوان سے موسوم کیا گیا ہے" اس جملے سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ دراصل دیوان نہیں ہے۔ حالانکہ سلطان قلی کا مجموعہ کلام بالکل اسی طرح مرتب ہوا ہے جس طرح آج کل کے کلیات اور دیوان مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں اصنافِ سخن سے مثنویاں۔ غزل قصیدے۔ رباعیات وغیرہ سب کچھ موجود ہیں۔ باوجود اس کے اس کو دیوان نہ کہنا خالی از تعجب نہیں۔

ب۔ "غواصی نے طوطی نامہ بخشی کو نظم کیا۔ جس کا ایک مصرع ہندی اور ایک مصرع فارسی تھا" حالانکہ یہ کتاب ایسی نہیں۔ بلکہ بالکلیہ دکھنی نظم ہے۔

ج۔ اسی طرح "مثنوی من لگن" کا ذکر بالکل سرسری طور پر کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کی بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں عالمگیر کے منہ پر اس کی کلی حقیقت بیان کردی گئی ہے اور اس کے کیرکٹر کا صاف صاف ذکر کیا گیا ہے۔

د۔ "اردو شاعری کا آغاز مذہبی حیثیت سے ہوا اور ولی کے زمانہ تک مذہبی خیالات شاعری کا جزو غالب رہے۔ اس لئے معاصرین ولی نے جو کچھ لکھا اس کا بیشتر حصہ مناجات اور مناقب وغیرہ پر مشتمل تھا۔"

یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ولی سے بہت پہلے ہمیں ایسا کلام نظر آتا ہے۔ جو مناظر قدرت واقعات روزمرہ تاریخی نظم۔ اخلاقی نظم وغیرہ پر مشتمل ہے۔ وجہی۔ نصرتی ابن نشاطی قطب شاہ۔ رستمی۔ غواصی۔ خوشنود شیدا۔ مومن وغیرہ کی مثنویوں اور کلام سے اس کا بخوبی ثبوت مل سکتا ہے مضمون کی طوالت کے خوف سے نمونے متروک کئے گئے۔

۳۔ "اردو کا مکمل خاکہ عالمگیر کے زمانہ میں تیار ہوا۔ لیکن اس کی داغ بیل

عالمگیر کے زمانے سے بہت پہلے پڑھی جا چکی ہے" ۔ ص ۱۲

یہ بھی صحیح نہیں ہے ۔ کیونکہ مکمل خاکہ بھی اس سے پہلے تیار ہو چکا تھا ۔ دکن میں عالمگیر سے پہلے بیسیوں شاعر مثلاً نظامی ۔ وجہی ۔ ابن نشاطی ۔ غواصی احمد جنیدی ۔ شاہی مرزا ۔ شعور ۔ رستمی ۔ نصرتی ۔ ہاشمی وغیرہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے دربار کی زینت بنے ہوئے تھے ۔ سخن فہم بادشاہ قطب شاہ ۔ شاہی عبداللہ وغیرہ خود بھی باکمال شاعر تھے ۔ شعرا کی مثنویاں، قصیدے، غزل اور مرثیے ترجیع بند اور رباعیاں آج تک محفوظ ہیں ۔ اس کے علاوہ بیجاپور کی سرکاری زبان ۹۶۵ھ میں دکنی ہو گئی تھی ۔ اس لئے یہ کہنا کہ عالمگیر کے عہد میں اردو کا مکمل خاکہ تیار ہوا درست نہیں ہو سکتا ۔

۴ ۔ جہانگیر کے زمانہ میں ملا نوری ایک شاعر تھے ۔ جو اگرچہ عام طور پر فارسی زبان میں شعر کہتے تھے ۔ لیکن ان کے قلم سے ایک آدھ مصرع اردو کے بھی نکل گئے ہیں ۔ مثلاً

ہر کس کہ جنابت کند البتہ بترسد   بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

جہاں تک میرا خیال ہے ۔ یہ نوری بیجاپوری ہیں

۵ ۔ ولی کے متعلق لکھا گیا ہے ۔ کہ ولی جب تک دکن میں رہے ۔ ان کا

کلام بھی مضمون اور زبان دونوں حیثیتوں سے بہت کچھ قابلِ اصلاح تھا۔ اس لئے جب وہ دہلی آکر شاہ سعد اللہ گلشن سے ملے اور ان کو اپنے اشعار سنائے، تو انہوں نے ان کو اس طرف توجہ دلائی صہ۲۶۔

مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کہ دہلی آنے سے پہلے ان کا کل کلام قابل اصلاح تھا، کیونکہ جب وہ دہلی آئے تو ان کے ساتھ ان کا دیوان موجود تھا۔ اگر ان کا یہ دیوان ہمیں دستیاب ہوتا اور اس میں ان کا تمام کلام اسی طرح قابلِ اصلاح ہوتا۔ تو یہ دعوےٰ صحیح ہوسکتا ہے۔ صرف سعد اللہ گلشن کے توجہ دلانے پر اس امر کا یقین کر لینا۔ کہ ان کا پہلا تمام کلام قابلِ اصلاح تھا۔ غالباً صحیح نہ ہوگا۔ ولی جس وقت دہلی گئے ہیں۔ وہ کہنہ مشق شاعر ہو چکے تھے۔

(۶) دہلی لکھنؤ اور رامپور یہاں تک کہ عظیم آباد میں شاعری نے جو کچھ ترقی کی اور وہاں کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (صفحہ ۲۸۸، ۲۸۱) مگر حیدرآباد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حیدرآباد نے اُردو علم ادب کی جو جو خدمت انجام دی ہے، وہ اُردو کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھی جانی چاہیئے۔

ایک زمانہ تھا۔ جبکہ یہاں کی مسند وزارت پر چندو لال شاگرد شاہ نصیر

جیسے سخن فہم، سخن سنج تمکن تھے۔ جن کے دربار میں کئی ایک مشہور اور نامور شعرا کا جمگھٹا تھا۔ شاہ نصیر بار بار یہاں آتے تھے۔ آخر یہیں مرے چندو لال کے درباری شعرا میں ایک حفیظ تھے۔ جن کے متعلق شہیدی مرحوم کا خیال تھا کہ مبصران سخن کے نزدیک آج کل (اس زمانہ میں) فن شعر میں صرف تین شیخ ہیں۔ شیخ ناسخ لکھنؤ میں، شیخ حفیظ دکن میں اور شیخ ذوق دہلی میں۔

حفیظ کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

چاک سینہ ہو گیا دل سے صدا آنے لگی   کھلتے ہی اس در کے جنت کی ہوا آنے لگی

ہمارے دل میں درد و الم کا جوش رہا   کہ سینہ داغوں سے دوکان گلفروش رہا

لب جاناں سے جی اداس رہا   ہم کو آپ بقا نہ راس آیا

خود مہاراجہ کہنہ مشق قادر الکلام باکمال شاعر تھے۔ کلام کی رنگینی انداز کی جدت بیان کی بلندی آپ کی قادر الکلامی کے اعلیٰ شاہد ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

جامۂ یار کو کیا جامۂ گل سمجھا ہے   خار کی طرح سے تو دامن دلدار نہ کھینچ

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا　　کچھ تو اے موسےٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

پردۂ چشم اُٹھا دیدۂ تحقیق سے دیکھ　　جب یگانہ وہ ہُوا کوئی نہیں بیگانہ

ہمیں کیا کام ہے دونوں جہاں سے　　ترا ملنا ہمارا مدعا ہے

ان کے علاوہ اس زمانہ میں اور اس سے پہلے کئی باکمال آسمانِ شہرت پر آفتاب ہو کر چمکے۔ مگر تعجب ہے کہ شعر الہند میں ہمیں سوائے ولی اور سراج کے سرسری ذکر کے کسی کا کلام نہیں ملتا۔ اور خود ولی اور سراج کے بھی جو اقلیم سخن کے بادشاہ تھے۔ بالکل مختصر بیان پر اکتفا کیا گیا ہے۔

چند باکمالوں کے نام اور ایک ایک دو دو شعر مثال کے طور پر درج کیئے جاتے ہیں:۔

فقر اللہ آزاد جو ولی کے ہمعصر تھے:۔

سب صنعتیں جہاں کی آزاد ہم کو آئیں　　پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

داؤد متوفی ۱۱۶۸ھ

اس صنم کے خیال ابرو نے ناتواں مجھ کو جوں ہلال کیا

چاندنی کی سیر کو کس طرح نکلے وہ صنم دیکھنے مہ کا تماشا آفتاب آتا نہیں

موزوں برہان پور کے قلعہ دار تھے :-

موزوں نے راہِ عشق میں پھر اب قدم رکھا ہے مصلحت سے دور نہ جانے کرے گا کیا

سرمہ گر ابرو سے اپنی وہ خوش ابرو پونچھے گرد خجلت کو سدا دیدہ آہو پونچھے

آستیں کا ہیں کسو کی نہ ہوا دستِ نگر میرے ہی ہاتھوں نے آخر مرے آنسو پونچھے

فیض متوفی ۱۲۸۲ھ جن کے دامن فیض سے صدہا اشخاص فیضیاب ہوئے :-

کفر جو تھا دین میرا ہو گیا بت ہی نصیبوں سے خدا ہو گیا

تقاضا دیت کا مگر فیض ان سے خدا سے کوئی خونبہا چاہتا ہے

اٹھا تیں حبیب کی لاکھوں ہی جھڑکیاں ہم نے مگر نہ قبضہ میں دامانِ آرزو آیا

نہ کر اس چشم کا پھر مجھ کو بیمار — ابھی لے فیض مر مر کے جیا ہوں

میر احمد علی عصر۔ شاگرد فیض:۔

کام کب تدبیر سے ہو جب ہو تقدیر میں — طالع بیدار میرا رات بھر سویا کیا

غریق بحر محبت ہوں عصر بعد فنا — گرا نہ لاشں بھی اپنا کچھار کے باہر

مدفن میرا میرے لئے گلزار بن گیا — زیر زمیں بھی چین سے ہوں میں مزار میں

گل کر دیا چراغ تمنا بجھا دیا — میری طرف سے اس کو کسی نے لگا دیا

غرض اس سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ دکن میں بھی ایسے باکمال موجود تھے۔ جن کا تذکرہ شعر الہند میں ضروری تھا۔ اگر ان کی مزید صراحت کی ضرورت ہو۔ تو ناچیز کی تالیف "دکن میں اردو" ملاحظہ فرمایئے [1]

(۷) تلامذہ داغ اور امیر کا خاص عنوان بھی مقرر کیا گیا ہے صفحہ ۳۲۴ امیر بھی زندگی کے آخری حصہ میں اور داغ ایک عرصہ تک حیدر آباد میں مقیم رہے

[1] جس کا اب تیسرا ایڈیشن بہت کچھ ترمیم اور اضافہ کے بعد شائع ہوا ہے۔

جس کے باعث یہاں کئی ایک نامور شاگرد ہوئے۔ مگر افسوس ہے کہ شعرالہند کے صفحات میں کسی کا نام نظر نہیں آیا۔ داغ کے شاگردوں میں حضرت آصف کیفی۔ امیر۔ مزاج۔ آزاد وغیرہ ایسے افراد ہیں، جن کا کلام مشہور زمانہ ہے، اسی طرح امیر کے شاگرد مولوی عبدالواسع صفا اور اختر وغیرہ ہیں:۔

یہ موقع نہیں کہ ان اصحاب کے کلام پیش کئے جائیں۔ مگر بطور نمونہ صرف آصف کے ایک دو شعر درج کئے جاتے ہیں۔

حضرت آصف

واہ اے شان کریمی ترے صدقے قربان　　جس گنہگار کو دیکھا وہ گنہگار نہ تھا

یہ شب وصل ان کو حسرت ہے　　شام ہوتے ہی کیوں سحر نہ ہوئی

مقابل یوں ملے جب حسن کی داد　　ادھر یوسف ادھر بے پردہ تو ہو

خون ناحق دل کا نہ چھوڑا رکھتے ہی سینہ پہ ہاتھ　　واہ واہ دزد حنا کیا ہاتھ کا چالاک تھا

کبھی نہ دب کے ملیں گے ہم ان سے اے آصف   وہ شاہ حسن سہی شہریار ہم بھی ہیں

کیفی مرحوم

نہ یہ محتسب کا ہے نہ یہ رندوں کا ساغر ہے   یہ میرے دل کا چھالا ہے نہ پھوٹا ہے نہ پھوٹے گا

نزاکت کا برا ہو وہ سنورنے بھی نہیں پاتے   بڑی مشکل سے زلف عنبریں تک شانہ آتا ہے

مار ڈالا مار ڈالا لٹ گئے ہم لٹ گئے   تان لے چھتر تان لے منہ پر دوپٹہ تان لے

وہی کیفی وہی رستہ ہے آندھی ہو کہ بارش ہو   چلے آتے ہیں حضرت میکدے سے ایک ہی کن پر

محبت کے ہزاروں لطف کھوئے ناتوانی نے   تڑپنے کے ہیں سب ساماں مگر تڑپا نہیں جاتا

۸۱۔ چوتھے باب میں دور جدید کو بیان کیا گیا ہے۔ اس دور میں بھی اسی طرح حیدرآباد کے حقوق فراموش کر دیئے گئے ہیں۔ شاد کی صوفیانہ غزلیں۔ کیفی کی اخلاقی اور قومی نظمیں۔ امجد کی رباعیات اور نظمیں ذہن کی اخلاقی

نظمیں یہ سب خاص طور پر ذکر کے قابل تھیں مضمون کی طوالت کے خوف سے اُن کی مثالوں کو نظر انداز کرتا ہوں۔ دورِ جدید میں ان لوگوں نے جو بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ اس کا کامل ثبوت "دکن میں اردو" سے مل سکتا ہے۔

(۹) انگریزی نظموں کے ترجموں میں مولانا نظم طباطبائی کا خاص درجہ ہے مثلاً "گورِ غریباں" وغیرہ اس کا ذکر بھی نہیں کیا گیا۔

غرض اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں۔

بہرحال اگر ان فروگذاشتوں سے قطع نظر کریں۔ جو کتاب کی کامل کامیابی میں حائل ہیں، تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ اب تک اردو کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں۔ اُن میں یہ تذکرہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اور ان سے کہیں زیادہ معلومات و تحقیقات پر حاوی ہے۔ خاص طور پر یہ امر غنیمت ہے۔ کہ اس کے مؤلف نے دکن کو قابلِ لحاظ سمجھا اور اگرچہ اُسے اردو کی تاریخ میں وہ مستقل درجہ نہیں دیا جس کا وہ اپنی کارگذاریوں کے لحاظ سے مستحق ہے اور اس کا ذکر اس شرح و بسط سے نہیں کیا جس کی اردو کی ایک مجموعی تاریخ سے توقع

ہونی چاہیئے تھی۔ تاہم اس کے ذکر کو اس قابل سمجھا۔ کہ اس کتاب میں شامل
کر لیا۔

ابھی دیکھئے وہ دن کب آتا ہے۔ جب دکن کے حقوق پورے تسلیم کئے
جائیں گے۔ بہرحال آثار موافق حال ہیں۔

(رسالہ ہزار داستان لاہور جلد نمبر ۲ نمبر ۱۴، ۵)

انڈیا آفس کی کیٹلاگ میں
دکھنی مخطوطات کی فروگذاشتیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوم ہارٹ نے انڈیا آفس کی ہندوستانی مخطوطوں
کی کیٹلاگ نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کی ہے اور بہترین معلومات
کو جمع کر دیا ہے، مگر جہاں یہ کوشش قابل ستائش ہے وہاں چند فروگزاشتیں
بھی ہوئی ہیں، مخطوطوں میں سب سے قدیم دکھنی کہے جا سکتے ہیں، ان کے متعلق
میں نے کسی قدر تفصیل سے کام کیا ہے۔ دوران ریسرچ میں مجھ کو ان کے
متعلق جو فروگزاشتیں معلوم ہوئیں، یہاں ان کی صراحت کی جاتی ہے

چونکہ ترتیب کیٹلاگ میں کسی دکھنی تذکرہ سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے
اس لئے فروگزاشتوں کا ہونا ناگزیر تھا، ان میں سے گو بعض تو نہایت معمولی
ہیں، ان کو کوئی اہمیّت نہیں دی جا سکتی۔ مگر بعض کو نظر انداز نہیں کیا
جاسکتا، ذیل میں ان کی صراحت کی جاتی ہے۔

ان فروگزاشتوں کے متعلق زیادہ مناسب تصوّر کرتا ہوں۔ کہ دیگر ذرائع
کے بجائے خود اس کتاب سے روشنی ڈالی جائے،

اولاً ان فروگزاشتوں کو بیان کرتا ہوں۔ جو زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور
جس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

ا۔ "امواج خوبی" (نمبر ا صفحہ ا) اس کے متعلق لکھا گیا ہے۔ کہ دکھنی زبان
میں ہے (سطر ۵)۔ مگر خود کتاب کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے۔ کہ یہ
دکھنی نہیں گجراتی ہے۔ چنانچہ ذیل کی عبارتیں ملاحظہ ہوں:۔

"دریں کلام ہیچ سخن گیری یا عیب جوئی دردل کذانید کہ خوب
بخطاب خوبی مصنف مثنوی متن بزبان گجراتی است ترجمہ شرح
نمائی آں مثنوی بزبان فارسی خواہد گفت"۔ (ص ۲۹)

"مجرعہ دریا نما از دطم برموجیکہ زد جمع کردم دریں مثنوی گجراتی راخطاب

خوب ترنگ درم"

"ہر یک شعری بزبانِ خود تصنیف کردہ اند و میکنند من بزبان گجراتی

کہ بہ الفاظ عربی و عجمی آمیز است ہمچناں گفتم عیبش مکنند کہ لفظ را تغیر

دادہ نیاوردہ ام"۔

ان عبارتوں سے بخوبی ظاہر ہے۔ کہ "امواج خوبی" دکھنی زبان میں نہیں ہے

چنانچہ خود ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کو گجراتی ظاہر کیا ہے، مؤلف "پنجاب میں اردو" نے بھی

اس کو گجراتی بیان کیا ہے، حال میں رسالہ اردو (اورنگ آباد) میں مولوی عبدالحق

صاحب نے اس کتاب کے متعلق تفصیل سے بحث کی ہے۔

ب۔ اس مخطوطے کے کاتب کا نام ملا مدّد لکھا گیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

بلکہ مخطوطے میں "ملا مدّد" لکھا ہوا ہے، جو غالباً محمد سے مشتق ہے۔ آج کل بھی کہنی

دیہات میں "مدّد" نام سنا جاتا ہے۔ لفظ محمد کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے،

کہ اسی جلد میں ایک اور کتاب اسی خط کی شامل ہے اور کاتب کا نام محمد لکھا

ہوا ہے۔

(۲) "خاور نامہ" (نمبر ۵۳ صفحہ ۱۶) اس کو تاریخ میں رکھا گیا ہے، حالانکہ تاریخ

سے اس کو کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ایک فرضی داستان ہے، اور نفس مضمون

کے متعلق جو صراحت کی گئی ہے ۔ وہ تشفی بخش نہیں ۔ بلکہ غلط فہمی پیدا کرتی ہے،
چنانچہ ایک انگریز پروفیسر صاحب کو بھی اس کے نفس مضمون کے متعلق یہی خیال
تھا ۔ کہ حضرت علی رضؓ کی خلافت کے کارناموں پر مشتمل ہے ۔

درحقیقت یہ کتاب واقعاتِ خلافت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، اس میں
داستان امیر حمزہ کی طرح ایک فرضی داستان ہے جس کے ہیرو حضرت علیؓ
ہیں ۔ اس میں داستان امیر حمزہ کی طرح خلاف قیاس امور دیووں اور پریوں
وغیرہ کے حالات طلسم کشائی وعیاری وغیرہ کا ذکر ہے ۔

اگرچہ فرضی داستان ہے ۔ مگر رزمیہ مثنوی ہونے کے باعث قابلِ قدر
ہے اور پھر حجم کے لحاظ سے زبان اردو کی آج تک معلوم شدہ مثنویوں میں سب سے
بڑی ہے، اس امر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دکھنی زبان میں ابتدا ہی سے
رزمیہ مثنویوں کی جانب توجہ کی گئی تھی ۔

۳ ۔ "علی نامہ" (نمبر ۳۶ صفحہ ۱۶) اس کے مصنف کے متعلق کچھ بھی وضاحت
نہیں کی گئی ہے، صرف تخلص اور اس کی دوسری تصنیف گلشن عشق کے ذکر
پر اکتفا کیا گیا ہے، علاوہ ازیں اس کی تاریخ تصنیف صحیح نہیں لکھی گئی ہے
بلوم ہارٹ ہی نے برٹش میوزیم کی کیٹلاگ میں اس کے مصنف کو ہندو لکھا ہے

آخر الذکر کے غلط ہونے کے متعلق میں نے اپنے نوٹ متعلقہ برٹش میوزیم میں صراحت کی ہے اور ان کے تصانیف وغیرہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

"نصرتی" کی تصنیف "گلشن عشق" کے سنہ تصنیف کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں ہے جو سنہ ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء ہے اور خود نصرتی کے کلام سے اس کی تائید اور توثیق ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:-

کیا اس کی تاریخ یوں ہجرتی　　مبارک یوہی ہار یہ نصرتی

مگر "علی نامہ" کے سنہ تصنیف کے متعلق اختلاف ہے، بلوم ہارٹ نے سنہ ۱۰۷۱ھ لکھا ہے (صفحہ ۱۶ سطر ۹) نہیں معلوم یہ صراحت کس بنا پر کی گئی ہے،

"علی نامہ" میں ملناڑ کی فتح کا قصیدہ شامل ہے اور یہ فتح سنہ ۱۰۷۴ھ میں ہوئی ہے۔ اس سے قیاس ہو سکتا ہے۔ کہ علی نامہ اس کے بعد مرتب ہوا ہوگا چنانچہ برٹش میوزیم کے مخطوطے سے اس کی تصنیف سنہ ۱۰۷۶ھ ظاہر ہوتی ہے، اس کی توثیق میں ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں،

لکھا شہ کا میں جب جو یو کر ادس　　ہزار یک ہو ستر پہ تھے چھ برس
ولی یہی ہوں یو حق تے امیدوار　　کہ شہ جم جیو فتح پانی آپار

. . . .

الا نصرتی ختم کر یو کلام دعا سوں کہ تج مدعا ہے تمام

مصنف کیٹلاگ کتب خانہ ٹیپو سلطان نے اس کی تصنیف کا سنہ نہیں دیا ہے، ڈاکٹر اسپرنگر نے صرف گلشن عشق کی صراحت کی ہے،

۴۔ مجموعۂ مثنویات (نمبر ۱۲۲ اص ۱۶۴) اس مجموعہ میں تین مثنویاں ہیں جن میں سے دو کے نام اور مصنف کے نام ظاہر کئے گئے ہیں۔ مگر تیسری بلا صراحت ہے۔ جو مثنویاں نام کے ساتھ درج ہیں۔ وہ :۔

ا۔ مثنوی پھول بن

ب۔ مثنوی روضۃ الشہدا ہیں۔

تیسری کتاب جو بلحاظ سلسلہ II ہے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مگر افسوس کہ کیٹلاگ سے کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی، اس مثنوی کا نام درج ہے اور نہ مصنف کا، لہذا اس کی صراحت کی جاتی ہے،

قطب مشتری میں جو بولیا کتاب ہوئی جگ میں روشن جیوں آفتاب

اس مثنوی کا مصنف وجہی ہے، اشعار ذیل سے اس کی بخوبی تائید ہوتی ہے،

وجہی ترا ذہن جیوں برق ہے تجھی ہور بعضیاں میں کئی فرق ہے

تو وجہی کھیا شعر کئی دھات کا ہوا زیادہ سنتے تجھ مزابات کا

وجہی کا نام غالباً وجہ الدین ہے، قطب شاہی دور کا ممتاز شاعر تھا، اپنی مسلمہ قابلیت نظم و نثر کے باعث دربار سلطانی میں اعزاز رکھتا تھا، اس کی ممتاز حیثیت کا ثبوت خود اس سے مل سکتا ہے۔ کہ اس مثنوی میں ہیرو وَلی عہد سلطنت کو قرار دیا ہے۔

اس کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے ہمعصر شاعر غواصی سے اس کی نوک جھوک ہوا کرتی تھی۔

وجہی کے دو تصانیف کا پتہ چلتا ہے:-

۱۔ مثنوی قطب مشتری جس کو اس نے قلی قطب شاہ کے عہد ۱۰۱۸ھ میں لکھا ہے

۲۔ سب رس جو نثر میں ہے، اس کو عبداللہ قطب شاہ کے عہد ۱۰۴۵ھ میں لکھا ہے

کیٹلاگ میں اس کتاب کے ۵ صفحے بتائے گئے ہیں، حالانکہ (۶۴) صفحے ہیں۔

(۵) قصہ سیف الملوک (نمبر ۹۹ صفحہ ۵۲) اس کے متعلق تین امور اصلاح طلب ہیں

(۱) غواصی کے متعلق لکھا گیا ہے۔ کہ شیعہ تھا،

(۲) سلطان عبداللہ قطب شاہ کا دور حکمرانی غلط لکھا گیا ہے۔

۳۔ تاریخ تصنیف سیف الملوک،

غواصی کا شیعہ ہونا نہیں معلوم بلوم ہارٹ نے کس طرح معلوم کیا ہے، کوئی ثبوت تائید میں بیان نہیں کیا گیا،

غواصی کے کلام سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ کہ یہ شیعہ نہیں تھا، بلکہ سنی تھا خلفائے راشدینؓ اور شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کے علاوہ برٹش میوزیم کے ناقص نسخہ میں حسب ذیل شعر ہے۔ جو غواصی کے مذہب پر کافی روشنی ڈالتا ہے

فدا ہوں انکی ولیوں کے اوپر   سنو رافضی خارجی کاٹ کر

غواصی کے حالات بہت کم معلوم ہوئے ہیں۔ مگر کیٹلاگ تو بالکل ساکت ہے

غواصی دور قطب شاہی کا نامور باکمال شاعر ہے اس کی قابلیت کی تعریف ملک الشعرا بیجاپور نصرتی نے گلشن عشق میں کی ہے، اب تک اس کی دو تصانیف کا پتہ چلا ہے۔

ا۔ سیف الملوک و بدیع الجمال۔

ب۔ طوطی نامہ،

اول الذکر ۱۰۳۵ھ میں آخر الذکر ۱۰۴۹ھ میں مرتب ہوئی ہے۔

طوطی نامہ کا ذکر اسپرنگر نے بھی کیا ہے، اس کی کٹیلاگ میں

یہ کتاب موجود ہے، مگر ان کے حالات پر اس نے بھی کچھ روشنی نہیں ڈالی ہے

ڈی ٹاسی نے بھی طوطی نامہ کا ذکر کیا ہے، مگر ان میں سے کسی نے بھی سیف الملک کا ذکر نہیں کیا ہے۔

سیف الملک کا ایک نسخہ مکمل اور ایک ناقص نسخہ برٹش میوزیم میں ہے انڈیا آفس کے نسخہ میں بعض اشعار موجود نہیں ہیں۔

ب۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کا زمانۂ حکومت ۱۰۲۰ھ سے شروع نہیں ہوتا جیسا کہ بلوم ہارٹ نے لکھا ہے۔ بلکہ ۱۰۳۵ھ سے سلطان کی حکمرانی کی ابتدا ہوتی ہے چنانچہ یہی سنہ قبر کے کتبہ پر درج ہے۔

ج۔ اس کے سنہ تصنیف کے متعلق بھی اختلاف ہے، انڈیا آفس کے نسخہ میں تو سنہ تصنیف والا شعر ہی نہیں ہے۔ برٹش میوزیم والے سے ۱۰۲۵ھ ظاہر ہوتا ہے اور مطبوعہ نسخہ سے ۱۰۲۷ھ مگر یہ دونوں اس لئے صحیح نہیں ہیں کہ اس زمانہ میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی نہیں ہوئی تھی، چونکہ اس میں سلطان کی مدح بہ حیثیت بادشاہِ وقت درج ہے، اس لئے یقیناً اس کی تصنیف سلطان کی تخت نشینی کے بعد ہوئی ہوگی، اس لحاظ سے اس کی تاریخِ تصنیف ۱۰۳۵ھ صحیح ہے، چنانچہ چند دیگر نسخوں[1] سے اس کی تائید بھی ہوتی

---

[1] ملاحظہ ہو مخطوطہ کیمبرج یونیورسٹی ہے۔

ہے جس میں شعر اس طرح درج ہے:-

برس یک ہزار او رپنج تیس میں　　کیا نظم یو ختم دن تیس میں

برٹش میوزیم والی میں جو "پنج بیس" درج ہے، وہ کاتب کی سہو معلوم ہوتی ہے
بہرحال اس کی تصنیف ۱۰۳۵ھ میں ہوئی ہے۔

۶- روضتہ الشہدا (نمبر ۲۱۱ صفحہ ۵۹) اس کے متعلق بھی تین فرو گذاشتیں ہوئی ہیں،

ا- اس کو ولی گجراتی کی تصنیف بتایا گیا ہے۔

ب- خود ولی گجراتی کے وطن کی صراحت غلط ہے۔

ج- تخلص کو "ولی شاہ" بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے اس امر کی وضاحت کرنی چاہیئے۔ کہ یہ اس ولی کی تصنیف نہیں ہے جس کا دیوان مشہور ہے۔ دکن میں ولی تخلص کے دو شخص ایک ہی زمانے میں گذرے ہیں، ولی اورنگ آبادی، ولی ویلوری،

روضتہ الشہدا در اصل ولی ویلوری کی تصنیف ہے، جیسا کہ مولانا محمد باقر آگاہ نے اپنی تصنیف ریاض الجنان کے دیباچہ میں ظاہر کیا ہے، چونکہ آگاہ کا زمانہ ولی ویلوری سے قریب تر ہے اور پھر خود آگاہ بھی ویلوری ہی کے ہیں۔ اس لئے روضتہ الشہدا کو ولی ویلوری کی تصنیف قرار دینا ضروری ہے۔

اسپرنگر کے کیٹلاگ میں یہ کتاب داخل نہیں ہے ، اسٹوارٹ ([illegible])
نے مصنف کے متعلق کچھ وضاحت نہیں کی ہے۔

علاوہ ازیں ولی جس کا دیوان مشہور ہے ، اس کے حالات عام طور سے معلوم
ہیں اور اکثر قدیم و جدید تذکرہ نویسوں نے اس کا ذکر کیا ہے ۔ مگر کسی قدیم دکنی
یا شمالی ہند کے تذکرہ نویس نے روضۃ الشہدا کو ولی کی تصنیف نہیں بتایا ہے

اس بیان سے واضح ہو سکتا ہے ۔ کہ روضۃ الشہدا ولی ویلوری کی تصنیف
ہے ۔ ان کے صحیح نام کے متعلق کسی قدر شبہ ہے مؤلف اردو کے قدیم نے محمد ولی حسن
ظاہر کیا ہے ، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سرورق پر میر ولی فیاض درج ہے
آگاہ نے نام کی صراحت نہیں کی ہے ۔

روضۃ الشہدا کی تصنیف ۱۱۳۰ھ میں ہوئی ہے ، جیسا کہ انڈیا آفس اور
رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخوں سے ظاہر ہوتا ہے ، چنانچہ ذیل کے شعر سے
اس کی پوری وضاحت ہوتی ہے ۔

کیا ہوں ختم جب یو درد کا فال   اگیارہ سو اوپر تھا تیسوں سال

اس کے بعد ولی گجراتی کے متعلق یہ صراحت کرنی ہے کہ ولی کو احمد آباد گجرات سے تعلق
نہیں تھا ، انکا اصلی وطن اورنگ آباد ہے ، ولی اورنگ آبادی کے وطن کے متعلق مختلف

اصحاب نے بحث کی ہے اور اس امر پر اتفاق رائے ہے کہ اورنگ آباد ان کا وطن تھا، چنانچہ حال میں مولف کلیات ولی نے بھی اس پر کافی بحث کی ہے اور ذیل کے اشعار ان کے دکھنی ہونے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں :-

یو مکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس　　ولی پروانگی کرتا تری ملک دکن بہتر

ولی ایران و توران میں ہے مشہور　　اگرچہ شاعرِ ملک دکن ہے

علاوہ ازیں خود انڈیا آفس کے ایک نسخہ سے ($\frac{115}{E.62}$) جس کو ابوالمعالی کے فرزند نے مرتب کیا ہے، ان کا دکھنی ہونا بخوبی ثابت ہوتا ہے، یہ ابوالمعالی وہی صاحب ہیں جن کے ساتھ ولی نے دہلی کا سفر کیا تھا۔

تیسری فروگذاشت یہ ہے کہ بلوم ہارٹ نے لکھا ہے۔ کہ شاعر نے خود کو "ولی شاہ" سے بھی موسوم کیا ہے (صفحہ ۵۹ سطر ۱۸) جس شعر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ حسب ذیل ہے۔

ولی شاہ ولایت سوں مدد منگ　　اتار کر مجلس ششم میں اہنگ

حالانکہ اس کا سرسری ملاحظہ بھی اس امر کو ظاہر کر دیتا ہے۔ کہ "شاہ" کی اضافت ولایت کی طرف ہے۔ نہ کہ ولی کی طرف، شاہ ولایت سے حضرت علیؓ مقصود ہیں

اگر ولی شاہ قرار دیا جائے ۔ تو پھر شعر کا مفہوم ہی حاصل نہیں ہو سکتا، بہر حال ولی شاہ نہیں ہے ۔ بلکہ "شاہِ ولایت" ہے ؛

(۷) قصۂ ملکۂ مصر (نمبر $\frac{43}{II}$ صفحہ ۱۳۵) اس کے مصنف اور مثنوی لال و گوہر کے مصنف کو ملا دیا گیا ہے (نمبر ۱۰۰ صفحہ ۵۸) حالانکہ دو جدا شخص ہیں

قصۂ ملکۂ مصر کے مصنف کا نام سید محمود عاجز ہے اور مثنوی لال و گوہر کا مصنف عارف الدین عاجز ۔

عارف الدین عاجز کے حال میں ان کے معاصر تذکرہ نویس "شفیق" نے صراحت کی ہے ۔ کہ ان کے باپ عالمگیر کے عہد میں ہندوستان آئے تھے، اس سے واضح ہو سکتا ہے ۔ کہ قصۂ ملکۂ مصر کی صراحت نہیں کی، ایک معاصر تذکرہ نویس سے ایسی غلطی نہیں ہو سکتی، غرضکہ ملکۂ مصر کا مصنف ایک علیحدہ شخص ہے اور لال و گوہر کا علیحدہ،

(۸) مثنوی لال و گوہر (نمبر ۱۰۰ صفحہ ۵۸) یہ دوسرے عاجز یعنی عارف الدین خان کی تصنیف ہے ۔ ان کے باپ عالمگیر کے عہد میں بلخ سے آئے تھے، عارف الدین کی پیدائش ہند میں ہوئی، نواب نصرت جنگ لشکر خاں کے توسط سے دربار آصف جاہی میں باریاب ہوئے منصب عطا ہوا اور فوج کے بخشی قرار پائے، فارسی اور اردو

میں شعر کہا کرتے، تاریخ گوئی کا خاص ملکہ تھا، ۱۱۸۷ھ میں انتقال ہوا،

(از چمنستان شعرا)

اسپرنگر نے لال گوہر کے مصنف کے ذکر میں صرف عاجز پر اکتفا کیا ہے۔ مزید صراحت نہیں کی،

مصنف کیٹلاگ کتب خانہ ٹیپو سلطان نے تخلص بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔

اسی مخطوطے کے ضمن میں بلوم ہارٹ نے ملکۂ مصر اور قصۂ فیروز شاہ کو ایک ہی ظاہر کیا ہے (صفحہ ۵۹ سطر ۲) حالانکہ یہ صحیح نہیں جیسا کہ قبل ازیں بتا یا گیا۔

(۹) قصۂ ابو شحمہ (نمبر ۱۷ صفحہ ۳۴) اس کے متعلق بتایا گیا ہے۔ کہ یہ فارسی کا ترجمہ ہے جس کو مصنف نے اپنی سولہ سالہ عمر میں سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے زمانہ میں لکھا تھا (سطر ۱۶)

یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ خود کتاب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کی تصنیف سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ہوئی تھی، چنانچہ ذیل کے مدحیہ اشعار سے اس کی تائید ہو سکتی ہے:۔

حسن شاہ عبداللہ آفاق گیر کہ سارے جہاں میں سو توں ہے کبیر

توں ہیں گیان و تیلہے عالی توں خدا نے دیا تجھ معانی فضل

ترا ناؤں شاہاں میں معمور ہے ترا گھر گ ساریاں میں مشہور ہے

امید ہے مجھ کون کرے سب قبول

زبرکت محمد و آل رسول

اور پھر دکھنی ترجمہ کا مصنف وہی امین نہیں ہے جس نے اس کو فارسی میں لکھا تھا، چنانچہ ذیل کے اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فارسی قصہ ابو شحمہ کا مصنف ایک دوسرا امین ہے :-

اتھاواں عمل یو قصا فارسی	نظم خوش دعا دل کا ہے آرسی
سما یا اس میں جو عینک کے سا	نزاکت لطافت میں ہے خوش نگا
یو تصنیف نصیحت ہے اللہ کا	کی سو مدت پائے اللہ کا
تخلص انو کا جو نامی اہے	یو تا میں تخلص کر امین اہے
پڑتی انھی دور یو اس وقت پر	اتھی ان کی سولا برس کا عمر
یو دل کی صدق سوں اپی ہو غواص	نیکالی یو موتیاں عجب نیک خاص
دیکھا میں قصا یو لطافت بھریا	لطافت بھریا ہور نزاکت بھریا
شکر میں جو کرتا ہوں اس بات پہ	قصہ یو پورا ہوی مری ہات پر

. . . .

خدا مدت منجہ ہدایت ہوا بڑی فکر سوں میں مرتب کیا

البتہ اس دکھنی ابوشحمہ کی تصنیف سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کا سنہ تصنیف ۱۰۹۰ھ ہجری ہے، جو ذیل کے اشعار سے واضح ہے اور اس زمانہ میں تاناشاہ حکمران تھا۔

برس یک ہزار ہور نود سال میں رجب کی تنادیس و بن رات میں

کہ توفیق خدا نے منجے جب دیا تداں یو قصا میں مرتب کیا

(۱۰) مثنوی پھول بن (نمبر ۱۰۳ صفحہ ۵۵) اس کی تفصیل میں جو شعر صفحہ ۵۵ کے آخر درج ہوا ہے، وہ غلط ہے، دراصل "تیں پر چار" ہونا چاہیئے۔ نہ کہ "تین پر چار"۔

مگر سب سے بڑی فروگذاشت جو اس مخطوطے کے متعلق ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ابن نشاطی کے اصل قصہ کا اضافہ جو قلعہ دار ان سدھوٹ کے زمانہ میں محمد حیدر جعفر نے کیا ہے، اس کی صراحت کیٹلاگ میں نہیں ہے، حالانکہ اس کی وضاحت نہایت ضروری تھی۔

محمد حیدر ابن جعفر قلعہ دار سدھوٹ نواب عبدالحمید خان کے دربار کا شاعر تھا، ان کے عہد میں عبدالکریم کے ایما سے (۳۰۰) سے زیادہ شعر اس نے

اضافہ کیے ہیں جس میں "سنمبر" کے شادی کے حالات مذکور ہیں، چنانچہ اس کی تائید ذیل کے اشعار سے ہوسکتی ہے۔

"و عبدالحمید ہے نام اس کا — عدل انصاف ہے جم کام اس کا

. . . .

کریم صاحب اہے اس نیک کا نام — اہے جیون نام ان کا نیک نام

کریم ان کو دیا ہے نام بھی نیک — دیا ہے اس موافق کام بھی نیک

اچھے قصیاں سے ان کو اد ک ذوق — کھانیاں سوں اچھی وہن آتے ہے شوق

قصّے کون پھول بن کے دو ہتی جب — بچارے یوں آپس دل انو تب

حکایت ہے سنمبر کی بھوت خوب — سگل اس کا بیان ہے بھوت مجبوب

ولی نہیں بھاؤ کا مذکور ہے کچ — نہ ہلدی تیل کا دستور ہے کچ

کچ یک شمہ سخن کا مج منی پائی — سوں یوں اس بھاؤ کا مج حکم فرمائی

. . . .

کرے جب حکم سوں یوں مج سرفراز — حکم پر ہین کیا گنج سخن باز

محمد حیدر خود کو ابن جعفر سے مخاطب کرتا ہے، چنانچہ کہتا ہے:-

ختم کر ابن جعفر گوش توں دھر — اتار ابن نشاطی کے بچن پر

محمد حیدر کا اضافہ ابن نشاطی کے ذیل کے شعر کے بعد ہوا ہے :-

عدالت کا رکہ اپنی سیس پر تاج   فراغت سوں سدا کرتا رہا راج

یہ اضافہ شدہ اشعار ہندوستان کے کسی نسخہ میں میری نظر سے نہیں گذرے اور خود انڈیا آفس کے دوسرے نسخہ (نمبر ۱۲۲ صفحہ ۱۶۴) جو ۱۱۳۴ھ میں لکھا گیا ہے، موجود نہیں ہیں، علاوہ ازیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخہ میں بھی یہ عدم موجود ہیں، انڈیا آفس والا نسخہ بہت ممکن ہے کہ قلعداران سدھوٹ کا اصلی نسخہ ہو، یہ نسخہ میسور کی فتح کے بعد یہاں آیا ہے، مخطوطے کا مطلا کام وغیرہ اس کی تائید بھی کرتا ہے۔

افسوس ہے کہ ابن نشاطی کے حالات بھی گوشۂ گمنامی میں ہیں، اسپرنگر اور ڈی ٹاسی وغیرہ نے بھی اس پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔

ابن نشاطی بھی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا باکمال شاعر ہے اس کے تفصیلی حالات گوشۂ گمنامی میں ہیں۔

(۱۱) قصۂ چندر بدن و مہیار (نمبر ۱۰۰ صفحہ ۵۳) اس کے مصنف کا نام عزیز بتایا گیا ہے، حالانکہ یہ عزیز کی تصنیف نہیں۔ بلکہ مقیمی کی تصنیف ہے اور خود مصنف نے متعدد جگہ اپنے تخلص کو ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو :-

مقیمی بچن کا تزنک سار توں　　بسر کر چلیا کان توں مہیار کون

شرح مست مقیمی پرت مہیار کا　　قصہ کرتوں پورا مہیار کا

دنیا تو فنا ہے مقیمی سہی　　رہے گی بچن کی نشانی رہی

علاوہ ازیں ڈاکٹر اسپرنگر نے بھی اس کو مقیمی کی تصنیف بتایا ہے (ص ۶۲۵)
قصہ کی جو صراحت کیٹلاگ میں ہوئی ہے، وہ بھی نظر ثانی کی محتاج ہے
در اصل قصہ اس طرح نہیں ہے جیسا کہ کیٹلاگ میں مذکور ہے۔
مقیمی عادل شاہی شاعر ہے جو محمد عادل شاہ کے دور میں تھا۔

(۲) منطق الطیر (نمبر ۱۲۱ صفحہ ۶۳) اس کے مصنف کا نام بھی غلط ظاہر کیا گیا ہے
یہ وجدی کی تصنیف ہے جن کا نام وجہ الدین تھا، ان کی تین مثنویاں مشہور
ہیں۔

(۱) تحفۂ عاشقاں جس کی تصنیف ۱۱۵۰ھ میں ہوئی ہے۔
(۲) منطق الطیر جس کا نام پنچھی باچہ بھی ہے، یہ ۱۱۳۱ھ میں مرتب ہوئی ہے،
(۳) مثنوی باغِ جان فزا جو ۱۱۴۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے

منطق الطیر شیخ فریدالدین عطار کے منطق الطیر کا ترجمہ ہے۔ یہ بمبئی میں طبع ہوا ہے۔

کتاب کے نام اور وجدی کے ثبوت میں ذیل کے اشعار دیکھو:-

ناؤں اس کا میں پنچھی باجا کیا   یادگاری خلق عالم پر رکھا

یوں دعا مانگی ہے گرچہ شیخ آپس   بخش وجدی کوں بھی اے فریاد رس

جیسے خلاصی منکروں بھی دوزخ کی ہوئی   اسرار وجدی کوں نہیں تجھ باج کوئی

(۱۳) پدماوت (نمبر ۷۳ صفحہ ۳۶) اس مخطوطے کے ضمن میں بہت کچھ صراحت کی جا سکتی تھی۔ جو وضاحت مخطوطے نمبر (۶۹ صفحہ ۸۶) میں کی گئی ہے۔ اس میں اس کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔

علاوہ ازیں چند دیگر فارسی اور دکھنی مخطوطوں کا ذکر ضروری تھا، لہذا ان کی پوری صراحت کی جاتی ہے۔

پدماوت کے قصہ کو اولاً ۹۴۷ھ میں ملک محمد جائسی نے شیر شاہ سوری کے حکم سے "بھاکا" میں مرتب کیا تھا، اس کے بعد مختلف شاعروں نے اس کو

فارسی نظم میں منتقل کیا چنانچہ اس کی صراحت درج ذیل ہے ۔

ا ۔ شیخ محمد بزمی نے ۱۰۲۸ھ میں بعہد جہانگیر بنام "پدماوت" مرتب کیا ۔ یہ نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے ۔

ب ۔ عاقل خاں رازی نے ۱۰۶۹ھ میں بنام "شمع و پروانہ" اس کو نظم کیا ۔ یہ بھی انڈیا آفس میں موجود ہے ۔

ج ۔ ۱۰۷۱ھ میں حسام الدین نے بنام حسن وعشق اس کو نظم کا جامہ پہنایا ۔ یہ برلن میں ہے ۔

ان نظموں کے علاوہ لچھمی رام متوطن ابراہیم آباد نے قصۂ فرح بخش کے نام سے رازی کے شمع پروانہ کو فارسی نثر میں مرتب کیا، یہ نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر 8918 ADD پر موجود ہے، دکھنی زبان میں اس کو دو شاعروں نے نظم کا جامہ پہنایا ہے ۔

ا ۔ زیر بحث مخطوطہ جس کو غلام علی نے سلطان ابوالحسن تانا شاہ قطب شاہی دور کے آخر فرمانروا کے عہد میں بنام پدماوت مرتب کیا ہے ۔ اس مخطوطے میں بادشاہ کی مدح بھی درج ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو :۔

یو بعد از کردں ہیں ثنا چہار یار کا — شہی بوالحسن اولیا جاہ کا

کتک شاہ اس کا عدالت دکھیت — ہوئے ظلم سٹ دیکھ عادل نپٹ

سخاوت میں مشہور جوں آفتاب | مگر حق او تاریلہے اوسکی باب
ہر یک علم میں ہور بلاغت منی | نہیں کوئی ہم تا شجاعت منی
سزاوار اچھو اس کی جم یوراج | مبارک اچھو سلطنت تخت و تاج

یہ کتاب کتب خانہ ٹیپو سلطان میں موجود تھی جیسا کہ کیٹلاگ مرتبہ اسٹوارٹ کے نمبر XII سے واضح ہے۔

انڈیا آفس کا یہ نسخہ نامکمل ہے۔ یورپ کے دیگر کتب خانوں میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے :-

ب۔ اس قصہ کو ولی ویلوری نے بنام "قصہ رتن و پدم" منظوم کیا تھا اور یہ کتب خانہ شاہان اودھ میں موجود تھا۔ جیسا کہ اسپرنگر نے صراحت کی ہے (ص ۶۴۱)

"شمع پروانہ" "رازی" "پدماوت" "بزمی" "فرح بخش" "لچھمی رام" "ملل شمع و پروانہ" "عبرت اور پدماوت غلام علی" کا میں نے مقابلہ کیا، ہر ایک کے قصہ کی صراحت میں کمی و بیشی پائی جاتی ہے، اس کی پوری صراحت کا یہ موقع نہیں ہے، اس کی صراحت میں انشاء اللہ اپنی تالیف میں کروں گا۔

اسٹوارٹ اور اسپرنگر دونوں نے مصنفین کے متعلق کوئی وضاحت نہیں

کی ہے' اور نہ ڈی ٹاسی نے اس کے متعلق کچھ لکھا ہے۔

(۱۴) دیوان سراج (نمبر ۲۱۹ صفحہ ۱۰۸) اگرچہ یہ سراج کے دیوان کا ایک مختصر سا انتخاب ہے۔ مگر سراج کے متعلق صراحت ضروری تھی۔ کیونکہ یہ دکن کا ایک مشہور باکمال شاعر تھا۔

سراج کا نام سید سراج الدین ہے' اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۲۷ھ میں تولد ہوئے' ۱۱۷۷ھ میں انتقال ہوا' دیوان' کلیات اور ایک مثنوی بوستانِ خیال اپنی یادگار چھوڑیں' سراج پر گو شاعر تھے' صرف چار سال کے عرصہ میں دیوان مرتب کیا' ان کی زندگی میں ہی ان کے کلام نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی' مضامین کی شگفتگی اور خیالات کی بلندی کے ساتھ کلام کی سادگی اور صفائی سے حیرت ہوتی ہے۔ کہ اس قدر صاف زبان جو آج بھی مستعمل ہو سکتی ہے کس طرح احاطۂ تحریر میں آئی۔

۱۵۔ مثنوی عشق صادق (نمبر ۳۲۱/۱۱ صفحہ ۲۷) اس کے مصنف ضعیفی کے تخلص ظاہر کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مثنوی کا کوئی نام نہیں ہے۔ مگر بلحاظ مضامین اس مثنوی کو "عشق صادق" کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ضعیفی کا نام شیخ داؤد ہے' آخر دور قطب شاہی کی یادگار ہیں' عالمگیری

عہد میں بھی موجود تھے، ان کی ایک دوسری تصنیف "ہدایت نامہ" ہے، جس میں انہوں نے اپنے نام کی صراحت کی ہے اور عالمگیر کی مدح کی ہے۔ ہدایت نامہ سنہ ۱۱۰۰ھ میں لکھا گیا ہے ——————— (از رسالہ تجلی جلد ۲ نمبر ۳)

(۱۶) "ظفر نامہ" (نمبر ۱۰۹ صفحہ ۵۸) اس کے متعلق جو فروگذاشت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ کٹیلاگ سے معلوم نہیں ہوتا۔ کہ یہ مثنوی سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں تصنیف ہوئی ہے، حالانکہ خود مصنف نے اس کی صراحت کی ہے، چونکہ دیگر مثنویوں میں اس کی صراحت کی گئی، لہذا اس کے متعلق بھی ضروری تھا۔ خصوصاً جب کہ مصنف کو اس امر کا دعوے ہے کہ ان کی تصنیف "شاہ نامہ" فردوسی سے ممتاز ہے۔ خاتمہ کے اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

کہ فی الجملہ کر بوتا ہوں عیاں   مرتب کیا ہور کہاں سو بیاں

تھا جب دور سلطان شہ بوالحسن   شہر حیدر آباد ان کا وطن

کیا تب ظفر نامہ کا میں بنا   مرتب کئے لک سونا چپ رہا

محرم کا جب بدر پورا ہوا   ظفر نامہ کا تب ظہور ا ہوا

. . . .

ہوں سلطان عبداللہ کے دور کا   شجاع ہور سخی ہور بڑی تور کا

تاریخ تصنیف بھی خود انہوں نے بیان کر دی ہے۔

سنہ یک ہزار و نود پانچ پر،   بنا کر مرتب کیا یو اچھر

۱۷۔ قصیدۂ بردہ (نمبر ۳۲ صفحہ ۱۱۴) اس کتاب کے ضمن میں بتایا جا سکتا تھا۔
کہ کہاں اور کب مرتب ہوئی، خود کتاب سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ بادشاہ عبداللہ
کے عہد میں مرتب ہوئی ہے یہ اور ان کا خاندان نواب عبدالنبی خاں، عبدالحمید خان
عبدالکریم خان وغیرہ سدھوٹ کے قلعہ دار تھے، مگر ان کی حالت خود مختاری
کی سی تھی۔ یہ بڑے علم دوست تھے۔ ان کے زمانہ میں دکھنی زبان میں متعدد تصنیفات
ہوئیں۔ ولی ویلوری اسی خاندان کے دربار سے متعلق تھا جس نے روضۃ الشہدا
اور رتن و پدم تصنیف کیں، محمد حیدر نے ان ہی کے زمانہ میں ابن نشاطی کے
پھول بن کا اضافہ کیا جس کا ذکر گذر چکا اور قصیدہ بردہ کا ترجمہ ہوا۔ بہرحال
قلعہ داران سدھوٹ کے زمانہ میں علم و فن کی خاصی ترقی ہوئی ہے۔

(۱۸) دوازدہ مجلس (نمبر ۴۵ صفحہ ۲۷) اس کے دکھنی میں ہونے کی صراحت
کیٹلاگ میں نہیں ہے اور نیز مصنف کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے:۔
یہ بھی دکھنی زبان میں ہے اور اس کا مصنف "عطا" ہے جیسا کہ مندرجہ
نوحوں سے معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

قاسم کا آج پڑ گیا ماتم جہان میں　　خاموش لے عطا کہ وہ تو شاہ مر گیا

(۱۹) قصۂ حسینی د نمبر ۲۲۳ صفحہ ۱۲۲) اس مخطوطے کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے، مگر جیسا کہ خود اس سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام "قصۂ حسینی" ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:

دھرول نام قصۂ حسینی مگر　　یہی کہ کوئی ایسا نکتے بسیر
P 79 B

قصیاں ہیں قصایوا ہے ابدار　　حسینی قصۂ یوا ہے آبدار
P 80 A

کیٹلاگ میں اس کی تصنیف سنہ ۱۱۹۰ھ ظاہر کی گئی ہے، مگر ذیل کے شعر کے لحاظ سے میں سنہ ۱۰۹۰ھ قرار دیتا ہوں۔

تھے ہجرت نود پر ہزار یک سنہ　　گذر کے بنی ما فنا ہور رہسنہ
P. 146 B.

اور خود زبان کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطب شاہی دور کی تصنیف ہے۔

کیٹلاگ میں اس کے مصنف کا نام عزیز بتایا گیا ہے، مگر میری رائے میں عزیز صحیح نہیں ہے۔ بلکہ "خواص" معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ متعدد جگہ مذکور ہوا ہے اور اس طرح مذکور ہے جس سے قیاس ہوتا ہے۔ کہ یہی مصنف ہے۔

سنیا کان دھر جب بچن خواص لیو　　سرن کر کھیا نوں نپت داس ہو

بہو ویں خواص ہور عام کون فام یو ‌ ‌ رہین بعد میری میرا نام یو
P. 80A

رکھیں کبھی جرن پاس بنی خواص کے ‌ ‌ گل اندام نازک مشک باس کے
P. 146A

اے یاران سنو یہی علی خواص کے ‌ ‌ کیا صنعت جب ہیں ایسی ذات سکے
P. 145A

(۲۰) حیدر نامہ (نمبر ۲۴ صفحہ ۲۰) اس مخطوطے کا ایک مکمل نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر (۱۰۶ صفحہ) پر موجود ہے' انڈیا آفس کا نسخہ نامکمل ہے۔

(۲۱) قصہ بی بی مریم (نمبر ۳/۱ صفحہ ۳۵) اس کا بھی ایک نسخہ برٹش میوزیم کے (۱۷) پر موجود ہے۔ اس کی صراحت بھی ضروری تھی۔

(۲۲) جنگ نامہ (نمبر ۱۰۸ صفحہ ۵۷) کیٹلاگ میں جو اشعار اس کی تصنیف کے متعلق درج ہوئے ہیں۔ ان سے اصل مفہوم حاصل نہیں ہو سکتا۔ در اصل مخطوطے میں وہ اس طرح درج ہیں

یو جنگ عظیما کیا سر بہ سر ‌ ‌ تھی تاریخ تدھاں جان خیر البشر

یو سیوک تو ہجری کی سری سال تھی ‌ ‌ ہزار یک نو دو وکے ابرال تھی

(۲۳) ور مجالس (نمبر ۵۸ صفحہ ۸۱) اس مخطوطے کے متعلق جو اشعار کیٹلاگ میں درج ہیں وہ مقدم و موخر ہونے چاہئیں کیونکہ اصل مخطوطہ میں وہ اس طرح نہیں ہیں جس

طرح کہ کیٹلاگ میں درج ہوتے ہیں۔

(۲۴) بکٹ کہانی (نمبر ۱۶۹ صفحہ ۸۸) یہ مخطوطہ پنجابی زبان میں ہے جیسا کہ مولفؒ پنجاب میں اردو" نے تفصیل سے صراحت کی ہے علاوہ ازیں مخطوطے نمبر (۹۳ VII صفحہ ۱۴۸) کے اشعار سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ محمد افضل گوپال پنجابی تھا۔

چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

بکٹ افسانہ کا ہے یہ لو بھٹیا   دونوں کی تان جنا ہے دی سیا

اس افضل کہ جس کا نام گوپال   کہ تھا وہ نارنولی صاحب حال

P.77A

(۲۵) بوجھ نرنجن (نمبر ۱۴ صفحہ ۲) کیٹلاگ میں اس کو بھی "دکھنی" ظاہر کیا گیا ہے، حالانکہ طرزِ عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دکھنی نہیں۔ بلکہ شمالی ہند کی ہے،

۲۶۔ ایک عام فروگذاشت کیٹلاگ میں یہ ہوئی ہے کہ فنون کے لحاظ سے جو تقسیم کی گئی ہے، اس پر پوری توجہ نہیں کی گئی ہے، مثلاً خاورنامہ جو تاریخ نہیں ہے تاریخ میں رکھا گیا ہے اور فتح نامہ ٹیپو سلطان (۱۲۵) جو منظومات میں رکھی گئی ہے، تاریخ ہے، قصص کا عنوان علیحدہ رکھا گیا ہے اور منظومات کا علیحدہ، چند منظوم افسانے مثلاً (۷۱-۷۲-۷۳-۷۴) قصص کے تحت رکھے گئے ہیں اور چند مثلاً

(۹۹-۱۰۰-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۸-۱۰۹-۱۱۰) وغیرہ منظومات کے تحت، اس طرح بعض مذہبی نظموں کو منظومات کے تحت درج کیا گیا ہے اور بعض کو دینیات کے تحت مثلاً (۲-۳-۴)۔

یہ کل صراحت صرف ان مخطوطوں کی ہے جو کہنہ ہونے کے باعث میں نے دیکھے ہیں اس طرح ممکن ہے اور بھی فروگذاشتیں ہوئی ہوں[1]۔ (معارف ۱۹۲۹ء)

اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ کی چند قابل توجہ فروگذاشتیں

ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی جانب سے "اردو زبان اور ادب" کے نام سے ایک رسالہ گذشتہ سال شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ ہے جس کو کمیٹی مذکور کے صدر سید ضامن علی صاحب ایم۔ اے صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے مرتب فرمایا ہے۔

یہ رپورٹ بعض مخصوص وجوہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اول تو یہ کہ ہندوستان کے عظیم الشان طول و عرض میں اردو زبان کی تنہا یہی ایک اکیڈیمی ہے، دوسرے یہ کہ اردو کی ترقی کے لئے گویا یہ ایک دستور العمل ہے جس پر

---

[1] اس تنقید کے بعد اصلی کیٹلاگ میں تصحیح بھی کرادی گئی ہے۔

نہ صرف ممبران اکیڈیمی بلکہ تمام ہمدردان اردو عمل کریں گے۔ اس سے اس رپورٹ میں کسی قسم کی غلطی یا فروگذاشت کا ہونا نامناسب ہے۔ ذیل میں مختصر طور پر چند امور کا اظہار کیا جاتا ہے، جو میری تحقیقات کے لحاظ سے صحت طلب ہیں (۱) صفحہ (۱۱) میں بیان کیا گیا ہے۔

"دکن میں اردو نہ محض پورے طور پر بولی جاتی تھی۔ بلکہ رفتہ رفتہ ادبی زبان ہوگئی تھی اور ریختہ کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ فارسی اور ریختہ کا زبردست شاعر تھا۔"

اس صراحت سے عام طور پر یہ سمجھا جائیگا۔ کہ اردو زبان دکن میں ریختہ کے نام سے موسوم تھی۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہاں ولی اورنگ آبادی کے پہلے کسی نے بھی اس لفظ کا استعمال نہیں کیا ہے قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں اردو کو عام طور سے دکھنی یا ہندی سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ خاور نامہ میں کمال خاں رستمی کہتا ہے۔

کیا ترجمہ دکھنی ہور دلپذیر   بولیا معجزہ یو کمال خاں دبیر

مثنوی پھولبن میں ابن نشاطی کہتا ہے :-

اسے ہر کس کتے ہیں سمجھا کون توں بول دکھنی کے باتاں ساریاں کوں کھول

گلشن عشق میں نصرتی کہتا ہے :-

آ دیکھا ہو حد سوں کباب، رکھی بول اتنا جو دکھنی کتاب

میراں یعقوب کہتے ہیں :-

"اپنی حیات کے وقت مجھے ارشاد کئے تھے۔ جون شمائل الاتقیا کوں ہندی زبان میں لیا دے تا ہر کسی کو سمجھا دے"

ان عادل شاہی اور قطب شاہی نمونوں سے واضح ہو سکتا ہے۔ عام طور سے دکن میں اردو کو دکھنی یا ہندی کہا جاتا تھا۔ بلکہ اس کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد بھی جنوبی ہند میں اردو کو انہی ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ چنانچہ مولانا باقر آگاہ متوفی ۱۲۲۰ھ اپنی تصنیف ریاض الجنان میں لکھتے ہیں :-

"بعضے علما، ان مناقب اشرف کو فارسی کتابوں میں سیر کے درج کئے ہیں لیکن کوئی کتاب مستقل اس باب میں اب تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ پس تصنیف ہونا اس کا ہندی زبان میں معلوم۔ مگر گیلی ویلوری و شیدائے حیدرآبادی دکھنی زبان میں "نسخے منظوم لکھے ہیں"۔

باقر آگاہ کی دیگر تصنیفات سے بھی ان ہی ناموں کا پتہ چلتا ہے :-

نہ تھا شان میرے کا یہ اقتضا کہ ہندی زباں کا کرے اصطفا
ولے بعض یاروں کا ایما ہوا سو ہندی زبان یہ رسالہ ہوا

(رسالہ فرقہ ہائے اسلام)

ہے دکھنی میں مجکو مہارت بتی کہ النصر منکم کہے نصرتی

کیا نظم دکھنی میں فائز اسے سخن میں نہ تھی راہ ہرگز اسے

(تحفہ رضوان شاہ)

آگاہ کے بعد قاضی بدر الدولہ متوفی ۱۲۸۰ھ نے بھی لفظ اردو یا ریختہ کا استعمال نہیں کیا۔ بلکہ ہندی سے موسوم کرتے ہیں :-

"لیکن دیکھا۔ کہ بازار علم کا بہت کاسد ہو گیا اور علم کے جاننے والے دنیا سے گذر گئے . . . . اور کسی کو خواہش مند بھی نہیں پایا۔ تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا

(فوائد بدریہ)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن میں دکھنی یا ہندی نام تھا۔ ریختہ

کا نام کسی نے نہیں لکھا۔

دکن میں سب سے پہلے ولی اورنگ آبادی نے لفظ ریختہ کا استعمال کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے :۔

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دو رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

میرا خیال ہے کہ جس طرح جنوبی ہند میں اردو کا نام دکھنی رکھا گیا تھا۔ اسی طرح شمالی میں وہ پہلے پہل ریختہ سے موسوم ہوئی۔ ولی نے اس کا استعمال اپنے سفر دہلی کے بعد کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ دکھنی شعرا کے قطع نظر شمالی ہند کے شعرا نے اس لفظ کا استعمال عام طور سے کیا ہے۔ میر کہتا ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن تھا

قائم کہتا ہے :۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات لچر سی بہ زبان دکھنی تھی

اثر کہتا ہے :۔

ریختہ نے یہ تب شرف پایا　　جبکہ حضرت نے اس کو فرمایا

شاہ حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"در شعر فارسی پیروی مرزا صائب است در ریختہ ولی را استاد میداند"

میرے خیال کی تائید مولانا باقر آگاہ کے رائے سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی مثنوی گلزار عشق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان (شمالی ہند) میں مدت تک زبان ہندی کہ اسے برج بھاکا کہتے ہیں، رواج رکھتی تھی۔ اگرچہ لغت سنسکرت ان کی اصل اصول اور مخرج فنون فروع واصول ہے۔ پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی وفارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب خاص اس کے کھونے لگے بسبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمی ہوئی"

آگے چل کر اسی دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"مخفی نہ رہے کہ تمام ریختہ گویوں میں سودا اعتبار نمایاں پایا

. . . . . . بعضے اس قدر اس کے باب میں دفتر اغراق کا کھولتے ہیں کہ اس بیچارے کو سب شعرائے ریختہ کو بلکہ تمام ادبائے فارسی سے افضل و بہتر بولتے ہیں"۔

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے شمالی ہند میں کس وقت سے ریختہ کا نام زبان کے لئے استعمال ہوا؟

یہ فارسی لفظ ہے جس کے مختلف معنی لئے گئے ہیں جن کے منجملہ ایک یہ بھی ہے۔ کہ وہ کلام جو دو یا زیادہ زبانوں سے مخلوط ہو۔ جہاں تک پتہ چلتا ہے اولاً امیر خسرو نے اس لفظ کو اردو میں موسیقی کی اصطلاح قرار دیا تھا۔ چنانچہ مولانا مخدوم علاؤالدین نے اپنے مرشد بہارالدین کی سند پر امیر خسرو کی خدمات موسیقی کے ذکر میں ریختہ کے متعلق بیان کیا ہے :۔

"و اصطلاح دیگر آں کہ ہر فارسی کہ با مضمون خیال ہندوی مطابق الفاظ باشد الفاظ ہر دو زبان را در یک مال و یک را بر نسبت نموده باشند و انضمام و اتصال داده سرایند آں را ریختہ گویند"۔

معلوم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد شمالی ہند میں یہ لفظ جو موسیقی کی اصطلاح قرار دیا گیا تھا۔ زبان کا نام ہوگیا۔ مگر جنوبی ہند میں عام طور سے وہ دکھنی

اور ہندی سے موسوم تھی نہ کہ ریختہ سے۔

اس پوری تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے۔ کہ دکن میں اردو زبان ریختہ کے نام سے نہیں پکاری جاتی تھی۔ دکن میں ریختہ صرف اس کلام کو کہتے تھے۔ جو بالکل فارسی آمیز ہوتا تھا۔

۲۔ صفحہ ۱۲ پر بیان کیا گیا ہے:۔

"دکن میں ریختہ کی شاعری کو روز افزوں ترقی ہوتی رہی۔ علاوہ نظم کے نثر کی جانب بھی بعض نے جہانگیر کے عہد حکومت میں توجہ کی اسی عہد میں شجاع الدین نوری ہاشم برہان پوری کاظم علی رہام راؤ اور سیوا نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا۔ غواصی نے طوطی نامہ نخشی کا ترجمہ کیا۔ جس کا ایک مصرعہ ریختہ میں اور ایک فارسی میں ہے۔"

اس تحریر میں کئی ایک امور صحت طلب ہیں:۔

ا۔ شجاع الدین نوری کے مرثیوں کے اڈنبرا میں ہونے کا فٹ نوٹ دیا گیا ہے۔ یہ بیان نصیر حسین خان صاحب خیال کے مضمون سے اخذ کیا گیا ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اڈنبرا یونیورسٹی کے مرثیوں میں شجاع الدین نوری کا ایک بھی مرثیہ نہیں ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ

سننے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔

ب۔ ہاشم برہان پوری کو نوری اور کاظم علی کا ہمعصر خیال کیا گیا ہے۔ یہ غلط فہمی اڈنبرا یونیورسٹی کے کیٹلاگ کے غلط اندراج کے باعث پھیلی ہوئی ہے جس میں ہاشم کو جہانگیر کے عہد کا شاعر لکھا ہے اور ۱۰۴۹ھ میں موجود ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر مرثیوں کے مطالعہ کرنے سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ یہ ہاشم جو ہاشم علی برہان پوری ہے۔ ولی کا ہمعصر ۱۱۶۹ھ میں زندہ تھا۔ غرضکہ جو مرثیے اڈنبرا میں ہیں وہ ۱۱۶۹ھ والے ہاشم علی کے ہیں نہ کہ ۱۰۴۹ھ کے ہاشم کے۔ یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے۔ ہاشم برہان پوری نے جو شیخ احمد سرہندی کا مرید تھا جس کا فارسی دیوان انڈیا آفس میں ہے کبھی اردو شاعری بھی کی ہے یا نہیں یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔ اس لئے یہ نظر انداز کی جاتی ہے۔

ج۔ غواصی نے نخشبی کے طوطی نامہ کا ترجمہ کیا تھا جس کا ایک مصرعہ ریختہ اور ایک فارسی تھا۔ یہ بیان غالباً تذکرہ میر حسن سے ماخوذ ہے جس میں صراحت کی ہے :-

"غواصی تخلص در وقت جہانگیر بادشاہ بود طوطی نامہ نخشبی را نظم نمودہ است بزبان قدیم نصفے فارسی و نصفے ہندی بطور ریکٹ کہانی" (ص ۲۲۱)

حقیقت یہ ہے یہ بیان اصلیت سے بہت دور اور خلاف واقعہ ہے۔ طوطی نامہ غواصی کو دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ بیان کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے میرا خیال ہے، مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے معتمد انجمن ترقی اردو نے کسی مضمون کے ضمن میں میر حسن کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ طوطی ناموں کے متعلق ہم نے تفصیل کے ساتھ ایک مضمون قلمبند کیا ہے۔ جو نیرنگ خیال لاہور (ہولائی ۲۹ء) میں شائع ہوا ہے۔ بطور ثبوت طوطی نامہ غواصی کے چہار شعر درج کئے جاتے ہیں:۔

رتن خاص دریائے لولاک کا　　جھلک لامکان نور افلاک کا

محمد نبی سید المرسلین　　سدا روشن اُس تے دنیا ہور دین

بن اس جواہر لال کے سمندر کا گہیر　　ہے غواص اس دور میں بے نظیر

سو یو جواہراں کا رلیا نا ہے بہار　　جو ملک ہندوستان میں ایک ٹہار

کہتے ہیں جو تھا کوئی سوداگر ایک   وجاہت منے پاک ہمت زمیں نیک

جہاں میں جھلکتا اچھو جم مدام،   بحق محمد علیہ السلام

غواصی اگر تون ہے سچا غواص

لگا عشق اپنا خدا سات خاص

۳۔ فہرست کتب کے جو ضمیمے دیئے گئے ہیں، ان میں اردو کے قدیم کتابوں کی صراحت بہت کچھ اصلاح اور ترمیم طلب ہے۔ اس کے دیکھنے سے قدیم کتابوں کے متعلق صحیح معلومات حاصل نہیں ہوتے۔ بلکہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

ذیل میں ایک فہرست دی جاتی ہے جس سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے

نمبر شمار	نام کتاب مع صراحت صفحہ	صراحت غلطی	صحت
۱	دیوانِ ریختہ سلطان محمد صفحہ ۶۰	ملنے کا پتہ	جیسا کہ درج کیا گیا ہے۔ کہ انڈیا آفس میں ہے صحیح نہیں ہے، وہاں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے
۲	سیف الملوک غواصی صفحہ ۶۰	تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۲۷ھ غلط ہے	دراصل صحیح تاریخ سنہ ۱۰۳۵ھ ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب مع صراحت صفحہ	صراحت غلطی	صحت
٣	قصہ چندر بدن صفحہ ٦٠	یہ عزیزی کی تصنیف ہے	دراصل مقیمی کی تصنیف ہے۔ نہ کہ عزیزی کی
٤	طوطی نامہ غواصی	ملنے کا پتہ غلط ہے	جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے پیرس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ بلکہ برٹش میوزیم میں دو نسخے ہیں۔
٥	خاور نامہ	کمال خاں کا تخلص رستمی غلط ہے۔	دراصل رستمی تخلص ہے۔
٦	علی نامہ صفحہ ٦٢	عماد الملک کے کتب خانہ کا وجود نہیں ہے اس لئے ملنے کا پتہ درست نہیں ہے	انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے علاوہ انجمن ترقی اردو میں موجود ہے۔ دفتر دیوانی حیدرآباد میں ہی موجود ہے۔
٧	مثنوی پھول بن صفحہ ٦٢	تاریخ تصنیف غلط ہے	صحیح سنہ ١٠٦٦ھ ہے۔
٨	مراثی مثنی شجاع الدین نوری صفحہ ٦٤	ملنے کا پتہ	اڈنبرا میں کوئی مرثیہ ان کا نہیں ہے
٩	مثنوی یوسف زلیخا ہاشمی	ملنے کا پتہ غلط ہے	انڈیا آفس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے

شمار	نام کتاب مع صراحت صفحہ	صراحتِ غلطی	صحت
۱۰	قصہ فیروز شاہ صفحہ ۶۶	اس کا وجود ہی غلط ہے	کوئی کتاب اس نام کی نہیں ہے۔
۱۲	مثنوی من لگن صفحہ ۶۶	ملنے کا پتہ غلط ہے	انڈیا آفس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں البتہ سرامیں جنگ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ ہے اور ہمارے خاندان میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے۔
۱۳	قصہ رتن و پدم صفحہ ۶۶	سنہ تصنیف اور ملنے کا پتہ غلط درج کیا گیا ہے	صحیح سنہ تصنیف غیر معلوم ہے انڈیا آفس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔
۱۴	روضۃ الشہدا صفحہ ۶۶	سنہ تصنیف غلط ہے اور ملنے کا پتہ درج نہیں	صحیح سنہ تصنیف ۱۱۳۰ھ ہے انڈیا آفس کے علاوہ میرے پاس بھی اس کا ایک نسخہ ہے
۱۵	پنچھی باچھا صفحہ ۶۸	مصنف کا نام اور سنہ تصنیف غلط ہے	وجدی کی تصنیف ہے سنہ ۱۱۵۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔
۱۶	قانون اسلام صفحہ ۶۴	ملنے کا پتہ غلط ہے	انڈیا آفس میں کوئی کتاب نہیں ہے۔
۱۷	مراثی مرزا صفحہ ۶۴	ملنے کے پتہ کی صراحت نہیں ہے	اڈنبرا یونیورسٹی کے بیاض میں اس کے مرثیے موجود ہیں۔
۱۸	سب رس صفحہ ۶۰	ملنے کا پتہ نہیں ہے	کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔

یہ ایک مختصر فہرست بطور نمونہ دی گئی ہے ورنہ اور طویل فہرست ہو سکتی ہے۔

(۴) قدیم کتابوں کی جو فہرست دی گئی ہے وہ نہایت عجلت سے مرتب کی گئی ہے۔ جیسا کہ خود مولف صاحب نے لکھا ہے :۔

"دو مہینے کی قلیل مدت ملاحظہ ہو اور اردو زبان و ادب کے بحر ذخار کی شناوری ۔۔۔ ۔۔۔ اردو ادب کا سرمایہ ایسا کثیر ہے۔ کہ اس کے احصار اور شمار کے لئے دو مہینے تو کیا دو برس کی مدت بھی کم ہے۔"

یہ خیال بالکل درست ہے۔ کیونکہ زیر بحث فہرست موجودہ قدیم ذخیرے کے ½ حصہ کے مساوی قرار دی جا سکتی ہے۔ اگر اکیڈیمی ایک مکمل فہرست ہی تیار کر دے تو بڑا کام ہوگا۔ ہندوستان کے کتب خانوں سے قطع نظر خود یورپ میں اردو کا جس قدر قلمی ذخیرہ ہے۔ اس کی فہرست بھی خاصی طویل ہو سکتی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے چند مخطوطوں کی فہرست دی جاتی ہے۔ جو زیر بحث فہرست میں نہیں ہیں

شمار	نام کتاب	مصنف	سنہ تصنیف	ملنے کا پتہ
۱	قطب مشتری	وجہی	۱۰۱۸ھ	کتب خانہ انڈیا آفس
۲	مصیبت اہل بیت	احمد	؟	"

شمار	نام کتاب	مصنف	سنہ تصنیف	ملنے کا پتہ
۳	پدماوت	غلام علی	سنہ ۱۰۹۱ھ	کتب خانہ انڈیا آفس
۴	قصہ حسنی	خواص علی	سنہ ۱۰۹۰ھ	" "
۵	قصہ بہرام و حسن بانو	امین دولت	سنہ ۱۰۵۰ھ	برٹش میوزیم
۶	ہشت بہشت	ملک خوشنود	سنہ ۱۰۵۶ھ	" "
۷	عشق صادق	ضعیفی	سنہ ۱۱۰۰ھ	کتب خانہ انڈیا آفس
۸	جنگ نامہ حیدر	اشرف	سنہ ۱۱۲۵ھ	برٹش میوزیم
۹	غوث نامہ	ذوقی	سنہ ۱۱۰۹ھ	" "
۱۰	دیوان حسینی (مراثی ہاشم علی)	ہاشم علی	سنہ ۱۱۶۹ھ	اڈنبرا یونیورسٹی
۱۱۲	شوہر نامہ	صابر	سنہ ۱۱۵۶ھ	برٹش میوزیم
۳	سوداگر کی بی بی	؟	سنہ ۱۱۶۴ھ	" "
۱۴	عقد فاطمہ	مخدوم حسینی	سنہ ۱۱۶۴ھ	انڈیا آفس
۱۵	معجزات رسالت	"	"	" "
۱۶	دیوان عاجز	عارف الدین عاجز	"	قومی کتب خانہ پیرس
۱۷	اسلام عمر	عبداللہ مکنہ	سنہ ۱۱۷۰ھ	کتب خانہ انڈیا آفس

شمار	نام کتاب	مصنف	سنہ تصنیف	ملنے کا پتہ
۱۸	روضۃ الصالحین	غلام حسین	سنہ ۱۲۰۸ھ	برٹش میوزیم
۱۹	جنگ بھاؤ مرہٹہ و شاہ درانی	؟	سنہ ۱۲۰۰ھ	انڈیا آفس
۲۰	دیوان چندا	مہ لقابائی چندا	سنہ ۱۲۱۳ھ	" "
۲۱	دیوان شاداں	چندو لعل	سنہ ۱۲۵۰ھ	" "

مزید فہرست بخوف طوالت نظر انداز کی جاتی ہے، بہرحال اس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ زیر بحث فہرست نامکمل اور ناقص ہے۔ نواب سالار جنگ بہادر (حیدرآباد) کے کتب خانہ میں بھی کئی سو مخطوطات محفوظ ہیں۔ امید ہے کہ اکیڈیمی اس پر غور کرے گی۔ (جامعہ دہلی سنہ ۱۹۳۲ء)

تاریخ نثر اردو پر ایک نظر

گذشتہ چند سالوں میں زبان اردو کے متعلق کُل رعنائے دکن میں اردو، اردوئے قدیم، شعر الہند، سیر المصنفین، پنجاب میں اردو، تاریخ ادب اردو، اردو زبان اور ادب اور اردو شہ پارے وغیرہ متعدد محققانہ کتابیں

لکھی گئی ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے، اور ہنوز اس امر کی گنجائش ہے کہ اور نئی کتابیں اس موضوع پر مرتب ہوں، کہ علم ادب ریاضی نہیں جس کا ہر مسئلہ یقینی اور قطعی ہو اور نہ کوئی شخص دعوے کر سکتا ہے کہ اب مزید تحقیق اور اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اسی لیے اب محققین اردو ادھر متوجہ ہیں، اور آئے دن نئی نئی کتابیں اس عنوان پر لکھی جا رہی ہیں۔

چنانچہ اسی سلسلہ میں ابھی حال میں تاریخ نثر اردو شائع ہوئی ہے، اس کے مولف ہندوستان کے مشہور ادیب و شاعر جناب احسن مارہروی ہیں جن کے ادبی کارناموں سے اہل ملک بخوبی واقف ہیں، ابھی چند سال پہلے وہ ولی کا کلیات مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں۔

زیر بحث تاریخ کے مضامین کا خلاصہ حسب ذیل ہو سکتا ہے:۔

اولاً (۳۸) صفحوں میں مقدمہ ہے جس میں یہ بحث ہے کہ اردو کی ابتدا نظم سے ہوئی یا نثر سے؟ آغاز لفظ اردو کی تحقیق اور زبان اردو کی خصوصیات اردو الفاظ کی بنیادیں، شمالی ہند میں اردو کیوں دیر میں مروج ہوئی؟ اردو زبان کا عام اثر، اس کی باقاعدہ تدوین، اس کے متعدد نام، دیوان کی ترتیب،

نثر اردو کی تصنیف کا آغاز، موجودہ اردو کی ابتدا، آسان اور قابل تقلید اردو وغیرہ عنوان پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، جس کے چھ دور سنہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۸ء) سے سنہ ۱۳۴۸ھ (۱۹۳۰ء) تک قائم کیے گئے ہیں۔

پہلا دور	سنہ ۸۰۱ھ سے سنہ ۹۰۰ھ تک	۳ صفحوں میں
دوسرا دور	سنہ ۹۰۱ھ سے سنہ ۱۰۰۰ھ تک	۴ صفحوں میں
تیسرا دور	سنہ ۱۰۰۱ھ سے سنہ ۱۱۰۰ھ تک	(۱۳) صفحوں میں
چوتھا دور	سنہ ۱۱۰۱ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک	۱۹ صفحوں میں
پانچواں دور	سنہ ۱۲۰۱ھ سے سنہ ۱۳۰۰ھ تک	۱۰۸ صفحوں میں
چھٹا دور	سنہ ۱۳۰۱ھ سے سنہ ۱۳۴۸ھ تک	۴۲۶ صفحوں میں آیا ہے

پہلے دور میں، ایک نثر کا نمونہ اور اس پر تبصرہ وکیفیت اور الفاظ قدیم وجدید دیئے گئے ہیں۔

دوسرے دور میں، دو نثروں کے نمونے ان پر تبصرہ وکیفیت اور الفاظ قدیم وجدید۔

تیسرے دور میں، چار نثروں کے نمونے ان پر تبصرہ وکیفیت، اور الفاظ قدیم وجدید۔

چوتھے دور میں، چار نثروں کے نمونے ان پر تبصرہ و کیفیت، اور الفاظ قدیم و جدید۔

پانچواں اور چھٹا دور زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے، اس میں بھی خصوصاً چھٹے دور میں جو سنہ ۱۳۰۱ھ سے سنہ ۱۳۴۸ھ تک ہے، نہایت تفصیل کو کام میں لایا گیا ہے، اور ہر قسم کی نثروں کے نمونے مثلاً کتابی، قانونی، اخباری، اشتہاری عبارتوں کے نمونے اور خطوط کے نمونے شامل ہیں، جا بجا ان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

ہر نمونۂ عبارت کے ساتھ امور ذیل کی خانہ پری کی گئی ہے:۔

(۱) نام تصنیف، (۲) نام مصنف (۳) سنہ تصنیف

بادی النظر میں کتاب کا بڑا حصہ صرف عبارت کے نمونوں پر مشتمل ہے، جو ممکن ہے کہ بقول بعض "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کا مصداق ہو، مگر جن کو اس قسم کے کاموں کا تھوڑا سا بھی تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں۔ کہ ان کا جمع کرنا، ترتیب دینا، ان پر تبصرہ کرنا اور کیفیت لکھنا، کوئی معمولی کام نہیں ہے اس کے لئے برسوں کی محنت سالہا سال کی کاوش اور عرق ریزی درکار ہے۔

اردو کا میدان نہایت وسیع ہے، اس کی ہمہ گیری اور عالمگیری کو پیش نظر رکھ کر اس کی تاریخ پر قلم اٹھانا معمولی کام نہیں، کیونکہ ہندوستان کے

ہر حصۂ ملک کے اردو کے خدمات سے پوری طرح واقف ہونا کوئی آسان بات نہیں ہے، ہندوستان کے مختلف صوبوں کا میدان ہی کافی وسیع جولانگاہ ہے، جس میں محققین اردو دادِ تحقیق دے سکتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے۔ کہ ایک دکھنی ہرگز پنجاب کے کارناموں سے کما حقہٗ واقف نہیں ہوسکتا، اور اسی طرح پنجابی دکن کے کارناموں سے، علیٰ ہذا گجراتی، بہاری، شمالی ہندی وغیرہ جو اصحاب اس کی ہمہ گیری پر قلم اٹھاتے ہیں، وہ واقعی بہت بڑا کارنامہ اپنی یادگار چھوڑتے ہیں۔

گل رعنا، اردوئے قدیم، شعر الہند، سیر المصنفین، تاریخ ادب اردو، اور اردو شہ پارے اسی قسم کی کتابیں ہیں، اگرچہ ہر ایک اپنے مضمون کے لحاظ سے دلچسپ اور تحقیق کے ساتھ مرتب ہوئی ہے۔ مگر مندرجہ صدر اصول کے لحاظ سے ان کو دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا، ان میں اکثر صرف شمالی ہند کے کارناموں سے مختص ہیں، حالانکہ اردو کی تاریخ میں جنوبی ہند کا خاص حصہ ہے، اس کو نظر انداز کرکے اردو کی تاریخ ہرگز مکمل نہیں ہوسکتی،

جناب حسن مارہروی شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے جس مضمون پر قلم اٹھایا ہے، اس کو بلا تعصب تحقیق کے ساتھ اور بڑی حد تک مکمل طور پر لکھا ہے، تاہم انسان

کا کوئی کام مکمل نہیں کہا جاسکتا، بڑے بڑے محقق اور مورخ سے فروگذاشتوں
کا ہونا ناگزیر ہے لیکن ان کی اصلاح ہر وقت ہوسکتی ہے، ذیل میں مولف ممدوح
کو چند امور کی جانب توجہ دلائی جاتی ہے، جو میری رائے میں قابل اضافہ ہیں۔

(۱) ابتدائی دور میں جس قدر نمونے دستیاب ہوئے دیئے گئے ہیں، مگر چونکہ
اس زمانہ میں بہت ہی کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس لئے جو کتابیں بھی ہیں۔
ان کا اضافہ کرنا ضروری ہے، پہلے اور دوسرے دور سے قطع نظر تیسرے
دور میں صرف تین نثر کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ اس میں مزید کتابوں
کا اضافہ ہوسکتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم ذیل میں ایک نقشہ مرتب کرتے ہیں جس سے اندازہ
ہوگا۔ کہ ہر دور میں جنوبی ہند کی کن کن کتابوں کی نثر کے نمونے باقی رہ گئے
ہیں، ہم ان تمام کتابوں کا تذکرہ اپنی تالیف "دکھن میں اردو" اور رسائل کے
بعض خاص مضامین میں کرچکے ہیں :-

دور	کتاب	مصنف	زمانہ	فن	کیفیت
تیسرا دور	شمائل الاتقیا	میران یعقوب	سنہ ۱۰۶۸ھ	تصوف	کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے
چوتھا دور	معرفۃ السلوک	شاہ ولی اللہ قادری	سنہ ۱۱۵۷ھ	"	" " "

دور	کتاب	مصنف	زمانہ	فن	کیفیت
چوتھا دور	رسالہ حقائق	حضرت شاہ میر	۔	تصوف	کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے
"	ترجمہ شریعت نامہ شاہ ملک		سنہ ۱۱۴۹ھ	"	انڈیا آفس
پانچواں دور	رسائل شمسیہ	ترجمہ انگریزی	سنہ ۱۲۵۳ھ	طبیعات	اردو میں علم طبیعات پر یہ ابتدائی کوشش تھی اس لئے اس کا حوالہ ضروری تھا
"	تذکرۂ انوار بدریہ		سنہ ۱۱۸۱ھ	علم ریاضی	اردو میں علم ریاضی پر یہ دونوں رسالے ابتداً لکھے گئے۔
	انوار سہیلی	مترجمہ محمد ابراہیم بیجاپوری			

اسی طرح دور پنجم و ششم میں ایسے اور چند نمونے مل سکتے ہیں۔ جو سنہ ۱۲۰۰ھ تک قلمبند ہوئے۔

علاوہ ازیں مصنف نے جنوبی ہند کے کارناموں میں صرف قلمرو آصفیہ کو لیا گیا ہے حالانکہ احاطۂ مدراس سے بھی اردو کے بہت سارے نمونے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ ٹیپو سلطان اور رؤسا ارکاٹ کے زمانہ میں اردو زبان کی جو خدمت میسور اور ارکاٹ نے کی ہے۔ وہ فراموش نہیں ہو سکتی، اول الذکر کے متعلق ہم نے ایک مختصر مضمون لکھا ہے، جو سفینہ مدراس کے (جولائی سنہ ۱۹۲۹ء) میں شائع ہوا ہے، اس عہد کی ایک تاریخ یعنی حیدر نامہ جو نثر اردو میں ہے،

رؤسائے ارکاٹ نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے جس پر نظم تفصیل سے مضمون لکھے ہیں، نظم کے قطع نظر یہاں بعض ان کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جو نثر میں لکھی گئی ہیں اور مشہور و معروف ہیں۔

۱۔ "ترجمہ آدم فی الحدیث" اس نام سے ایک کتاب شیخ آدم نے عمدۃ الامرا (۱۲۰۶ تا ۱۲۱۶ھ) کے زمانہ حکمرانی میں مرتب کی ہے، دراصل یہ "زواجر" کا ترجمہ ہے، اس کی تصنیف عمدۃ الامرا کے فرزند معین الدولہ محمد علی حسین خان کے حکم سے ہوئی ہے، عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"بعدہٗ جان تون جو مردمک دیدہ دولت و اقبال نور البصر جاہ و جلال امیر کبیر در امارت بی نظیر نواب امیر الملک معین الدولہ محمد علی حسین خان بہادر ظفر جنگ یعنی ثمرہ فواد قرت العین معین شاہان مادای سلطنت پناہان جناب امیر الہند والاجاہ نواب عمدۃ الامرا بہادر . . . .

. . . . صفحہ ۲

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تفسیر میں ہے کہ ویل دوزخ میں ایک وادی ہے، وادی گہرے کو کہتے ہیں، اس وادی سے تمام دوزخیاں اور دوزخ ہر ایک روز سات دفعہ پناہ مانگتی ہیں" ص ۹

ب۔ قصص انبیا: اس کے مصنف عبدالصمد ابن عبدالوہاب خان نصرت جنگ ہیں، نصرت جنگ والاجاہ محمد علی خاں کے بھائی ہیں، اس کی تصنیف ۱۲۱۸ھ میں ہوئی ہے۔

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے انبیا کے قصوں پر مشتمل ہے، فارسی سے اس کو ترجمہ کیا گیا ہے، عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

"اور میرا نام عبدالصمد، عبدالوہاب خاں بہادر نصرت جنگ کا فرزند ہوں، عالم کون فائدہ ہونے کے واسطے قصص الانبیا کون دکھنی زبان میں نثر بتایا ہوں . . . .

یکروز حضرت یعقوب علیہ السلام کی حال کہے۔ کہ توں یہاں اپنے جان کے خوف سین رہتا ہے، رات کے وقت نکلتا ہے، توں میرے سات شام کے ملک کو چل وہاں میری بہن کی لڑکی سے تیری شادی کر دیتی ہوں، جب یعقوب علیہ السلام اور انو کی ماں دو ہل کر چلے تب انو کی ماں یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل رکھے۔"

ج۔ تصنیفات مولانا قاضی بدرالدولہ مغفور

قاضی صاحب نے جنوبی ہند میں بڑا کام کیا ہے، آپ کے اردو تصنیفات

تیرہ ہیں، جو سب کی سب نثر میں لکھی گئی ہیں، یہ کتابیں مختلف فنون مثلاً حدیث فقہ، عقائد، سیر اور مناسک پر مشتمل ہیں، آپ کی سب سے پہلی تصنیف ریاض السوال ہے۔ جو ۱۲۲۴ھ میں مرتب ہوئی اور آخری تصنیف تفسیر فیض الکریم ہے۔ جو مکمل نہیں ہوئی اور مصنف کا ۱۲۷۵ھ میں انتقال ہو گیا۔

آپ کی تصنیف سے دو اور کتابیں بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں (۱) فوائد بدریہ آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک ہے۔ جو صرف احادیث سے مرتب ہوئی ہے۔ مبئی اور مدراس میں اس کے متعدد اڈیشن شائع ہوئے ہیں، جنوبی ہند خصوصاً احاطۂ مدراس میں اس کتاب کا وہی درجہ ہے۔ جو شمالی ہند میں علامہ شبلی کی سیرت النبیؐ کو دیا گیا ہے۔

(۲) قوت الارواح، یہ کتاب حج کے مناسک میں لکھی گئی ہے، بڑی سایز کے (۸۰۰) صفحات میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب کی اہمیت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ کہ عربی میں بھی مناسک میں کوئی کتاب ایسی جامع اور مکمل نہیں ہے۔

قاضی بدرالدولہ کے متعلق ہم نے تفصیل سے مدراس میں اردو پر روشنی ڈالی ہے اور عبارت کا نمونہ پیش کیا ہے۔

قاضی صاحب کے بعد بھی نثر میں متعدد کتابیں مدراس میں مرتب ہوئی ہیں

بہرحال مدراس کے اردو نثر کے قدیم اور جدید نمونے دستیاب ہو سکتے ہیں، ان کا ذکر نہ ہونا بڑی کمی ہے۔

۲۔ اخبارات کے ضمن میں چار دور قائم کئے گئے ہیں، پہلا دور ۱۲۶۳ھ سے شروع ہوتا ہے، سب سے پہلے سعد الاخبار آگرہ کا ذکر ہے، جو ۱۲۶۳ھ میں جاری ہوا تھا، آخر میں ایک فہرست دی گئی ہے، مگر اس فہرست میں بھی مدراس کے کسی اخبار کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ مدراس کا اس میں بڑا حصہ ہے، بلکہ اردو اخبار کی ابتدا ہی مدراس سے ہوئی ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انگریزوں نے مدراس میں ہی پہلے اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی اس لئے صوبہ مدراس ہی پہلے پہل یورپ کے سامانوں اور ایجادوں سے واقف ہوا، جو شئے یورپ میں ہوتی تھی، وہ مدراس ہی سے ہندوستان میں پھیلا کرتی۔

اگرچہ نہایت قدیم زمانہ سے ہندوستان میں اخبار اور وقائع کا نام سنا جاتا ہے۔ مگر یہ اخبار آج کل کی طرح عام طور پر مشتہر نہیں ہوتے تھے، بلکہ بادشاہ وقت کے حالات صوبہ داروں کو یا صوبہ جات اور اضلاع وغیرہ کے حالات سے خفیہ طور پر بادشاہ کو واقف کرایا جاتا تھا۔

موجودہ زمانہ کے اخبار کا سہرا یورپ کے سر ہے، جب مدراس میں یورپ کی ایک متمدن سلطنت کا قیام ہوا۔ تو یہاں بھی اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے انگریزی اخبارات کی تقلید میں سب سے پہلے مدراس ہی سے اردو کا پہلا اخبار "عمدۃ الاخبار" جاری ہوا۔

والاجاہ کے جانشین عمدۃ الامرا تھے جنہوں نے سنہ ۱۲۰۶ھ سے سنہ ۱۲۱۶ھ تک ارکاٹ کے مسند حکومت پر فرمانروائی کی، آپ کے زمانہ حکومت میں آپ ہی کی سرپرستی میں آپ کے نام سے عمدۃ الاخبار کا اجرا عمل میں آیا اور اس کے بعد اسی کی تقلید میں احسن الاخبار، جامع الاخبار، مظہر الاخبار وغیرہ جاری ہوئے۔ افسوس ہے کہ سردست مظہر الاخبار کے سوا کسی پر تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔

مظہر الاخبار ایک ہفتہ وار اخبار تھا جو سنہ ۱۲۷۲ھ میں محلہ ترلمکھری مدراس سے شائع ہونے لگا تھا۔ اور ایک عرصہ تک اس کے جاری رہنے کا پتہ چلتا ہے یہ بارہ صفحے کا اخبار تھا، اس میں غیر ملکی خبریں، شہری خبریں، اشتہارات وغیرہ شائع ہوتے تھے، اس کے ایڈیٹر محمد خواجہ بادشاہ متخلص عبرت تھے۔

ہمارے پیش نظر اس وقت اس کی ساتویں جلد کا تیسواں پرچہ ہے عبارت کے لحاظ سے تعجب ہوتا ہے کیسی صاف اور سلیس اردو ہے، مختلف مقامات سے

اس کے عبارت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے :-

"مصر، اخبارات ولایت مظہر ہے کہ سلطان روم معہ پاشا مصر کو جائیں گے اور چالیس روز میں بازگشت فرمائیں گے۔

دیوان) آج تک یہ تخت بے چراغ تھا شکر ہے کہ اب روشن ہوا جناب ولیعہد ملکہ محتشمہ کے سالے ولیم صاحب بہادر اس تخت پر رونق افروز ہوئے"۔ ص۱۱

"ضیافت سراسر لطافت عقد تزویج ہندوستان کے اہل اسلام میں دو قسم پر رواج پایا ہے، ایک نکاح خوانی جو اصل دین ہے، یعنی فقط شروط و آداب نکاح موافق حکم شرع بجالانا، چنانچہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں جہاں سے دین اسلام پیدا ہوا، اور جمیع بلاد عرب و شام و ترک و مغرب وغیرہ میں اسی آئین پر ازدواج کا رواج شائع ہے دوسرا شادی جو مخصوص اختراع اہل ہند ہے، یعنی چند رسوم غیر شرعی مسرفانہ جو ہند کے مسلمانوں نے فقط حظوظ نفسانی حاصل کرنے کے لیے سراسر رسم ہنود سے اخذ کر کے اور ان کو ترکیب تازہ دے کر نکاح کے ساتھ منضم کر دی ہیں . . . .

الحمد للہ والمنہ زہے زمان سعادت توامان ہے عجب آوان خیر و برکت عنوان ہے، نوید صلاح و فلاح ہر مکان ہے، قاصد فرح مقاصد مژدہ رساں ہے، لو آج کل معمورۂ مدراس میں یہ رواج ہے، رہ راست پر ہر معاملے کا امتزاج ہے، ہر طرف طریق است نبوی کی گرم بازاری ہے شرح رسولؐ و دین مصطفویؐ کی استواری ہے۔ . . . . چنانچہ عالم باعمل افضل و اکمل فضیلت منازل آگاہ دل واقف حقایق فروع و اصول کاسف غوامض معقول و منقول برگزیدہ بارگاہ ایزدی قدوہ مقربان حضرت صمدی سر دفتر علمآ دیار و امصار فاضل و علامہ روزگار جناب مستطاب حضرت قاضی الملک بہادر دام افضالہم و عم حسنا تہم نے باوجود کمال قدرت و طاقت تامہ محض بلحاظ بہبودی اپنے متوسلین و متعلقین کے کہ تا اس کے تبعیت و تقلید کریں۔ ۷ ربیع تاریخ ماہ ذیحجہ روز جمعہ سنہ ۱۲۷۱ھ وقت ہفت ساعت عقد نکاح اپنے فرزند ارجمند حافظ حسینؒ[1] عطاء اللہ صاحب کا دختر نیک اختر ماہ برج امارت و بختیاری مہر سپہر کبیر جناب مستطاب عالی الالقاب حضرت سالار الملک بہادر دام شوکتہم کے ساتھ بلا تکلف باندھ دیا۔ فلک نے بارک اللہ کہا۔"

---

[1] راقم الحروف کے نانا تھے۔

نمونہ اشتہارات :۔

"روغن ہالوے" اس روغن کو رکھنے سے ہر شخص اپنے گھر کا طبیب ہو سکتا ہے، چونکہ اگر اس کو یا اس کے اطفال وغیرہ کو جلدی امراض مثلاً پھوڑے۔ دنبل۔ ناسور۔ ورم۔ دمہ اور دوسری شکایتیں ہوں تو روغن کے استعمال سے اپنے اور اپنے متعلقین کو درست کر سکتا ہے پروفیسر تھامسن ہالوے نمبر (۲۴۴) اسرانڈ لنڈن ٹمپل بار کے متصل اور جمیع ذی عزت و مشہور پنساریوں کے دوکانوں میں قیمت ذیل کے بموجب بکتے ہیں، فی ڈبی ایک شلنگ یعنی آٹھ آنہ۔

اس عبارت سے واضح ہو سکتا ہے، ۱۲۷۲ھ میں کس طرح صاف اردو بولی جاتی تھی۔

اس کے بعد مدراس سے بیسیوں روزانہ ہفتہ وار اخبار جاری ہوتے رہے ہیں، مثلاً شمس الاخبار۔ جریدۂ روزگار، نیر آصفی، مخبر دکن وغیرہ مگر ان میں سے کسی کا ذکر اس تاریخ میں نہیں ہے۔ میرے ناقص خیال میں ایک اور بات بھی مولف کی توجہ کے قابل ہے۔

پانچویں اور چھٹے دور میں ہر قسم کے فنون کے متعلق نمونے دیئے گئے ہیں

نگران میں کوئی فصل یا حد بندی نہیں ہے، اس کے باعث ایک نمونہ عبارت مثلاً ۱۳۲۵ھ کے بعد دوسرا نمونہ ۱۳۱۰ھ کی عبارت کا دیا گیا ہے۔ بادی النظر میں دھوکہ ہوتا ہے۔ کہ ۱۳۲۵ھ کے بعد ۱۳۱۰ھ کا نمونہ کس طرح ہے۔ اس لئے اگر فنون کے لحاظ سے عنوان قائم کرکے حد بندی کر دی جاتی۔ تو مناسب ہوتا۔ (رسالہ معارف ۱۹۳۲ء)

سب رس کے مقدمہ پر ایک تنقیدی نظر

بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اردو نے قطب شاہی زمانہ کے ایک بلند مرتبہ ادیب اور شاعر ملاوجہی کی گرانقدر کتاب "سب رس" شائع کرکے اپنے سرمایہ مطبوعات میں اچھا اضافہ کیا۔ آٹھ سال کی طویل عرق ریزی اور جاں کاہی کے بعد تصحیح و مقدمہ نگاری کے مراتب طے کرکے بالآخر دکھنی نثر کا ایک گراں پایہ شاہکار شائقین ادب کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔

ہندوستان کے مایۂ ناز فرد مولانا عبدالحق صاحب مدفیوضہ نے زبان و ادب اردو کی خدمت گذاری کا جو حق ادا کیا ہے۔ وہ حق یہ ہے کہ زندگی جاوید

کا مستحق ہے۔ تاریخ و زبان و ادب میں مولانائے محترم کی سعی و کوشش اور اس کے بیش قیمت نتائج کا تذکرہ ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ جس کو نہ مخالفت مٹا سکے گی اور نہ زمانہ بھلا سکے گا۔

کتابوں کی مقدمہ نگاری میں مولانائے محترم کو جو خاص ملکہ حاصل ہے۔ وہ ایک امر مسلمہ بن گیا ہے۔ ابھی حال ہی ان کے مختلف مقدمات دو ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر دنیائے ادب میں ایک مخصوص وقعت حاصل کر چکے ہیں۔

"سب رس" پر بھی مولانا نے ایک خاص طویل مقدمہ قلمبند فرمایا ہے۔ یہ بھی مولانا کے مخصوص طرز انشا کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ مولانا کے ذوق تحقیق اور رواں اسلوب کی داد دینا درحقیقت آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔

اس مقدمہ کو شروع سے آخر تک پڑھ کر ہم نے سب سے اول ایک سبق حاصل کیا وہ یہ کہ کسی کتاب یا کسی شے کے پرکھنے میں اس کے ہر پہلو کو دیکھنا چاہیئے۔ اگر کوئی شے اچھی ہے۔ تو اس کے ساتھ اس کی برائیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ خطا و صواب ساتھ ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی پہلو کو قطعی ترجیح نہیں حاصل ہو سکتی۔ تاوقتیکہ دونوں کا پورا پورا موازنہ نہ ہو جائے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اس مقدمہ پر بھی ہم نے ایک نظر ڈالی ہے۔ اگر اس میں کسی بات سے سوادب

کا شائبہ ظاہر ہوتا ہے۔ تو اس سے حاشا کسی طرح کی تنقیص کا کوئی ادنیٰ ارادہ بھی مرکوز خاطر نہیں ہے، ہمارا اعتقاد ہے کہ

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

یہ مقدمہ (۵۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلے دو صفحات تمہید کے ہیں۔ مقدمہ کی ابتدا یہ ہے۔ کہ:۔

"کچھ ہی دنوں پہلے تک ولی اردو شاعری کا بادا آدم مانا جاتا تھا"۔

خدا جانے آزاد مرحوم نے کس گھڑی میں غریب دکنی کو اردو شاعری کا بادا آدم قرار دیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک ہر شخص جس نے کچھ بھی تحقیق کی داد دی اس کا مذاق اڑایا۔ یہ نکتہ تحقیق اس قدر دہرایا جا چکا ہے۔ کہ اس میں اب کچھ لطف نہیں رہا۔ اس وقت تک کی معلومات کے لحاظ سے بے شک ولی ہی بادا آدم تھا۔ اب بھی کوئی اس لکیر کو پیٹنا چاہیئے۔ تو پیٹا کرے۔ اگر اس سے زیادہ اس میں کد وکاوش کی جائے۔ تو بھونڈا پن آجائے گا۔ تمہید کا ایک صفحہ یوں ختم ہو گیا۔

بعد میں مولانائے محترم نے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ کہ:۔

"ہر زبان میں (زمانہ کے لحاظ سے) نظم کو نثر پر تقدم حاصل ہے"۔ پھر اسی

خیال کو پورے ایک صفحہ میں پھیلایا ہے۔ اول تو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ "سب رس" کے متعلق مقدمہ لکھنے میں یہ بحث پیش کی جاتی۔ دوسرے یہ سارا بیان اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے کچھ بے ربط اور معلق سا ہے۔ اس بحث سے پہلے مولانا نے "ولی" کو باوا آدم قرار دینے پر جن لوگوں کو اصرار ہے ان سے کچھ خفگی کا سا اظہار کرکے یہ خیال ثابت کیا ہے۔ کہ فضلی نثر کے باوا آدم ہیں۔ ثبوت میں "سب رس" کی دستیابی کا ذکر کیا ہے۔

مولانا کا ارشاد ہے۔ کہ اس طرح اب تک اردو کی پہلی کتاب فضلی سے منسوب کی جاتی تھی . . . .

لیکن حال ہی میں معلوم ہوا کہ فضلی سے کہیں پہلے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی گئی تھیں . . . تحقیق و جستجو نے اب انہیں گمنامی سے نکالا ہے۔ انہیں میں سے ایک قابل قدر کتاب "سب رس" ہے۔

اس کے بعد سلسلہ بیان کے لحاظ سے چاہیئے تھا۔ کہ وہ بیان شروع ہوجاتا۔ جس کا آغاز یہ ہے۔ کہ "سب رس" کا مصنف وجہی ہے۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا وغیرہ" ان دونوں بیانوں کے درمیان اس عبارت کے ساتھ کہ "ہر زبان میں زمانہ کے لحاظ سے نظم کو نثر پر تقدم حاصل ہے" نظم

پہلے یا نثر پہلے کا قصہ غیر مربوط ہے۔ علاوہ بر آں مولانا نے اس بحث کو بہت تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ لیکن انسانی فطرت، انسانی تمدن کے ارتقا۔ تاریخ السنہ عالم نفسیات جذبات، فلسفۂ جذبات اور انسانی عادات کی تاریخ کے جیسے ہمہ گیر اور دقیق مباحث کو صرف ایک صفحہ میں بیان کر کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے مولانا کے وسعت مطالعہ اور معلومات کے عمق کا اس سے کافی اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ "اس کی (اردو کی) ابتدا بھی نظم ہی سے ہوئی اور نثر بعد آئی۔ یہاں تک کہ بعض علمی کتابیں بھی نظم ہی میں لکھی گئیں اور یہی تقریباً ہر زبان میں ہوا ہے" چاہیئے تھا۔ کہ اس مفروضہ کی تائید میں مثالیں دی جاتیں اور تاریخ سے روشنی ڈالی جاتی۔ ایک آدھ فقرہ سے کس طرح کوئی ناظر کتاب تشفی پا سکتا ہے۔ علاوہ بریں دکھنی ادب کی تاریخ کی ابھی جس طرح تحقیق ہونی چاہیئے۔ اس کے لحاظ سے یہ دعوے قبل از وقت ہے ابھی ہم ایک رائے قائم کرتے ہیں اور دوسری تحقیق کی بنا، پر اس رائے کو تبدیل کرنا لابد ہو جاتا ہے۔ ادب ریاضی نہیں ہے۔ کہ اس کا ہر مسئلہ یقینی ہو۔ اس حالت میں دکھنی ادب کے متعلق اس طرح قطعی فیصلہ کرنا قابل غور ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ تاریخ ادب اردو پر کوئی مبسوط کتاب مولانا کے زیر تالیف ہے ممکن ہے

کہ اس کے لئے مولانا نے جو تحقیقات کی ہے۔ اس کی بنا پر یہ رائے ظاہر فرمائی
ہو۔ کاش یہاں جو بحث چھڑی گئی ہے۔ اس کو ذرا پھیلا کر ان سب امور کو ظاہر
کیا جاتا۔

”سب رس“ کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے لیکن اس کی روانی اور
سلاست اور پوری ادبی شان بتاتی ہے۔ کہ یہ صورت ایک دم وجہی کی جنبش قلم سے
نہیں پیدا ہو گئی۔ وجہی کی نثر اپنے ماقبل زمانہ کی ایک ارتقائی شکل ہے۔ خود
مولانا کی تحقیقات نے ثابت کیا ہے۔ کہ ۸۲۵ھ ہجری سے قبل دکھنی نثر میں
کتابیں لکھی جانی شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی رح
کی تصنیف معراج العاشقین کی خود مولانا نے تصحیح فرمائی ہے۔ جو ۸۲۵ھ کے
قبل کی تصنیف ہے۔ گو یہ کوئی ادبی کتاب نہیں ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ
ادبی شان موجود ہے۔ ”سب رس“ اس کے دو صدی سے زیادہ عرصہ کے بعد
تالیف ہوئی ہے۔ یہ پورا زمانہ بلا تالیف و تصنیف کے کیسے گزر سکتا ہے ؟

اس کے قطع نظر دکھنی نظم کی کتاب جو اب تک مولانا کی تحقیقات میں معلوم
ہوتی ہے۔ وہ سلطان محمد قلی کا کلیات ہے۔ سلطان کا زمانہ ۹۸۸ھ سے
۱۰۲۰ھ ہجری تک ہے۔ اس کے کلیات سے یہ ایک نظر ظاہر ہو سکتا ہے

کہ یہ بھی زمانہ قبل کی نظم کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے کی نظم کا نمونہ بھی دستیاب ہوا ہے۔ نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ؟ ۸۶۳ھ کی تصنیف قرار دی جاسکتی ہے۔ ہم ایک جدا مضمون کے ذریعہ اس کو روشناس کرا چکے ہیں۔

حضرت خواجہ بندہ نواز کا زمانہ اس سے بھی پہلے کا ہے بہر حال فی الوقت جو مواد پیش نظر ہے۔ اس کے لحاظ سے ہم نہ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ دکھنی نظم کی ابتدا پہلے ہوئی اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ دکھنی نثر کی ابتدا پہلے ہوئی۔

اس کے بعد مولانا نے دو صفحے وجہی کے حالات میں لکھے ہیں۔ پہلے اس کی تحلیل کر لینی مناسب ہے۔ سب سے پہلا فقرہ یہ ہے۔

"سب رس" کا مصنف وجہی ہے۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا"۔ اس کے بعد وجہی کے حالات چھوڑ کر قطب شاہوں کی مدح وستایش شروع کر دی ہے۔ پورے ایک صفحہ پر بیان پھیلایا ہے۔ اس کے بعد مولانا نے پھر وجہی کا تذکرہ شروع کیا ہے اور بیان کیا ہے۔ کہ یہ "کتاب "سب رس" بھی وجہی نے عبداللہ قطب شاہ ہی کی فرمائش سے لکھی تھی"۔ اس کے ثبوت میں سب رس کے دیباچہ سے عبارت نقل کی ہے۔ جو آدھے صفحہ پر آئی ہے

اس طرح مصنف کتاب کی حیات کے متعلق ان دو صفحوں میں دو سطریں نکل آئیں سب رس کی ادبی اہمیت خود مولانا نے تسلیم فرمائی ہے۔ اس حالت میں مصنف کی حیات بھی خود بخود اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔

قطب شاہی شاعروں میں وجہی کی شخصیت نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے اس نے گولکنڈہ کے چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے۔ ایک ولی عہد سلطنت بلکہ تاجدار کو اپنی مثنوی میں ہیرو کی طرح پیش کیا ہے۔ اس کی فکر و ماغ کے نتائج سے نہ صرف نظم ہی دستیاب ہوئی ہے، بلکہ نثر کا بہترین نمونہ بھی ملا ہے، اس کے عروج کا اصلی زمانہ تو سلطان محمد قلی اور سلطان محمد کا زمانہ ہے عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں تو غواصی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ دربار شاہی میں وجہی کی وہ عزت باقی نہیں رہی۔ جو غواصی کو حاصل تھی۔

ہم منتظر تھے۔ کہ دیکھیں مولانا کے حقیقت نگار قلم کی جولانی اس میدان میں کیا رنگ دکھاتی ہے اور وجہی کے متعلق مولانا کا قلم جادو رقم کیا کیا گل بوٹے اگاتا ہے۔ مقدمہ کے اس حصہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ اب پرانی باتیں ہیں قطب شاہی حکمرانوں کی علم دوستی اور علمی قابلیت ان کے درباروں میں نامور علما کا موجود ہونا اور اس وقت کی علمی چہل پہل عرصہ سے لوگوں کو معلوم ہے

اس مقدمہ کے ذریعہ ہمیں نہ تو کوئی جدید بات اور نہ کوئی نیا نکتہ معلوم ہوا۔

اس کے بعد مولانا نے دو صفحوں میں وجہی کے تصانیف کو بیان کیا ہے اس سلسلہ میں مولانا نے اس کی دو اور کتابوں کا تعارف کرایا ہے۔ ایک تاج الحقائق جو نثر میں ہے۔ دوسری قطب مشتری جو مثنوی ہے۔

مثنوی قطب مشتری کو سب سے پہلے راقم الحروف نے ہی روشناس کرایا ہے (ملاحظہ ہو معارف جلد ۲۳ نمبر ۶) اور مولف اردو شہ پارے نے کئی صفحات اس اہم مثنوی کے لیے وقف کئے ہیں جس میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح چند سال سے سب کو اس کا حال معلوم ہے۔ البتہ تاج الحقائق نئی کتاب ہے اس حصہ مقدمہ میں ان کتابوں کا نام دیکھتے ہی خیال ہوا کہ آئندہ چند صفحات میں ان کا حال احوال کھول کھول کر بیان کیا جائے گا اور ان سے مصنف کی حیات پر جو کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس کو بھی واضح کیا جائیگا اور نیز اس کے انشا اسلوب پر بھی کوئی سیر حاصل بحث ہوگی۔ لیکن مولانا ان امور کو چھوڑ کر اس معمولی بحث میں پڑ جاتے ہیں۔ کہ وجہی نے قطب مشتری میں اپنے آپ کو ہمیشہ "وجہی" کیوں لکھا ہے ایک صفحہ اس میں ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد مولانا نے "سب رس" کا سنہ تالیف کو سنہ ۱۰۴۵ھ قرار دے کر اس بارہ میں خود "سب رس" کی عبارت نقل کی

ہے۔ آخر میں یہ تذکرہ کرکے وجہی نے سب رس میں اپنی مثنوی قطب مشتری کا
کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ یہ ساری بحث ختم کر دی ہے۔

وجہی کی مثنوی قطب مشتری کی اہم حیثیت ہے۔ اس کی تصنیف ۱۰۱۸ھ ہجری
میں ہوئی ہے یعنی قطب شاہی عہد کی سب مثنویوں میں قدیم ہے۔ اس سے
مصنف کے حیات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس
مثنوی کی تصنیف ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ یہ مثنوی
غالباً کسی فارسی قصہ کا ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ خود مصنف کی دماغی پیداوار ہے ان
تمام امور کے مدنظر یہ مثنوی وجہی کے تصانیف میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے،
سب رس کے مقدمہ میں خصوصاً جب قطب مشتری کا ذکر آگیا ہے۔ تو اسکے متعلق
کسی صراحت کا نہ ہونا خالی از حیرت نہیں ہے۔

مولانا نے سب رس کے سنہ تصنیف کو ۱۰۴۵ھ قرار دیا ہے،
اس کو دیکھ کر ایک پرانی بات یاد آئی۔ اس کا تذکرہ اس موقعہ پر بے محل نہیں
ہے۔ رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۲۴ء میں مولانا نے علمی دنیا سے اس کتاب
کا تعارف کرایا۔ ہمیں اول سے اعتراف ہے۔ کہ اس کتاب کو گمنامی سے نکالنے
اور اس طرح دکھنی ادب کی تاریخ کے لئے نیا مسالہ فراہم کرنے کا سہرا مولانا کے

ہی سر ہے۔ اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے مولانا نے تحریر فرمایا تھا:۔

"افسوس ہے کہ مصنف نے کتاب میں کہیں سنہ تصنیف نہیں لکھا مجھے اس کتاب کے دو نسخے دستیاب ہوئے ایک کئی سال ہوئے حیدر آباد میں ملا اور دوسرا بیجاپور میں، دونوں نسخے خوش خط اور بہت صاف لکھے ہیں، جس سے مجھے مقابلہ اور صحت میں بہت مدد ملی۔ . . . سلطان عبداللہ ساڑھے گیارہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوئے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب سنہ ۱۰۴۰ھ کے بعد کی تصنیف ہے فضلی کی دہ مجلس سے تخمیناً ایک صدی قبل کی سمجھنی چاہیئے، غواصی بھی اسی عہد کا ایک مشہور شاعر اور میاں وجہی کا ہم عصر ہے۔ اس کی تصنیف طوطی نامہ کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۲۷ اور ایک دوسری مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا سنہ ۱۰۳۵ھ ہے سب رس اسی کے لگ بھگ لکھی گئی ہے"۔ اس کے بعد ہی دکن میں اردو شائع ہوئی۔ مؤلف نے "سب رس" کے سنہ تصنیف کے متعلق لکھا ہے۔ کہ حال میں اردو رسالہ میں مولوی عبدالحق صاحب نے اس کے متعلق ایک دلچسپ مضمون شائع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صاحب مضمون کے پاس دو نسخے ہیں، جو سنہ ۱۰۰۱ھ اور سنہ ۱۱۰۷ھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ رسالہ اردو میں جو

مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق صاحب نے تحریر فرمایا ہے
کہ باوجود دو مکمل نسخے پیش نظر ہونے کے تاریخ تصنیف معلوم نہیں ہو سکی حالانکہ
خاتمہ کے کچھ پہلے جس کا نمونہ خود مولوی صاحب نے بھی دیا ہے سنہ تصنیف
موجود ہے (صفحہ ۱۷ طبع اول)۔

اب مولانا "سب رس" کے سن تصنیف کے متعلق مقدمہ میں ارشاد فرماتے ہیں "کہ سب رس"
کا سن تصنیف سنہ ۱۰۴۵ھ ہے چنانچہ خاتمہ کتاب میں لکھا ہے۔ کہ بارے جس وقت
تھا۔ ایک ہزار چہل و پنج اس وقت ظہور پکڑیا یہ گنج"۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں جب کہ مولانا دونوں نسخوں کو بہ تمام و کمال ملاحظہ فرما چکے
تھے اور تصحیح اور مقابلہ کے مراحل طے ہو چکے تھے۔ سنہ تصنیف کہاں تھا؟
اور اب کہاں سے آ گیا؟

اس کو ختم کر کے مولانا نے کتاب کی اہمیت اور خصوصیت پر مختصراً جو بھی
لکھا ہے۔ اس سے ہمیں لفظ بہ لفظ اتفاق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "یہ کتاب
ادبی نظر سے قدیم اردو میں خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ قصہ بھی عجیب
ہے اور طرز بیان بھی عجیب ہے۔ مصنف نے ایک عام اور عالمگیر حقیقت کو مجاز
کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور حسن اور عشق کی کش مکش اور عشق و دل کے

معرکہ کو قصہ کی صورت میں پیش کیا ہے ۔ یہ بڑے مزے کا قصہ ہے اور کون ہے جو اس کوچہ سے ناآشنا ہو اور جس نے اس معرکہ میں چوٹ نہ کھائی ہو۔"
خوب معلوم ہوتا ہے ۔ کہ مولانا نے بھی اس کوچہ میں "دل صد پارہ" کی قاش فروشی "فرمائی ہے لیکن صرف چوٹ کھائی ہے ۔ آگے کی کچھ خبر نہیں ؛۔

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

آگے چل کر سارے مقدمہ کی جان نظر نہ آئی ۔ مولانا کی تلاش و تفحص کی داد دینی ہے ۔ کہ وجہی کی ایک بڑی چوری پکڑ لی ۔ رسالہ اردو کے ابتدائی مضمون اور اس مقدمہ میں تازہ اضافہ صرف یہی جز ہے اور مولانا نے اس کی تیاری میں اپنا کافی وقت صرف فرمایا ہے ۔ مولانا فرماتے ہیں " وجہی نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا ۔ کہ یہ قصہ اسے کہاں سے ملا و دیباچہ پڑھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے ۔ کہ گویا یہ اس کی ایجاد ہے اور اس کے دماغ کی اپج ہے یہ پر لطف داستان سب سے پہلے یحییٰ بن سبک فتاحی نیشاپوری نے لکھی ۔"

اس کے متعلق مولانا نے چار صفحوں میں اپنے خیالات واضح کئے ہیں اور بلاشبہ اچھی اور صاف صاف بحث کی ہے ۔

فتاحی کے حالات وجہی کے حالات سے زیادہ بیان کئے ہیں ۔ ان کی

تصانیف کا حال بھی لکھا ہے جس میں ان کے طباعت کا بھی تذکرہ آ گیا ہے اور نیز فتاحی کے ترکی ترجموں کا بھی پتہ بتایا ہے اور نیز ہندوستان میں بھی فتاحی کی نظم کی جو نشر ہوئی۔ وہ بھی بیان کر دی گئی ہے لیکن واضح ہو۔ کہ خوش قسمتی سے ان سب حالات کے بیان کرنے میں مولانا کو مسٹر آر۔ ایس گرین شیلڈس۔ آئی۔ سی۔ ایس کا بقول مولانا "مختصر دیباچہ" مل گیا۔ جو انہوں نے فتاحی کی مثنوی "دستور عشاق" پر لکھا ہے۔ فتاحی کی یہ کتاب جیسا کہ خود مولانا نے پتہ دیا ہے۔ مسٹر گرین شیلڈس نے ۱۹۲۶ء میں شائع کی، البتہ مولانا نے حسن و دل کے قصہ کے ایک ہندوستانی نظم کا بھی پتہ چلایا ہے جس کی کتاب جامعہ بمبئی کے کتب خانہ میں ہے۔

اس کے بعد تین صفحوں میں فتاحی کی کتاب کا ماخذ ہونے کے ثبوت میں دونوں کتابوں کا مقابلہ کر کے ثابت کیا ہے اور اس میں یقیناً مولانا کامیاب ہوئے ہیں۔

واضح ہو کہ فتاحی کی کتابوں میں دستور عشاق مثنوی ہے جس میں حسن و عشق کا قصہ نظم کیا ہے۔ اس قصہ کو شاعر نے حسن و دل اور شبستان خیال کے نام سے الگ الگ بھی دستور عشاق کے بعد لکھا ہے حسن و دل نثر میں دستور عشاق

کا خلاصہ ہے۔ مولانا نے ثابت کیا ہے کہ وجہی کو فتاحی کی حسن و دل ہاتھ لگ گئی تھی، دستور عشاق اس کی نظر سے نہیں گذری اور وجہی نے سارا قصہ حسن و دل سے ہی اخذ کیا ہے۔

حسن و دل کا نام لیتے ہی ہمارے ذہن میں ایک اور بات یاد آئی، ناظرین بھی اس کو ذہن میں رکھیں۔

مولانا کا مضمون رسالہ اردو میں شائع ہونے کے بعد جس طرح ایک "کودک نادان" نے سنہ تصنیف کا پتہ چلایا تھا۔ اسی طرح ایک کہنہ مشق استاذ تاریخ نے بھی یہ پتہ چلایا۔ کہ "سب رس" "حسن و دل" سے ماخوذ ہے۔ (اردو ئے قدیم طبع اول صہ ۱۰۶) اور اس کے مصنف وغیرہ کے حالات میں ایک خاص ضمیمہ لکھا (صہ ۱۱۸) اس ضمیمہ میں حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسی کو مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ نے اپنے مقدمہ میں دہرایا ہے۔

مولانا نے سنہ کو دیکھ کر اپنے مسودہ میں جس طرح اصلاح کر لی ہے، اسی طرح معلوم ہوتا ہے۔ کہ حسن و دل کا پتہ پاکر اس کا کھوج لگا لیا۔ حوالہ دیا تو مسٹر گرین شیلڈس کا اور بیچارے حکیم شمس اللہ قادری کا کہیں پتہ بھی نہیں۔

اس کے بعد اصل کتاب یا قصہ کا خلاصہ (۱۹) صفحوں میں کیا گیا ہے۔ اور

اس کو ایک کامیاب خلاصہ قرار دینے میں کوئی شخص کسی قسم کی رد و کد نہیں کر سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ خلاصہ نہ کہ مقدمہ بقول مولانا شیخ چاند صاحب بجائے خود ہمارے ادب کا نمونہ ہے۔ رواں عبارت صاف اور سلجھا ہوا اسلوب مناسب اور موزوں الفاظ مختصر یہ کہ مولانا نے اپنے زور بیان کا پورا ثبوت دیا ہے اس کے پڑھنے سے واقعی دل پر اثر ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ عبارت کے ساتھ ساتھ جادو بھی چلا ہے۔ مولانا نے درحقیقت موتی بکھیرے ہیں۔

اس کے بعد مولانا نے پھر تقریباً دو صفحے عقل و جذبات کے گورکھ دھندے کو سمجھانے میں صرف کئے ہیں اس بیان میں بھی مولانا نے قلم کی چستی خوب دکھائی ہے لیکن مولانا بعینہٖ یہی خیالات دوسرے الفاظ اور دوسرے انداز میں اس سے پہلے ظاہر کر آئے ہیں۔ ایک ہی خیال کو بار بار دہرانا گو نئے الفاظ اور نیا اسلوب کیوں نہ ہو ذہن میں کسی قدر گرانی ضرور پیدا کرتا ہے۔ مولانا یہ خیالات ایک ہی جگہ اول یا آخر ظاہر فرماتے تو مقدمہ میں تکرار کا عیب پیدا نہ ہوتا۔

پھر مولانا نے ڈیڑھ صفحے میں فتاحی کی شستہ زبان پاک صاف بیان اور اعلیٰ خیالات کی بڑی اچھی داد دی ہے۔ اس کی یہاں ضرورت تھی یا نہیں

اس پر بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ یہ ذوق کی باتیں ہیں۔

آگے چل کر مولانا نے فتاحی اور وجہی کی کتابوں کا مقابلہ کر کے دونوں کے اختلاف کا اچھی طرح ذکر کیا ہے۔ اس بحث کو ختم کر کے مولانا نے وجہی پر بڑی قوت سے گرفت کی ہے۔ ہمیں اس ساری بحث سے لفظ بہ لفظ اتفاق ہے وجہی نے کتاب میں جگہ جگہ پند و نصیحت کا دفتر کھولا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کی ساری پند و نصیحت مکڑی کے جال سے زیادہ کمزور ہے۔ جس شخص میں جذبہ دیانت کا اس قدر کال ہو وہ کس برتے اور بل بوتے دوسروں کو اخلاق کا درس دے سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے۔ کہ جس زمانہ میں وجہی نے کتاب لکھی۔ اس وقت حسن و دل عام اور متداول کتاب ہو۔ سب لوگ جانتے ہوں۔ کہ "سب رس" کس سے اخذ کی گئی ہے۔ بنا بریں وجہی نے اس کا حوالہ دینا ضروری نہ خیال کیا ہو۔ لیکن اس کو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ وہ کتاب صرف اپنے زمانہ ہی کے لئے نہیں لکھ رہا ہے۔ زمانہ آیندہ میں بھی وہ کام آئے گی۔ وجہی کی یہ کمزوری واقعی قابل افسوس ہے۔ اس بارہ میں مولانا کا بیان اس قابل ہے۔ کہ وہ بار بار پڑھا جائے۔ ایک حصہ بیان یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

"اس کا کہنا بالکل درست ہے۔ کہ جو کوئی کسی خیال کسی اسلوب یا کسی بات کا موجد ہے۔ اس کا احسان ماننا ضروری ہے اور جس سے کوئی نکتہ حاصل کیا جائے۔ اس کا اعتراف کرنا لازم ہے لیکن وجہی کے منہ سے یہ بات کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اس نے سارا قصہ شروع سے آخر تک فتاحی سے لیا۔ اور کہیں اس کا اقرار نہیں کیا اور یہی نہیں۔ بلکہ تحریر کا اسلوب بھی اس سے اڑایا ہے۔ یہ مانا کہ وہ فارسی تھی اور یہ دکھنی ہے۔ اس حالت میں وہ اخلاقی فرض اور انصاف جس کی تلقین وجہی نے اس طمطراق سے کی ہے۔ کہاں باقی رہا۔ وہ کس منہ سے توقع کر سکتا ہے۔ کہ آیندہ اس راستہ پہ چلنے والے اسے موجد مانیں گے۔ اس کی تقلید کرنے والے اسے استاد سمجھیں گے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی۔ کہ دیگراں (؟) نصیحت خود را فضیحت"۔

اس کو پڑھ کر ہمیں ایک اور بات یاد آگئی۔ ۱۳۲۹ھ میں مولوی عبدالجبار خان ملکاپوری مدرس مدرسہ عزہ نے محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن کے نام سے ایک کتاب اپنی تاریخ دکن کی دوسری کتابوں کے ساتھ طبع اور شائع کی۔ اس کتاب کی دوسری جلد میں یہ حقیقت روز روشن کی کی طرح واضح ہو چکی تھی۔ کہ شاہان گولکنڈہ نے دکھنی زبان میں بھی فکر شعر کی تھی۔ ان کی شاعری کی کیفیت

اور ان کے کلام کا نمونہ پیش ہو چکا تھا۔ ہاں بقول شیخ چاند صاحب مؤلف محبوب الزمن نے سلطان محمد قلی اور اس کے بھتیجے سلطان محمد کے دیوانوں کو ایک دوسرے سے منسوب کر دیا۔

اس کتاب کے شائع ہونے کے تقریباً دس سال بعد رسالہ اردو جلد دوم نمبر ۵ بابت ۱۳۴۱ء شائع ہوا۔ اس میں مولانا عبدالحق صاحب نے سلطان محمد قلی کا کامیاب تعارف بہ حیثیت ایک شاعر کے ناظرین سے کرایا۔ ہر طرف سے داد ملی اور ہر شخص نے احسنت کہا۔ لیکن اس سارے مضمون کو اول سے آخر تک پڑھ جایئے کہیں بھی صراحتاً اور نہ اشارۃً بلکہ کنایتہً بھی غریب عبدالجبار کا کوئی ذکر خیر نہیں۔ مانا کہ انہوں نے غیر علمی طریقہ سے سلطان محمد قلی کا تعارف کرایا۔ مانا کہ ان کے بیان میں شاعری سے بڑھ کر بادشاہی کے حالات ہیں مانا کہ انہوں نے ایک بھونڈے طریقہ سے کلام کا نمونہ پیش کیا لیکن کیا مولانا نے وجہی کے بیان سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ کہ :-

"جو کوئی کسی خیال کسی اسلوب یا کسی بات کا موجد ہو۔ اس کا احسان ماننا ضروری ہے اور جس سے کوئی نکتہ حاصل کیا جائے۔ اس کا اعتراف کرنا لازم ہے"۔

کلیات قطب شاہ کو جانے دیجئے۔ خود اس مقدمہ میں اردوئے قدیم دکن میں اردو اور رار دو شہ پارے کا حوالہ کیوں نہیں آیا؟ یہ بات بڑے مزے اور حیرت کی ہے۔

ہم الزام ان دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

اس کے ساتھ مولانا کے شاگرد رشید شیخ چاند صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"یہ بڑی ہمت اور اخلاقی جرأت کی بات ہے۔ کہ اس مدد اور فائدہ کا اعتراف کیا جائے۔ جو دوسروں سے پہنچے۔ عالی ظرف اہل قلم کا شیوہ یہ نہیں۔ کہ دوسروں کی محنتوں سے فائدہ اٹھائیں اور اس کا اعتراف کرنے سے شرمائیں یہ ایک قسم کا غصب ہے جس کو دوسروں کے متاع کے حق میں تنگ نظر روا رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی یا حکیم شمس اللہ قادری تو خیر مولانا کے سامنے دراصل کوئی حقیقت نہیں کہ یہ مولانا سے عمر میں اور معلومات میں بہت چھوٹے ہیں لیکن عبد الجبار تو مولانا کے بزرگ ٹھیرے۔ کم از کم ان کے خدمات کا تو اعتراف کرنا چاہیئے تھا۔ افسوس!!

اس مطلب کو چھوڑ کر مولانا نے وجہی کے طرز بیان اور اسلوب کا ذکر تقریباً

چار صفحوں میں کیا ہے۔ اس بیان میں تصویر کے دونوں رخ دکھانے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس بارہ میں جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں۔ ان سے اختلاف کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی سبب نہیں ہے البتہ خود مولانا کے بیان کے متعلق ہم کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مولانا کے خیالات میں عمیق اور گہرائی کا پتہ چلانا پڑتا ہے۔ "سب رس" کے سرسری مطالعہ سے جو باتیں ایک اوسط درجہ کا طالب علم اخذ کرسکتا ہے تقریباً اسی قسم کے خیالات مولانا نے ظاہر کئے ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) سب رس میں قافیہ کا التزام کیا گیا ہے لیکن باوجود اس کے اس میں سادگی اور روانی ہے۔

(۲) اپنے زمانہ کے لحاظ سے "سب رس" کی زبان نہایت فصیح ہے۔ اس نے دوسری زبانوں کے ضرب الامثال وغیرہ بے تکلفی سے چلا دیئے ہیں۔

(۳) مصنف اپنی زبان اور شمالی ہند کی زبان میں فرق کرتا ہے۔

(۴) مصنف نے اکثر جگہ قصہ سے گریز کرکے جو امور لکھے ہیں۔ ان سے اس زمانہ کے حالات اور زبان کا اچھا اندازہ ہوتا ہے۔

(۵) وجہی نے قصہ کے اثنا میں رہ رہ کر نصیحتیں شروع کر دی ہیں۔ جو اگرچہ

کام کی باتیں ہیں اور بیان بھی اچھا ہے لیکن قصہ کا لطف اس کی وجہ سے باقی نہیں رہ سکا۔

مولانا نے اس ضمن میں ایک دو جگہ غیر متعلق باتیں بھی لکھ دی ہیں۔ اور اس سے ربط اور تسلسل میں فرق آجاتا ہے۔ مثلاً یہ ذکر فرماتے ہوئے کہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے "سب رس" کی زبان نہایت فصیح ہے، "سب رس" کا ایک قول نقل کیا ہے:-

"آج لگن کوئی اس جہاں میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت . . . . سوں نظم ہور نثر ملا کر . . . . نہیں بولیا۔"

اس سلسلہ میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ:-

"دیکھئے کہ وہ اپنی زبان کو کبھی نہیں ہندی کہتا ہے۔ قصہ کے شروع میں بھی وہ آغاز داستان زبان ہندوستان لکھتا ہے۔

اس کے اس طرح کے ذکر کا یہاں کیا موقع و محل ہے؟

علاوہ ازیں مولانا نے ان سب نقاط پر ایک ایک دو دو چار چار سطریں لکھ کر ساری بحث ختم کر دی ہے۔ باتیں تشنہ کی تشنہ رہ گئی ہیں اور ایجاز مخل کی حد میں پہنچ گئی ہیں۔ اس کے قطع نظر تکرار بھی پیدا ہے۔ مثلاً جہاں وجہی

کی استادی اور اس کی کتاب کی برتری کا ذکر آیا ہے۔ مولانا اس کا پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں۔ اگر اس کا ذکر ایک ہی مقام پر چھیڑا جاتا۔ اور شرح و بسط سے اس کو واضح کیا جاتا۔ تو زیادہ بہتر اور مناسب ہوتا۔

اس مقام پر شیخ چاند صاحب کے الفاظ پھر یاد آتے ہیں۔ انہوں نے رسالہ اردو "سب رس" پر تنقید کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے :-

"مخدومی مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کا علمی تجربہ جامعیت اور اسلوب تحریر سفارش کرتا ہے۔ کہ وہ زیادہ وسعت اور سرگرمی سے اس کام میں کارفرما ہوں لیکن ان کی گوناگوں مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے زیادہ اصرار اور تقاضے سے شرم آتی ہے۔"

اس کے ہر لفظ سے ہمیں کامل اتفاق ہے۔ علاوہ برآں بہ لحاظ سن و سال یہ زمانہ مولانا کے آرام لینے اور سستانے کا وقت ہے۔ اس وقت ایام جوانی جیسی سرگرمی کا خیال کرنا محال ہے لیکن اس سن میں بھی مولانا کا جو انہماک ہے وہ خود جوانوں کے لئے قابل تقلید ہے۔

آخر میں مولانا نے سب رس کی عبارتوں سے اس زمانہ کے صرفی و نحوی قاعدوں کا بھی سرسری تذکرہ فرمایا ہے۔ سب رس کو پیش نظر رکھ کر دکن میں اردو کی جو مثنویاں لکھی گئیں۔ سب رس کی تصحیح میں جو نسخے پیش نظر تھے اور صحت میں جو مشکلات پیش آئیں ان کا حال بیان فرما کر یہ مقدمہ جس کو بجائے خود ہمارے ادب کا نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ کوئٹہ میں ۱۲ جون ۱۹۳۲ء کو ختم ہوا ہے۔

ہمارا خیال تھا۔ کہ پوری کتاب سب رس پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے مگر چونکہ سردست اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے صرف مقدمہ کی حد تک ہی نظر ڈالی گئی مگر ہم یہ بیان کریں گے کہ مقابلہ اور تصحیح بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ مولف سے زیادہ مقابلہ کنندہ کو دردسری کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ بڑی قابلیت اور معلومات کی بھی ورنہ اصل مطلب کے ساتھ قوسین کے اندر سوالیہ (؟) نشان کی ضرورت دائمی ہوتی ہے جیسا کہ ذیل کی مثال سے واضح ہو سکتا ہے۔

مولانا نے لچھمی نرائن شفیق کے تذکرہ شعرا (چمنستان شعرا) کی صحت کر کے شائع کیا ہے۔ سید عبدالولی عزلت کے حال میں شفیق نے صراحت کی ہے۔

" و آن جناب ہم اکثر بعزیب خانہ قدم رنجہ می فرمودند فقیر سوال ؟ ؛
بہ انعام آں جناب بہ دستخط نواب مستطاب نواب صلابت جنگ
بہادر رسانید بہ نظر انور گزرانید ص۴۶"

یعنی مولانا کو سوال کے معنی معلوم نہیں ہوئے۔ اس کی صراحت کی جاتی ہے
کہ زمانۂ سابق میں جو عرضی کسی استدعا کے متعلق بادشاہ یا دیوان کے ملاحظہ
میں پیش ہوتی تھیں تو اس کا نام اس زمانہ میں عرضی نہیں تھا۔ بلکہ سوال ہوتا
تھا۔ شفیق نے یہاں صراحت کی ہے۔ کہ عزلت کی درخواست انعام صلابت
جنگ کے ملاحظہ میں پیش کر کے اسی نے منظور کرائی تھی۔

مقدمہ کو ختم کرنے کے بعد بعض باتیں ہمارے ذہن میں اور آئیں ان کو
بھی بیان کر دینا ہم ضروری خیال کرتے ہیں۔

شیخ چاند صاحب نے درست لکھا ہے۔ کہ:۔
"بلند پایہ عالم اور مصنف کبھی خودستائی سے کام نہیں لیتا۔ وہ نہایت
عجز و انکساری اور متانت و بردباری سے اپنے خیالات اور معلومات کو
پیش کرتا ہے۔"

ہمیں اعتراف ہے کہ مولانا مدظلہ کبھی متانت اور بردباری کو ہاتھ سے

جانے نہیں دیتے۔ گو یہ درست ہے۔ کہ بعض مرتبہ تلخ حقیقتوں کو واضح کرنے میں ان کا قلم تلخ سے تلخ تر ہو جاتا ہے۔ لیکن اس مقدمہ میں اس کا کوئی نمونہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ عجز و انکساری کی صفت مولانا کے انداز بیان اور اسلوب تحریر سے نہیں ٹپکتی اور معاف فرمائیں بعض وقت خودستائی کی بو آجاتی ہے اور چونکہ خودستائی کے عنوان جدا جدا ہوتے ہیں۔ مولانا نے اس کے لئے دوسروں کی خوردہ گیری کا شیوہ منتخب نہ کیا ہے۔ دوسری باتوں کو چھوڑ کر صرف ایک بات لیجئے۔ مولف اور مصنف عموماً اپنے لئے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں اور یہ گویا ان کا قاعدہ ہو گیا ہے اور اس کے پڑھنے کے لئے کان آشنا ہو چکے ہیں لیکن ایسے مولف و مصنف جن کی طبیعت میں حقیقی انکسار رچ جاتا ہے۔ وہ عموماً ایسے مواقع پر جہاں اپنی ذات سے کوئی نسبت دینی ہو صیغہ مجہول استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب کوئی ان دونوں طریقوں کو چھوڑ کر واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ تو اس میں خودستائی کا کچھ نہ کچھ رنگ آ ہی جاتا ہے۔ مولانا نے ادائے مطلب کے اس طریقہ کو کم از کم مقدمہ "سب رس" میں استعمال کیا ہے۔

قدیم قلمی کتابوں کو صحیح پڑھنا اور ان کو صحیح طور سے مرتب کرنا جتنا کچھ

وقت طلب اور وقت لینے والا کام ہے۔ وہ اب ایک حقیقت نفس الامر ہے کسی کتاب کو صحیح کرکے اس کے آخر یا اوّل صحت کے مشکلات کا ذکر کرنا ایک مبتذل قافیہ میں طبع آزمائی کرنے کے مصداق ہے۔ اس شکل کو اس قدر دہرایا جاچکا ہے۔ کہ اب اس میں بالضرور "بھونڈا پن" آگیا ہے۔ افسوس ہے کہ ایسی بھونڈی باتوں کے ظاہر کرنے پر مولانا اب بھی راغب ہیں چنانچہ اس مقدمہ کی تان بھی اس پر ٹوٹی ہے۔ یہ باتیں مبتدیوں کے ظاہر کرنے کی ہیں۔ اہل علم کب تک ایسی چھوٹی باتوں کو فخر و امتیاز کی نشانی کے لئے ظاہر کرتے رہیں گے؟

رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۲۷ء میں مولانا نے علمی دنیا سے اس کتاب کا تعارف کرایا اور وعدہ فرمایا تھا۔ کہ "یہ کتاب عنقریب انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کی جائے گی۔ شروع میں ایک مقدمہ اور آخر میں مفصل فرہنگ ہوگی کتاب کی صحت بڑی احتیاط اور غور سے کی گئی ہے۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ کتاب اس زمانہ میں تصحیح کے مراحل طے کر چکی تھی لیکن پھر بھی کتاب کے طبع اور شائع ہونے میں آٹھ سال گذر گئے مولانا نے خود اس تاخیر کو محسوس فرمایا ہے اور اب مقدمہ کے آخر میں لکھا

ہے۔ کہ :-

"اول تو قلمی نسخوں کا پڑھنا جن کے رسم خط کی وجہ سے طرح طرح کی غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ پھر ایسی پرانی زبان کا پڑھنا اور سمجھنا جس کے اکثر محاورے اور الفاظ نہ اب بولے جاتے ہیں اور نہ سمجھے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر کاتبوں کی اصلاح یہ ایسی دقتیں ہیں۔ کہ مقابلہ، تصحیح اور تحقیق میں بہت وقت صرف ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے۔ کہ اس کتاب کے چھپنے میں اتنی دیر ہو گئی"

لیکن آج سے آٹھ سال قبل ہی مولانا ارشاد فرما چکے ہیں۔ کہ یہ زینہ طے ہو چکا ہے۔ البتہ یہ آٹھ سال فتاحی اور اس کی تصانیف کا پتہ چلانے اور مقابلہ کرنے میں صرف ہوئے۔ کیونکہ اس آٹھ سالہ مدت میں سوائے اس ایک اضافہ کے کوئی اور اضافہ قابل تذکرہ نہیں ہے۔

واضح ہو کہ علمی کتابوں کی نکاسی کا ہندوستان میں جو عالم ہے۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ پھر قدیم دکھنی ادب کی کتابوں کی نکاسی کے لئے تو صبر انتظار کی ساری منزلیں طے کر دینی پڑتی ہیں۔ انجمن ترقی اردو لاکھ علمی انجمن ہوا کرے اور لاکھ اس کا مقصد قدیم ادب کو زندہ کرنا ہو۔ لیکن آخر اس کو بھی اپنی مطبوعات کے لئے بازار فراہم کرنا لابد ہے۔ بازار بھی فراہم ہوا اور انعام وصلہ کا میدان

بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ بہرحال اس اثنا میں سب رس جامعہ عثمانیہ کے ایم۔ اے کے درسی کتابوں میں شامل کرادی گئی۔ گاہک تو ظاہر ہے۔ کہ کم ملیں گے لیکن چونکہ اب یہ کام جامعہ عثمانیہ کی خاطر ہوا ہے۔ اس لئے انشاء اللہ انعام و صلہ کا میدان ہاتھ سے نہ جائے گا۔

مولانا اس زمانہ میں مسند نشین بزم ادب ہیں اگر ان کی رواں اور شستہ تحریر سے زبان و محاورہ وغیرہ کی غلطیاں نکالی جائیں۔ تو ان کو بلا کسی رد و کد کے کاتب اور سنگساز کے سر تھوپ دیا جائیگا۔ تماشا ہے کہ یہ کم بخت مولانا کی تحریر کو بھی مسخ کر دینے سے نہیں چوکتے۔ چونکہ یہ تحریر یوں بھی بہت طویل ہو گئی ہے۔ اس لئے اب صرف اس نقطۂ نظر سے مقدمہ پہ ایک بہت سرسری نظر ڈال کر ہم اس تنقید کو ختم کر دیں گے۔

۱۔ پرانی باتیں دل سے نکلتے ہی نکلتی ہیں ص ۱ سطر ۳ اس کا مطلب ہماری سمجھ میں تو نہ آیا۔ شاید مولانا کی مراد یہ ہے۔ کہ پرانی باتیں دل سے نکلتے نکلتے ہی نکلتی ہیں۔

۲۔ اردو کی پہلی کتاب فصلی سے منسوب کی جاتی ہے۔

یہاں اردو کی پہلی کتاب سے مولانا کا مفہوم ادا نہیں ہوا۔ کیونکہ اردو کی پہلی کتاب نثر کی بھی ہو سکتی ہے اور نظم کی بھی۔ بلکہ نظم و نثر دونوں کی اور وہ اردو کی پہلی کتاب بھی جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے (جس کو خود انجمن نے بھی درس عثمانیہ کے نام سے شائع کیا ہے اور جو چھوٹے بچوں کے لئے مرتب ہونے کے باوجود کتابت اور سنگسازی کی بیسیوں غلطیاں رکھتی ہیں) یہاں مولانا غالباً "اردو نثر کی پہلی کتاب" لکھنا چاہتے ہوں گے لیکن بھول گئے۔

۳۔ گانا اور ناچنا انسان کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا۔ فطرت میں ہر جگہ ناچ اور گانا نظر آتا ہے ص۲ سطر ۱۵۔

یہاں دونوں جملوں میں ایک محض حشو ہے۔

(۴) دکھنی یعنی قدیم اردو ص۳ سطر ۱۹

دکھنی لکھنا کافی ہے۔ اس کے ساتھ قدیم اردو کا اضافہ غیر ضروری ہے مولانا نے بعض جگہ دکھنی اور بعض جگہ اردو اور بعض جگہ قدیم اردو سے ایک ہی مراد لی ہے۔ اس لئے بعض وقت بڑا خلط بحث ہو جاتا ہے۔

(۵) قطب شاہی بادشاہوں کے عہد میں دکھنی کو بہت فروغ ہوا۔ یہ علم وہنر

کے بڑے سرپرست تھے شعرائ اور علماء ان کے دربار کی رونق تھے۔ خود ان میں سے بعض بڑے پایہ کے شاعر ہوئے ہیں صفحہ ۳ "خود ان میں سے بعض" سے مولانا کی کیا مراد ہے۔ ایا علماء اور شعرا یا قطب شاہی بادشاہ مراد ہیں لیکن اُن کی ضمیر سے قریب ترجو اسم ہے وہ علماء اور شعراء ہے۔ بہ لحاظ قاعدہ ان کا مرجع علما اور شعرا ہونا چاہیئے۔

۶۔ اہل ہند سے مراد مصنف کی ہمیشہ شمالی ہند والے ہیں۔ اس جملہ کی نشست میں کچھ گڑبڑ سی ہے۔ اس میں بھی کوئی ایک جملہ حشو ہے۔

کتاب کے آخر میں ایک غلط نامہ بھی شامل ہے لیکن افسوس ہے کہ مقدمہ کی غلطیوں کے لئے کوئی جگہ نہ آئی۔ طباعت کی غلطیوں کا بتانا بدمذاقی ہے لیکن چونکہ مولانا کے دبستان تنقید میں اس پر بھی گرفت کی جاتی ہے اس لئے ایسی چند غلطیوں کا بھی ظاہر کرنا بے محل نہیں ہو سکتا۔

۱۔ اطلاح بجائے اطلاع صفحہ ۲۰ سطر ۱۸

۲۔ برافرختہ بجائے برافروختہ صفحہ ۲۹ سطر ۲

۳۔ بردری بجائے پردری

۴۔ پرشان بجائے پریشان صفحہ ۱۰

۵۔ مفت بجائے منت صفحہ ۱۷

ایک اور امر قابل ذکر ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں: "ایک بات البتہ سمجھ میں نہ آئی۔ کہ اس مثنوی میں وہ ہر جگہ اپنا نام وجہی لکھتا ہے۔ ۔ ۔ لیکن "سب رس" میں جہاں کہیں اس کا نام آیا ہے وہاں وجہی لکھا ہے۔ ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے وجہی اور وجیہی دونوں طرح اپنا نام لکھا ہے۔"

مولانا کا ارشاد ہے۔ کہ یہ بات البتہ سمجھ میں نہیں آئی لیکن ہماری سمجھ میں ایک بات آئی ہے ممکن ہے۔ کہ صحیح ہو اور ممکن ہے غلط ہو۔ واضح ہو کہ وجہی یا وجیہی نام نہیں ہے بلکہ تخلص ہے۔ البتہ یہ تخلص اس نے اپنے نام کی نسبت سے اختیار کیا ہے۔ اس کے نام کی اب تک کسی نے تحقیق نہیں کی ہے۔ اس کا نام وجہ الدین یا وجیہ الدین ہی سے کوئی ایک ممکن ہے۔

وجہ کے معنی جہاں منہ کے ہیں۔ وہاں سید القوم وغیرہ کے بھی آتے ہیں۔ اس طرح وجیہہ کے معنی جہاں عزت دار وغیرہ کے ہیں۔ وہاں سید القوم کے بھی ہیں۔ چونکہ اس نے اپنا تخلص اولاً وجیہی قرار دیا ہے۔ اس لئے

قیاس چاہتا ہے۔ کہ اس کا نام وجیہہ الدین ہے۔

وجیہہ کی نسبت ازروئے قاعدہ وجہی ہوتی ہے۔ جیسے کہ مدینہ سے مدنی اور جہنیہ سے جہنی لیکن وجیہہ کی نسبت خلاف قیاس وجیہی بھی آتی ہے جیسے سلیقہ کی نسبت سلیقی خلاف قیاس آتی ہے۔ یہ ثابت ہے۔ کہ مثنوی قطب مشتری پہلی تصنیف ہے اور اس میں شاعر نے وجیہی تخلص استعمال کیا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے۔ وہ حسب قاعدہ وجہی تخلص استعمال کرنے لگا۔ اور اس کو اس نے سب رس میں استعمال کیا ہے۔ اگر اس کے دو تخلص ہوتے۔ جیسا کہ مولانا نے لکھا ہے۔ تو ضرور تھا۔ کہ وہ ہر کتاب میں کہیں وجہی اور کہیں وجیہی لکھتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ قیاس کرنا ناگزیر ہے۔ کہ اس نے اولاً وجیہی تخلص اختیار کیا اس کے بعد اس کو ترک کر کے وجہی اختیار کیا۔ یہ حل ہے۔ وجیہی اور وجہی کے معمے کا۔ ۶

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

ہمیں افسوس ہے۔ کہ تحریر بہت طویل ہو گئی اور اس میں بعض جگہ غالباً تلخی بھی پیدا ہو گئی ہے لیکن کتابوں کے متعلق اس قسم کی کھری تنقید

کرنے کا ڈھنگ خود مولانا کا ہی نکالا ہوا ہے۔ اس لئے ہم نے خود مولانا کی کتاب پر تنقید کرنے میں اس کی تقلید کی ہے۔

ایک زمانہ تھا۔ کہ لوگ مولانا کے مقدمات کو سارے ادبی و علمی معائب سے منزا خیال کرتے تھے۔ مگر اب وہ زمانہ کہاں۔

جو کچھ ہم نے لکھا ہے۔ وہ کسی خصومت کی بنا پر نہیں ہے۔ مولانا ہمارے بزرگ ہیں۔ ہم ان کا ہمیشہ ادب اور لحاظ کرتے رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ آیندہ بھی کریں گے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ فقط

رہبر دکن ۱۳۴۲ھ ف

اردو لٹریچر (مصنفہ ڈاکٹر بیلی) اور رسالہ اردو

ڈاکٹر بیلی نے جو لنڈن یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ حال میں ایک کتاب انگریزی زبان میں اردو ادب کے متعلق تصنیف کی ہے' اس پر آیندہ تفصیلی تنقیدی نظر ڈالی جائے گی۔ اس وقت ہم کو ان چند امور پر توجہ کرنی ہے۔ جو اس کتاب کے متعلق رسالہ اردو کی تنقید میں ظاہر ہوئے ہیں۔

جولائی ۱۹۳۳ء کے رسالہ اردو میں اس کتاب پر تنقید ہوئی ہے۔ جو خاص علامہ عبدالحق صاحب کے قلم حقیقت نگار کی رہین منت ہے۔ علامہ عبدالحق نے جو اعتراضات اس کتاب پر فرمائے ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو نفس مضمون سے متعلق اور دوسرے وہ جن کو نفس مضمون سے تعلق نہیں ہے پہلے دوسری قسم کے اعتراضات پر بحث کی جاتی ہے۔

۱۔ سب سے پہلا اور زبردست اعتراض مولانا کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

"ابتدائی اردو کے ابواب کے ماخذ زیادہ تر پنجاب میں اردو اور اردوئے قدیم اور اردو شہ پارے اور رسالہ اردو کے وہ مضامین ہیں۔ جو اس رسالہ میں ابتدائی اردو کے متعلق وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے قابل شاگرد (ڈاکٹر زور) کی طرح ایک نقاد کے رسالہ اردو کے مضامین کے حوالہ دینے کی قسم کھائی ہے"۔

مولانا کو ہر شخص سے اس امر کا گلہ رہتا ہے۔ کہ وہ اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیتا۔ بیشک اس کی شدید ضرورت ہے کسی کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر

اس امر کا اعتراف نہ کرنا درحقیقت بڑی ناانصافی ہے۔ مگر اسی عیب میں
خود مولانا بھی مبتلا ہیں۔ اس کے متعلق ہم نے تفصیل سے مقدمہ "سب رس"
کی تنقید میں صراحت کی ہے۔ مولانا بڑے شدومد اور طمطراق سے ہر مصنف
کو یہ مشورہ دیا کرتے ہیں۔ کہ "جو کوئی کسی خیال کسی اسلوب یا کسی بات کا موجد
ہو۔ اس کا احسان ماننا ضروری ہے اور جس سے کوئی نکتہ حاصل کیا جائے اس کا
اعتراف کرنا لازم ہے۔" مگر جب خود مولانا کے خامہ جادو رقم سے کسی کتاب کا مقدمہ
یا کوئی مضمون وجود میں آتا ہے۔ تو اس حقیقت کو فراموش کر جاتا ہے۔ چنانچہ
سب رس والی تنقید میں بتایا جا چکا ہے۔ کہ کس طرح مولانا نے عبدالجبار ملکاپوری
حکیم شمس اللہ قادری، ڈاکٹر زور اور دوسرے مولفوں کی تحقیقات سے بلا تامل
استفادہ کر لیا اور حوالہ دینے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔

نفس واقعہ یہ ہے۔ کہ ڈاکٹر بیلی نے اپنی کتاب میں قدیم اردو کے متعلق
جس جس کتاب سے جو کچھ اخذ کیا ہے۔ اس کا حوالہ فہرست ماخذات میں دے
دیا ہے۔ مثلاً اردو شہ پارے۔ دکن میں اردو۔ اردوئے قدیم وغیرہ۔ اس سے
واضح ہے۔ کہ ڈاکٹر بیلی نے رسالہ اردو کی تحقیقات سے استفادہ نہیں کیا

مرتب حالت میں جب مواد مہیا ہو گیا ——————

تو پھر غیر مرتب مضامین رسالوں سے مواد اخذ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ غالباً اسی بنا پر رسالہ اردو سے استفادہ نہیں کیا گیا۔ لامحالہ حوالہ دینا بھی ضروری نہیں تھا۔

(۲) دوسرا اعتراض حسب ذیل کیا گیا ہے:۔

"اس چھوٹی سی کتاب کو جس کا حجم سو صفحے سے زیادہ نہیں ایسے شاعروں کے ذکر سے جو اردو ادب میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے یا ابتدائی دور کے ایسے اشخاص کے تذکرے سے جنہیں شاعر کہنا بدذوقی کی دلیل ہے۔ زیر بار کرنا کسی طرح جائز نہ تھا۔ عجیب بات ہے۔ کہ بعض ایسی بے حقیقت کتابوں کا ذکر کر دیا ہے۔ جن کے مصنف گمنام و بے نشان ہیں اور بعض ایسے غیر معروف اور ناقابلِ لحاظ شاعروں کے نام آ گئے ہیں جن کی کوئی کتاب یا نظم دستیاب نہیں ہوئی۔"

ڈاکٹر بیلی کے متعلق یہ اعتراض صرف اعتراض کی حد تک ہے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر مولانا تفصیل نہیں۔ تو صرف ایک آدھ مثال سے ہی اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے تھے حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ ڈاکٹر بیلی نے نہایت

انصاف کے ساتھ غیر طرفدارانہ طور پر دکن اور شمالی ہند کے شعرا اور مصنفین کو پیش کیا ہے اور ان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے :-

۳۔ تیسرا اعتراض حسب ذیل ہے :-

ڈاکٹر صاحب نے چند مباحث کے متعلق ذاتی جدت کا دعوے کیا ہے۔ مثلاً (۱) اردو کی ابتدائی تاریخ کی ابتدا اور اصل (۲) اردو میں دکن کی اہمیت اور دکھنی شعرا کا ذکر (۳) تحسین کی نوطرز مرصع۔ میر امن باغ و بہار اور امیر خسرو کے چہار درویش کے متعلق جدید معلومات لیکن کتاب کے مطالعہ سے اس جدت کی ساری حقیقت معلوم ہو جاتی ہے (نمبر ۱) کلیتہً پروفیسر شیرانی کی محققانہ تالیف پنجاب میں اردو سے ماخوذ ہے، نمبر (۲) رسالہ اردو کے مضامین اور ساردوئے قدیم یا ان دونوں کے خوشہ چینوں سے منقول ہے۔ (نمبر ۳) راقم کے مقدمہ باغ و بہار کا رہین منت ہے البتہ یہ ضرور ہے۔ کہ یہ چیزیں اب تک انگریزی سے روشناس نہیں ہوئی تھیں "

ایک بڑے شخص کے قلم کے لئے جو اپنے سن وسال کے کئی دہائی گزار چکا

ہے۔ اس قسم کے الفاظ ایک غیر زبان کی کتاب کے لئے ہرگز شایاں نہیں ہو سکتے۔ یہی اعتراض اس سے بہتر صورت میں دوسرے الفاظ میں کیا جا سکتا تھا ڈاکٹر بیلی کی کتاب کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے دعوئے کیا کیا ہے۔ مولانا کا یہ دعوے ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ کہ ڈاکٹر بیلی نے تمام تر پنجاب میں اردو اور رسالہ اردو یا اردوئے قدیم سے مواد اخذ کیا ہے۔ شاید مولانا کو معلوم نہیں۔ کہ رسالہ اردو میں جو چند مضامین قدیم اردو کے متعلق شائع ہوئے ہیں۔ اس سے بہت زیادہ مواد دوسری کتابوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اور ڈاکٹر بیلی نے تفصیل کے ساتھ اپنے ماخذوں کا ذکر کر دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابل تحریر ہے۔ کہ مولانا کے مقدمہ "باغ و بہار" سے پہلے ڈاکٹر بیلی نے اپنی تالیف ختم کر دی تھی۔ البتہ اس کی اشاعت بعد میں ہوئی۔ اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ زبان انگریزی میں ڈاکٹر بیلی سے پہلے کسی نے بھی اس قدر تفصیل کے ساتھ ان امور پر روشنی نہیں ڈالی تھی۔ اس لئے اگر ڈاکٹر بیلی نے یہ دعویٰ کیا ہے تو اس کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔

دوسری قسم کے اعتراضات وہ ہیں۔ جو نفس مضمون کے متعلق ہیں، قدیم اردو کے متعلق جو تحقیقات اس وقت ہوئی ہے۔ اس کا آج سے پندرہ بیس

سال قبل تک خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ آئندہ پندرہ
بیس سال میں اس سے زیادہ معلومات حاصل ہو جائیں اور اس کے لحاظ
سے ہمارے موجودہ معلومات صحیح قرار نہ پائیں۔ اس کے علاوہ قدیم شعرا اور
ان کے تصانیف کے متعلق ایک دشواری یہ بھی ہے، کہ کاتبوں کی عنایت
سے اشعار اور الفاظ مسخ ہو جاتے ہیں اور ان شعرا کے متعلق صحیح معلومات
کا ذریعہ بجز انہی کتابوں کے کوئی اور نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر کسی شاعر کے
نام اور تخلص کے متعلق کوئی دعوے کیا جائے اور کوئی دوسرا شخص اپنی معلومات
کے لحاظ سے اس کو غلط قرار دے۔ تو یہ کوئی بڑی بھاری غلطی اور ناقابل معافی
جرم نہیں ہو سکتا۔ نفس مضمون پر اس خامی سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو اعتراض
مولانا نے ڈاکٹر بیلی کی کتاب پر کئے ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر اسی قسم کے
ہیں۔ مثلاً :۔

(۱) قصہ ابو شحمہ کا مصنف محمد امین نہیں۔ بلکہ "اولیا" ہے۔

مولانا اپنے دعوے میں جو ثبوت پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ میرے
پاس اس کے متعدد نسخے ہیں کسی میں امین یا محمد امین نہیں آیا۔ بلکہ ہر نسخے
کے آخر میں اس کا نام اولیا لکھا ہوا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ مولانا اولیا کے متعلق کسی تاریخ یا تذکرہ سے ثبوت پیش نہیں کرتے۔ بلکہ چند نسخوں میں جو نام لکھا ہوا ہے۔ اس کے لحاظ سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر بیلی نے جو نام لکھا ہے۔ وہ بلوم ہارٹ کی کیٹلاگ اور ڈاکٹر زور کے اردو شہ پارے اور انڈیا آفس کے اصل مخطوطہ قصہ ابوشحمہ سے اخذ کیا ہے۔ ہماری رائے بھی یہی ہے۔ جو "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں ظاہر کی گئی ہے یورپ کے نسخہ کے علاوہ جو نسخے یہاں ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ ان میں اولیا نہیں ہے۔ بلکہ صاف طور پر امین کی صراحت ہے۔ اس طرح اگر مولانا اپنے نسخوں کے لحاظ سے قصہ ابوشحمہ کے مصنف کو اولیا قرار دیتے ہیں۔ تو ہم اس کے مصنف کو اپنے نسخوں کے لحاظ سے امین قرار دیتے ہیں۔

۲۔ ملک خوشنود کی ایک تصنیف یوسف زلیخا بتائی گئی ہے ....

.... خوشنود نے یوسف زلیخا نہیں لکھی۔

مولانا کا یہ دعویٰ کس بنا پر ہے۔ اس سے ہم واقف نہیں۔ کیونکہ کوئی ثبوت اپنے دعوے کی تائید میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ انڈیا آفس میں جو نسخہ ملک خوشنود کی ہشت بہشت کا ہے۔ اس میں مصنف نے واضح کیا ہے۔ کہ اس نے یوسف

زلیخا نام ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کے بعد ہم مجبور ہیں۔ کہ مولانا کے دعوے کو جو بلا دلیل ہے۔ ناقابلِ قبول قرار دیں۔ کیونکہ جب خود ملک خوشنود اس امر کا معترف ہے کہ اس نے یوسف زلیخا لکھی ہے۔ تو پھر علامہ ممدوح کا دعوے کس حد تک قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔

۳۔ مصنف قصہ ملکہ مصر کا نام محمد علی عاجز غلط ہے۔ اس نے اپنی تصنیف میں اپنا نام محمود بتایا ہے۔

مولانا کا یہ دعوے بھی کسی تاریخ یا تذکرہ سے نہیں۔ بلکہ مصنف کی کتاب سے ہے۔ ممکن ہے۔ کہ صحیح نہ ہو۔ نہ صرف ڈاکٹر بیلی بلکہ مصنف اردوئے قدیم اور مؤلف اردو شہ پارے کی رائے بھی یہی ہے۔ کہ قصہ ملکہ مصر کا مصنف سید محمد عاجز ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا کا دعوے بھی صحیح ہو۔ مگر کثرت کو ترجیح دی جانی چاہیئے۔

اسی ضمن میں مولانا وہ شعر نقل کر کے جس سے مولف کے نام کا محمود ہونا واضح ہوتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں :-

"یہ غلطی اردوئے قدیم سے بے سمجھے نقل کرنے سے ہوئی ہے۔"

مولانا کی اس تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مصنف اردوئے قدیم نے تو

ملکہ مصر کے مصنف کو محمود لکھا ہے۔ مگر ڈاکٹر جمیل نے غلطی سے سید محمد قرار دیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ مصنف اردوئے قدیم نے بھی سید محمد ہی لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو اردوئے قدیم کا حسب ذیل بیان :-

"عاجز سید محمد نام ہے۔ دکن کے رہنے والے تھے۔ دکھنی سلطنتوں کی تباہی اور عالمگیر کی فتوحات کا زمانہ انہوں نے دیکھا ہے۔ ان کی تصانیف سے ایک چھوٹی سی مثنوی دکن میں نہایت مقبول اور قصۂ ملکہ مصر کے نام سے مشہور ہے۔" ص۹۵ طبع ثانی

اب سمجھ میں نہیں آتا۔ آیا مولانا کو سچ سمجھیں یا مؤلف اردوئے قدیم کو۔ مولانا نے اردوئے قدیم میں نہیں معلوم کیونکر سید محمد کی جگہ محمود پڑھ لیا۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

(۴) ابوطالب طالب بلندہ کے باشندہ تھے۔ میرحسن اور قائم نے بھی یہی لکھا ہے۔ کہ بلندہ میں مضافات اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے غلطی سے حیدرآبادی لکھ دیا ہے۔"

یہی ایک اعتراض ہے جس کے متعلق خوش قسمتی سے مولانا نے کچھ ثبوت پیش کیا ہے اور وہ بھی میرحسن اور قائم کے تذکروں کا جو قدیم اردو

ادب کے متعلق کسی طرح سند نہیں ہو سکتے ۔

طالب کوئی مشہور شاعر نہیں ہے۔ ولی جیسے مشہور شاعر کے وطن کے متعلق ایک زمانہ تک بحث ہوتی رہی۔ تو پھر ایک غیر مشہور شاعر کے متعلق اگر بجائے اورنگ آباد کے حیدر آباد لکھ دیا گیا۔ تو کوئی بڑی قابل گرفت غلطی نہیں قرار دی جا سکتی خصوصاً اس وقت جب کہ اورنگ آباد حیدر آباد کا ہی ایک صوبہ ہے اور دکھنی شعراءِ عہدِ حاضر میں حیدر آباد پایہ تخت ہونے کی وجہ سے عام طور پر اسی کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں ۔

۵۔ شاہی کے متعلق مولانا ڈاکٹر بیلی کی غلطی ظاہر کرتے ہوتے ارشاد فرماتے ہیں "شاہی دو ہیں ، ایک علی عادل شاہ شاہی اور دوسرے شاہ قلی خاں شاہی ۔ دونوں کے مرثیے قدیم بیاضوں میں ملتے ہیں ۔"

مولانا کی تحقیقات سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے ۔ کہ علی عادل شاہ شاہی کے صرف مرثیے صاحب موصوف کی نظر سے گذرے ہیں ۔ حالانکہ کلیات شاہی کو علمی دنیا سے رسالہ معارف (مئی ۱۹۳۳ء) میں روشناس کرایا جا چکا ہے ۔ اور وہ کلیات دفتر دیوانی دمال (حیدر آباد) کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔ کیا مولانا اس کلیات سے ناواقف ہیں ؟ اگر ایسا ہے تو ایک محقق اردو کے لئے قابل استعجاب

ہے اور اگر واقف ہیں۔ تو اس سلسلہ میں اس مضمون اور اس کلیات کا حوالہ نہ ہونا عجیب تر ہے۔

(۶) "وجدی کی تصنیف تحفہ عاشقین نہیں۔ بلکہ تحفہ عاشقان ہے۔"

یہ کوئی اہم غلطی نہیں قرار دی جا سکتی۔ اگر انگریزی میں بجائے عاشقان کے عاشقین لکھا گیا تو کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی جب کہ جدید اردو کے لحاظ سے عاشقان غلط لفظ ہے۔ عاشقین صحیح ہے۔

(۷) "قیاسی کا صحیح نام سید محمد عبداللہ نہیں بلکہ سیدی عبداللہ ہے"۔

نہیں معلوم مولانا سید اور سیدی میں کیوں الجھتے ہیں۔ اگر ایک مصنف کے نام کے متعلق جس کے متعلق کوئی بیرونی ذخیرہ نہیں ہے۔ اگر بجائے سیدی کے سید لکھا گیا تو کیا بڑی غلطی ہو گئی جس پر لعن طعن کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔

اسی قسم کے ۲۳۔ اعتراض ڈاکٹر بیلی کی کتاب پر کئے گئے ہیں جن میں سے ۱۳ دکھنیات سے متعلق ہیں اور باقی شمالی ہند کے متعلق۔ چونکہ ہمارا موضوع صرف دکھنیات تک محدود ہے۔ اس لئے اس کے متعلق مولانا کے اعتراضوں کی حقیقت ظاہر کر دی گئی ہے اور کوئی تعجب نہیں۔ اگر کوئی شمالی ہند کے اردو

کے علمبردار اس کے متعلق مولانا کے اعتراضات پر غور کریں۔ تو وہ سب نقش بر آب ثابت ہوں اور اس امر کو اظہر من الشمس کر دیں۔ کہ مولانا ہر اس شخص سے خار رکھتے ہیں ۔۔ جو اردو ادب کی تاریخ کے کسی پہلو پر مولانا سے آزاد رہ کر کام کرتا ہو۔ اور کام کرنے کے بعد اس کتاب یا رسالہ کو مولانا کے اسم گرامی پر معنون نہ کرتا ہو۔

مندرجہ صدر تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے۔ کہ مولانائے محترم نے اعتراضات کی جو فرد مرتب کی ہے ۔ اس کا وزن کیا ہے؟ اس سے ڈاکٹر بیلی کی کتاب کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ انشاء اللہ کبھی تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

رسالہ شاہجہاں دہلی ۱۹۳۴ء

مغل اور اردو پر ایک سرسری نظر

نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال کو زبان اردو کے ساتھ جو شغف ہے ۔ اس سے ہم لوگ بخوبی واقف ہیں ۔ آپ کے اسی انہماک کا نتیجہ تھا۔ کہ ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ میں آل انڈیا اردو کانفرنس کا سب سے پہلا اجلاس

ہوا۔ تو اس کی صدارت کے لئے قرعۂ فال آپ ہی کے نام پڑا۔ اور آپ کا خطبہ صدارت پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔

داستانِ اردو کے نام سے آپ نے ایک کتاب تالیف کی ہے، اگرچہ یہ اب تک شائع نہیں ہوئی۔ مگر اس کا ایک باب "مغل اور اردو" کے نام سے ابھی شائع ہوا ہے اور اس وقت زیرِ بحث ہے۔

ابتداً نو صفحے آپ کے سوانح سے متعلق ہیں جس کو شائق احمد صاحب نے لکھا ہے، اس کے بعد دس صفحوں کا مقدمہ جمیل مظہری صاحب ایم۔ اے کا لکھا ہوا ہے۔ پھر دس صفحے فہرستِ مضامین کے ہیں، ان کے بعد نفسِ مضمون کل ۲۸۰ صفحوں میں مندرج ہے۔ اس حصۂ کتاب کا خط اس قدر جلی ہے کہ معمولی کتابوں کے خط میں وہ اس سے نصف جگہ میں بھی چھپ سکتا ہے۔

"مغل اور اردو" کے ذیلی عنوانات حسبِ ذیل ہیں:۔

مغل اور اردو۔ جہانگیر اور اردوئے معلّیٰ۔ سلیم اور اردوئے معلّیٰ۔ نورجہاں اور اردوئے معلّیٰ۔ اسی طرح خرم۔ داراشکوہ۔ عالمگیر ثانی۔ شاہ عالم جہاندار شاہ سلیمان شکوہ اکبر ثانی اور بہادر شاہ ثانی کے ناموں کے ساتھ اردوئے معلّیٰ کی صراحت ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ایک دو عنوان اردو اپنے

گھر میں طفل مکتب۔ اردوئے معلّٰی کی پہلی نثر وغیرہ کے قائم کئے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا عبارت سے واضح ہو سکتا ہے۔ کہ اس کتاب میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے۔ کہ سلاطین مغلیہ میں سے ہر ایک فرمانروا نے اردوئے معلّٰی کی کیا خدمت کی یا اس کے زمانہ میں اردو کو کیا ترقی ہوئی۔ اس میں زیادہ تر خیالی اور ادعائی اسباب و علل کی صراحت ہوئی ہے شعرا کا ذکر یا نمونہ کلام وغیرہ بہت کم بلکہ شاذ ہے۔

اس کتاب کے متعلق اظہارِ خیال کرنا اگرچہ ہمارے کارزارِ عمل اور احاطہ تحقیق و تفتیش کے لحاظ سے غیر ضروری ہے۔ لیکن چونکہ اس میں ضمنی طور پر بعض ایسے امور کا ذکر آ گیا ہے۔ جو آج غلط ثابت ہو گئے ہیں اور جن کی اشاعت دنیائے اردو میں غلط فہمیوں کا باعث ہوگی، اس لئے اس کتاب پر یہاں ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے۔ چونکہ صحیح تنقید کا مقتضیٰ یہی ہے۔ کہ کتاب کے محاسن کے ساتھ اس کے معائب بھی اگر ہوں۔ تو صراحت کے ساتھ ان کو پیش کیا جائے۔ ورنہ ایک قسم کی علمی و ادبی بددیانتی ہے۔ اس لئے اُن کا اظہار ضروری ہے ہمارے خیال میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔ تاکہ اس کتاب کے آیندہ اشاعت کے موقع پر ان کا لحاظ رکھا جائے۔

۱۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ مولوی شائق احمد صاحب نے نواب خیال کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ درحقیقت اس کی خاص ضرورت ہے۔ کیونکہ آئندہ نسل کو جب تک مصنف و مؤلف کے حالات معلوم نہ ہوں۔ ان کو اسی طرح دقت کا سامنا ہوگا۔ جیسا کہ زمانہ سلف کے مصنفین کے حالات کے متعلق ہم کو آج دقت ہوتی ہے۔ مگر ہم کو تعجب ہے کہ اس بیان میں جہاں معمولی معمولی غیر اہم حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ایک اہم واقعہ کو جو نواب صاحب کی زندگی سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ نظر انداز کر دیا گیا ہے جس کی کوئی خاص وجہ بھی ہمارے سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ فروگذاشت ان کے حیدرآباد کی ملازمت کے متعلق ہے سر سید علی امام مرحوم کے زمانہ صدارت عظمیٰ میں وہ یہاں ان کے پرائیوٹ سیکرٹری کی حیثیت سے مامور تھے اور ایک عرصہ تک حیدرآباد میں مقیم رہے۔

(۲) "عالمگیر اور اردوئے معلّیٰ" کے عنوان کو چھ جلی صفحوں میں لکھا گیا ہے (گویا خفی قلم سے تین صفحے ہوئے)، عالمگیر کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ ناکافی ہے، اس میں بہت کچھ اضافہ کی گنجائش تھی۔ عالمگیر نے اردو زبان کے شعرا کی جو سرپرستی فرمائی۔ اس کے اظہار کی خاص ضرورت تھی۔ کیونکہ عام طور پر یہ

خیال کیا جاتا ہے۔ کہ عالمگیر کو شعرا سے خاص نفرت تھی اور وہ شعر و شاعری کی قدر نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت کے خلاف ہے۔ اس وقت ہمارا یہ موضوع نہیں۔ ورنہ تفصیل کے ساتھ پیش کرتے۔ مگر ہم اس قدر ضرور اضافہ کرتے ہیں کہ جب عالمگیر نے دکن کو فتح کیا۔ تو دکھنی شاعروں کو طلب کر کے اُن کے کلام کو سنا اور ان میں سے نصرتی کو اُس کے کلام کے لحاظ سے ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز و سربلند کیا۔ چنانچہ تذکرہ فنوت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:-

"وقتیکہ شاہ اورنگ زیب غازی انار اللہ برہانہٗ ولایت دکن را تسخیر درآورد، حکم نفاذ داد کہ سخن سنجان ایں ملک را در نظر بگذرانند بموجب حکم گذرانیدند۔ کلام نصرتی را برہمہ افضل فرمودہ بخطاب ملک الشعرائے ہند سرفرازی داد۔ تذکرہ فنوت

۴۔ "طفل اردو کا مکتب" کے عنوان میں اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ عمدۃ الملک کا گھر گویا طفل اردو کا مکتب تھا۔ جو دلائل اس کے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔ وہ ناکافی ہیں۔ زبانی روایات بیشک صحیح ہو سکتے ہیں۔ مگر تحقیقات کے لئے جب تک تحریری ثبوت نہ ہو کبھی دعویٰ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی محقق ان پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

نواب صاحب اکثر جگہ بلا دلیل کے بڑی بڑی اور اہم باتیں لکھ جاتے ہیں

جن پر تعجب ہوتا ہے۔

اور پھر طفل اُردو صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس زمانہ میں اردو کی حالت طفلی

کی نہیں تھی۔ دکن میں وہ سن رشد کو پہنچ چکی تھی۔ البتہ اردوئے معلّٰی لکھا

جائے۔ تو صحیح ہوسکتا ہے۔

(۴۲) اسی عنوان کے تحت تحریر فرمایا گیا ہے :-

" نادر کے قہر و غضب کی آگ بھی انہی عمدۃ الملک نے بجھائی

. . . . آخر عمدۃ الملک کمر کس کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر

اس کے سامنے آئے۔ نادر نے پوچھا۔ خیر باشد محمد امیر

چہ میخواہی، انہوں نے دست بستہ عرض کی :-

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کُشی

مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی

یہ برجستہ و باموقع شعر سُنکر نادر نرم ہوا۔ تلوار میان میں کرکے کہا جبر

بخشیدم"۔ ص ۵۴

پھر اس کے نوٹ میں حسب ذیل امر کی بھی صراحت کی گئی ہے :-

"بعض ناواقفوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس موقع پر آصف جاہ نادر کے پاس گئے اور اس کے آتش غضب کو انہوں نے سرد کیا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔"

اس بیان کے متعلق ہمارے دو اعتراض ہیں، اول تو یہ کہ جو دعویٰ نواب صاحب نے کیا ہے۔ اُس کا کوئی ثبوت اور ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ گویا زبانی روایات کی بنا پر اس کو تحریر کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایسے بڑے دعوے کے لیے ثبوت کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ محقق بلا ثبوت کبھی ایسا دعوے کو قبول نہیں کر سکتا۔

دوسرے یہ کہ نفس حقیقت جو تاریخوں سے بخوبی ثابت ہے۔ اس کو اپنی ذاتی خیال کے باعث غلط قرار دیا جا رہا ہے۔ جو صحیح نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ کہ نادر شاہ کے قتل عام کے وقت آصف جاہ نے پیش قدمی کی اور نادر شاہ کے غصہ کو فرو کیا۔ عام اور مشہور واقعہ ہے جس پر مورخین نے صداقت کی مہر ثبت کر دی ہے۔ قطع نظر دکھنی مورخین کے ہم ایک شمالی مورخ ہی کے الفاظ یہاں پیش کرتے ہیں :-

محمد علی خان [illegible] پانی پتی نے اپنی تاریخ مظفری [illegible] میں جو ۱۲۲۵ھ

میں تصنیف ہوئی ہے۔ لکھا ہے :۔

"نظام الملک فتح جنگ و اعتماد الدولہ قمر الدین خاں نصرت جنگ سر برہنہ کردہ بہ زانو زدہ بہ الحاج تمام حکم اماں خواستند نادر شاہ حکم اماں دادہ داخل قلعہ ارک شد"۔

ص ۲۸۷ مخطوطہ کتب خانہ آغا حیدر حسن

اس کے بعد نواب خیال کے دعوے کو جو بلا ثبوت ہے۔ کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ ولی دکھنی کے متعلق حسب ذیل خیال کا اظہار کیا گیا ہے :۔

"اور تو اور ہمارے تذکروں میں میاں ولی دکھنی اردو غزلوں کے باوا آدم کہے جاتے ہیں اور کم نظری کی وجہ سے آج تک وہ سراہے جاتے جاتے ہیں۔ مگر یہ ایک ولی کیا کسی ولی نے زبان کی یہ کرامت کبھی نہیں دکھائی۔ حق یہ ہے۔ کہ ولی محمد شاہ کے شروع زمانہ میں اپنا دیوان بغل میں دبائے کھوٹے کھرے کی شناخت کے لئے دکھن سے دلّی کے ٹکسال گھر تک آئے اور اردو سیکھنے لگے"۔ (ص ۵۹)

اس بیان کے پڑھنے کے بعد اردو ادب کے عہد حاضر کے مطالعہ کرنے

والے حیران رہ جائیں گے۔ کہ نواب صاحب جیسے ادیب اور محقق کے قلم سے کیسے غیر ذمہ دارانہ جملے نکل پڑتے ہیں چنانچہ اس کے متعلق ہمارے تین اعتراض ہیں :۔

ا۔ یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ کہ ولی نے محمد شاہ کے زمانہ میں دہلی کا سفر کیا تھا۔ حالانکہ اس کا پہلا سفر ۱۱۱۲ھ میں عالمگیر کے زمانے میں ہوا۔ البتہ دوسرا سفر محمد شاہ کے زمانہ میں ہوا ہے۔

اس کی تصدیق اس عہد کے قلمی مخطوطوں سے ہوتی ہے چنانچہ خود شمال کے متعدد تذکرہ نویس، قائم۔ میر حسن جلی ابراہیم خاں۔ یوسف علی مرشد آبادی مرزا علی لطف اور عبدالغفور خاں نساخ کی تحریرات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

البتہ آزاد اور مؤلف گل رعنا محمد شاہ کے عہد کو ولی کا دہلی میں آنا قرار دیتے ہیں۔ آزاد کے خیالات کو خود نواب خیال متعدد جگہ ناقابل قبول قرار دے چکے ہیں۔

ب۔ ولی اپنا دیوان لے کر کھرے کھوٹے کی شناخت کے لئے دہلی آئے "۔

یہ بیان ہرگز صحیح نہیں ہوسکتا۔ اول تو ولی اپنے سفر دہلی کے وقت دیوان مرتب کر چکے تھے اور اس کو ساتھ لائے تھے۔ پھر اس امر کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا۔ کہ دہلی میں اس نے اپنے کلام کی صحت کی اور موجودہ کلام صحت کردہ کلام ہے۔

دوسرے یہ کہ ولی کے سفر دہلی کے وقت کوئی شاعر اردوئے معلّٰی کا دہلی میں موجود ہی نہیں تھا جس کی تصدیق خود نواب صاحب کے بیان سے ہوتی ہے۔ جب کسی شاعر کا وجود ہی نہیں تھا۔ تو پھر ولی اپنے کلام کے کھرے کھوٹے کی جانچ کس سے کرسکتے تھے۔

ج۔ نواب خیالؔ کا خیال یہ ہے۔ کہ ولی دہلی میں اردو سیکھنے لگے۔ حالانکہ دہلی کے متقدمین شعرا کو بھی اس امر کا اعتراف تھا۔ کہ انہوں نے ولی سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ حضرت میرؔ جو دہلی کے استاد سخن ہیں۔ فرماتے ہیں۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا۔

اس بارہ میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری نے اپنے مضمون "شاہ ظہورالدین حاتم" مطبوعہ "ہندوستانی" (الہ آباد) میں تفصیل سے بحث کی ہے اور ثابت

کیا ہے۔ کہ کس طرح حاتم اور ان کے ہمعصروں یعنی ولی کے پہلے ابتدائی شاعروں نے ولی سے استفادہ کیا ہے اور اس کی پیروی پر فخر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ دعوےٰ کرنا کہ ولی اردو سیکھنے دہلی آئے کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ ولی کے خدمات کا اعتراف نہ کرنا نہ صرف احسان فراموشی ہے۔ بلکہ بطلان حقیقت ہے۔

۶۔ بیان کیا گیا ہے۔ کہ "ولی بیچارے کو وہ زبان کہاں نصیب جو اردوئے معلّٰی کہی جائے اور قلعہ معلّٰی اور دہلی کے امرا کے محلوں سے بھی باہر نہیں نکلی تھی وہ تو وہی زبان بولتے تھے۔ جو اس وقت دکن میں رائج تھی اور نربدا کے ادھر ناپتی رہی۔"

اس سے نواب خیال کا یہ منشا ہے کہ اردوئے معلّٰی چونکہ مغل سلاطین کی پرورش یافتہ تھی۔ اس لئے وہی فصیح ہے اور دکن کی زبان جو نربدا کے ادھر بولی جاتی تھی۔ غیر فصیح ہے۔

یہ امر خاص طور پر غور طلب ہے۔ کہ مغلوں کا تعلق ہندوستان کے ساتھ ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ سے ہوا اور پھر ہمایوں ایک مدت تک ہندوستان کے باہر رہا۔ عام طور سے دفتر کی زبان

شروع سے آخر تک فارسی رہی، بادشاہ اور امیروں کی زبان جو شاہی دربا
میں بولی جاتی تھی۔ فارسی تھی۔ علما اور شعرا فارسی میں تصانیف کرتے تھے
اردو گویا بازاری زبان تھی جس کو شاہجہاں (۱۰۳۶ھ) کے زمانے سے
عروج ہونے لگا اور اگرچہ اب وہ اردوئے معلّٰی سے موسوم ہوئی۔ مگر اس کے
باوجود بھی وہ سرکاری زبان نہیں ہوئی تھی، شعرا اور علما کی زبان نہیں تھی۔
اس کے باوجود بھی اس کو جو درجہ فصاحت کا دیا جارہا ہے۔ وہ دکھنی کو نہیں
دیا جاتا۔ حالانکہ وہ یہاں ۱۴۰۰ء کے قبل سے مروج تھی، شاہی دفتر اسی
زبان میں تھا۔ بادشاہی محلسراؤں امرا و رؤسا کی حویلیوں میں یہی زبان بولی
جاتی تھی۔ علما، اور شعرا اسی زبان میں اپنی تصانیف کرتے تھے۔ اس کے
باوجود اس کو غیر فصیح کہا جاتا ہے۔

یہ کس قدر تعجب انگیز ہے۔ کہ جو زبان نہ تو شاہی دفتر کی زبان تھی اور نہ
اس زمانہ میں اس کا کوئی شاعر نام آور ہوا ہے۔ مگر صرف قلعہ کی پرورش سے
اس کو اعلیٰ درجہ دیا جارہا ہے اور اُس کے مقابل اس زبان کی تحقیر کی جا
رہی ہے۔ جو صدیوں گولکنڈہ اور بیجاپور کے شاہی درباروں کی زینت بنی
رہی۔ سینکڑوں باکمال شاعر اپنے کلام سے چمنستانِ اردو کو گلزار بنا چکے

تھے، بیسیوں ادیب اپنے تصانیف سے گلشن اردو میں سدا بہار پھول کھلا چکے تھے، اس کے باوجود اس کو کوئی درجہ نہیں دیا جاتا - بلکہ اس کی تحقیر کی جاتی ہے !

(۷) نواب خیال اس امر کو قبول کرتے ہیں - کہ اردو نثر کی پہلی کتاب فضلی کی کربل کتھا ہے - جو ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی تھی - چنانچہ بیان کرتے ہیں :-

"محمد شاہ کا اردو پرست زمانہ اس زبان کی پہلی نثر کے لئے بھی ممتاز اور یادگار رہیگا - فضلی نے اسی بادشاہ کے عہد (۱۱۴۵ھ) میں کربل کتھا لکھ کر نثر اردو کی بنیاد ڈالی اور اپنے اخلاف کے لئے ایک شاہراہ کھول دی -"

اور پھر آگے چل کر لکھا گیا ہے :-

"اس ملک میں جب انہوں نے (مسلمانوں) اپنی مذہبی آواز پھیلانی چاہی - تو نظم ہی کو اپنا آلہ بنایا . . . . نثر کا پرچہ سننے میں نہیں آیا -"

غرض کہ نواب خیال کربل کتھا کو اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ادبی کتاب بھی نہیں ہے -

بیشک یہ صحیح ہے۔ کہ شمالی ہند کے لئے بار اردو دینے کے معنی ہیں۔ یہ نثر
کی پہلی کتاب ہے۔ مگر اس کو زبان اردو کی پہلی نثر قرار دینا ہرگز صحیح نہیں ہو
سکتا۔ بلکہ سراسر غلطی ہے۔ کیونکہ اس سے ایک صدی پہلے ۱۷۴۵ء کی اردو
زبان کی ادبی کتاب سب رس موجود ہے جو اب چھپ چکی ہے اور دو صدی
قبل مذہبی کتابیں نثر میں لکھی گئی ہیں۔ ان تمام کے باوجود کربل کتھا کو نثر اردو
کی پہلی کتاب قرار دینا زیادتی ہے۔ جو حق بجانب نہیں ہو سکتی۔

(۸) مولانا آزاد پر جا بجا سخت ریمارک کئے گئے ہیں۔ مثلاً:۔

"آزاد مرحوم کی روح نہ شرمائے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے
کہ وہ اپنی انشاء پردازی کی دھن میں آنکھیں بند کر لیتے اور
اپنے قلم کو آزاد کر دیتے ہیں۔" (ص ۹۱)

مولانا آزاد نے جس وقت اپنی تالیف "آب حیات" مرتب فرمائی اس
وقت کے معلومات کے لحاظ سے وہ اچھی اور بہت اچھی کتاب تھی۔ ادب ریاضی
نہیں۔ کہ اس کا ہر مسئلہ یقینی ہو جائے، جدید تحقیقات سے جب معلومات ہونے
جاتے ہیں۔ تو سابقہ نظریے بدل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم کو اپنے پیشرو
مصنفین پر سخت حملے نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ زمانہ آئندہ میں جدید نسل سے ہم کو

بھی اسی کی توقع رکھنی چاہیئے۔

(۹) "مغل اور اردو" میں ماخذ کے حوالے بہت کم بلکہ شاذ دیئے گئے ہیں جب تک ماخذوں کے حوالے نہ دیئے جائیں۔ کوئی محقق کسی دعوے کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ بہت بڑی خامی ہے۔

ماخذوں کے حوالے نہ ہونے اور زبانی روایات کو اہمیت دیئے جانے کے باعث ہمیں خوف ہے۔ کہ کہیں کوئی محقق "داستان اردو" کو اسم باسمی قرار دے کر داستان ہی نہ قرار دے جس میں صدق و کذب لازمی اور ضروری ہے۔

ہمیں امید ہے۔ کہ جب اصل "داستانِ اردو" شائع ہو گی۔ تو ان خامیوں کو دور کر دیا جائے گا۔

شاہ جہاں دہلی ۱۹۳۳ء
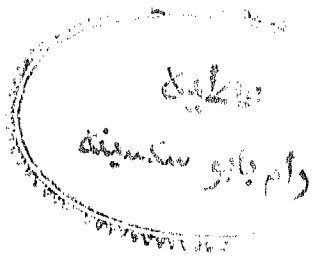
جواہر سخن پر ایک نظر

اب تک شعرائے اردو کے بیسیوں دیوان اور کلیات شائع ہو چکے ہیں اور مدارس کے نصاب میں بعض شعراء کے کلام کا مختصر انتخاب بھی شامل ہے۔ مگر کل شعرائے اردو کے کلام کا کوئی قابل لحاظ مجموعہ شائع نہ ہوا تھا۔ چند سال سے اس قسم کے مجموعے شائع کرنے پر بعض اصحاب نے توجہ کی ہے چنانچہ سب سے پہلے سر مسعود جنگ مرحوم نے "انتخاب زریں" کے نام سے شمالی ہند کے بعض شعراء کے کلام کا ایک انتخاب شائع فرمایا۔ اس کے علاوہ مولانا الیاس برنی صاحب نے مختلف عنوانات کے تحت ایسے مجموعے شائع کئے اور خوب مقبول ہوئے مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کے کارپردازوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ اردو شہ پاروں کے نام سے تین جلدیں شائع کریں گے پہلی جلد اردو شاعری کے آغاز سے ولی کے زمانہ تک ہوگی۔ دوسری جلد ولی سے غالب کے عہد پر مشتمل ہوگی۔ اور تیسری جلد غالب سے موجودہ عہد تک ہوگی۔ اس سلسلہ کی صرف پہلی جلد جس کو ڈاکٹر سید محی الدین زور نے مرتب کیا تھا۔ شائع ہوئی

اس میں قدیم دکھنی اور شمالی ہند کے شعرا کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا تھا اور نظم کے ساتھ بعض نثر کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔

اب ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے بھی اس قسم کے سلسلہ کا آغاز کیا ہے اور چھ جلدوں میں دکن اور شمال کے کلام کا انتخاب پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی جلد جو "جواہر سخن" کے نام سے موسوم ہے شائع ہوئی ہے۔ اس کو مولوی محمد مبین صاحب کیفی چڑیاکوٹی نے مرتب کیا ہے۔

کتاب حسب معمول ٹائپ میں شائع ہوئی ہے۔ حجم ۵۱۴ صفحے کا ہے۔ ابتدا میں ۱۵ صفحے فہرست کے ہیں۔ اس کے بعد تعارف کے عنوان سے چار صفحے تارا چند صاحب اکیڈیمی کے جنرل سکریٹری نے لکھے ہیں۔ پھر تمہید شروع ہوئی ہے۔ اس کے بعد خصوصیات دور اول کا عنوان قائم کرکے پہلے دکھنی شعرا کے خصوصیات بیان کئے گئے ہیں۔ اس بحث پر سات صفحے ہیں۔ پھر حصہ دوم میں شعرائے دہلی کے خصوصیات کا بیان ہے۔ یہ بھی سات صفحے کا ہے۔ ان ذیلی امور کے بعد انتخاب شروع ہوتا ہے۔ شاعر کے مختصر حالات بیان کرکے اور اس کی شاعری کے متعلق مختصر رائے ظاہر کرنے کے بعد اس کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

حصہ اول دکھنی شعرا سے مختص ہے۔ اس میں بھی گویا تین فصل ہیں پہلی فصل شعرا گولکنڈہ اور بیجا پور پر مشتمل ہے۔ جس میں صرف اکیس شعرا کا ذکر ہے پہلا شاعر وجہی ہے۔ دوسری فصل احاطہ مدراس اور بیجا پور کے عنوان سے ہے اس میں گیارہ شعرا کا کلام ہے۔ پھر شعرا اورنگ آباد کے تحت سولہ شعرا کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حصہ دوم شعرا دہلی کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں انتالیس شعرا کا انتخاب ہے۔

انتخاب میں مثنوی قصیدہ۔ رباعی۔ غزل سب کچھ شامل ہے۔ اس طرح بہ حیثیت مجموعی جواہر سخن اسم با مسمیٰ ہے۔

ہماری رائے میں اس میں مختلف قسم کی فروگذاشتیں ہوئی ہیں جن کو اہمیت دی جا سکتی ہے۔ ان کا ذکر حسب ذیل ہے۔

۱۔ شعرا کے حالات میں مختلف قسم کی فروگذاشتیں ہوئی ہیں۔ مثلاً آگاہ کے حالات میں بتایا گیا ہے۔ کہ ان کی صرف دو اردو تصانیف ہیں ہشت بہشت اور من درپن (صفحہ ۸۹) یہ بیان صحیح نہیں ہے۔

من درپن درحقیقت ہشت بہشت کا ہی ایک باب ہے۔ کیونکہ ہشت بہشت آٹھ بابوں کا مجموعہ ہے جن کے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ مولانا باقر آگاہ کی اردو

تصانیف کی تعداد (۱۶) ہے جن کے ناموں کی یہاں صراحت کی جاتی ہے:

۱۔ ہشت بہشت (۲) ریاض الجنان (۳) تحفۂ احباب (۴) محبوب القلوب (۵) تحفۃ النسا (۶) فوائد در عقائد (۷) روضۃ السلام (۸) خمسۂ متحیرہ (۹) ہدایت نامہ (۱۰) ریاض السیر (۱۱) معراج نامہ (۱۲) فرقہ ہائے اسلام (۱۳) رسالہ عقائد (۱۴) مثنوی روپ سنگار (۱۵) مثنوی گلزار عشق عزت روح افزا (۱۶) کلیات آگاہ۔ یہ کل کتابیں منظوم ہیں۔ مصنف کے زورِ کلام کا پتہ ان کے کلیات اور مثنوی گلزار عشق سے ملتا ہے مگر ان میں سے کسی کا ذکر جواہرِ سخن میں نہیں ہے۔

۲۔ نصرتی کا نام نصرت اور سنہ وفات ۱۰۹۵ھ لکھا گیا ہے۔ حالانکہ نصرتی کا نام نصرت نہیں۔ بلکہ محمد نصرت تھا اور اس کی وفات ۱۰۹۵ھ میں قرار نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ حسب بیان مؤلف تذکرہ ریاض حسنیٰ ۱۰۹۷ھ میں بھی نصرتی زندہ تھا۔

(۳) ولی ویلوری کا نام محمد فیاض لکھا گیا ہے۔ دراصل ان کا نام میر ولی فیاض تھا جس کی تفصیلی وضاحت ہم نے اپنی تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں کی ہے۔

(۴) ولی اورنگ آبادی کا سنِ وفات ۱۱۵۵ھ بتایا گیا ہے۔ عرصہ ہوا کہ اس کو غلط

ثابت کیا جا چکا ہے۔ اب جدید تحقیقات سے صحیح طور پر واضح ہو چکا ہے۔ کہ ۱۱۱۹ھ میں ولی کی وفات ہوئی ہے۔ (ملاحظہ ہو رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۳۴ء)

۵۔ سراج اورنگ آبادی کے متعلق بحوالہ میر حسن لکھا گیا ہے۔ کہ وہ حمزہ کے شاگرد تھے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ دکن میں حمزہ نام کا کوئی شاعر نہیں ہوا اور جہاں تک تحقیقات کی گئی ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ سراج کو کسی کا تلمذ حاصل نہیں تھا۔ بلکہ وہ فطرتی شاعر تھے۔

ب۔ ہم نام شعرا کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے اور شعرا کا تخلص غلط لکھا۔

(۱) عاجز کے بیان میں عارف الدین خان عاجز اور سید محمد عاجز میں امتیاز نہیں کیا گیا اور دونوں کی تصانیف عارف الدین خان سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔

دونوں عاجز کی شاعری میں تقریباً تیس چالیس سال کا فرق ہے۔ اس طرح دونوں شاعروں کی تصانیف کو ملا دینا صحیح نہیں ہے۔

۲۔ منور الدولہ کا کوئی تخلص نہیں بتایا گیا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ اُن کا تخلص منور الدولہ ہی تھا۔ حالانکہ "یار" ان کا

تخلص تھا۔

ج۔ ماخذوں کے حوالے اگرچہ اکثر مقامات پر دیئے گئے ہیں۔ بلکہ یہ اہتمام کیا گیا ہے۔ کہ ہر شاعر کے حالات اور اس کے کلام کے متعلق حوالہ دیا جائے مگر اس کے باوجود دکھنی شعرا اور ان کے کلام کے متعلق بیسیوں جگہ ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ مثلاً کلام غواصی ص۴۷ جنیدی ص۴۸ کلام ص۴۹ کلام ابن نشاطی ص۵۴ کلام فائز ص۵۵ شاہی ص۵۶ ہاشمی ص۶۴و۶۵ عاجز ص۶۵ بحری ص۶۷، ۶۸ ایمن ص۸۷ وجدی ص۸۸ داود ص۱۶۳، ۱۶۶۔ کلام سراج ص۱۷۳ عزیز ص۱۷۶ احمدی ص۱۷۷۔ مرزا ص۱۷۸ ضیا ص۱۷۹، ۱۸۰ افضلی ص۱۸۱ منور الدولہ ص۱۸۲ وغیرہم۔

د۔ جیسا کہ کتاب پڑھنے سے واضح ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں دکھنی شعرا کا ذکر ہے جس میں ابتدائی شعرا یعنی عہد قطب شاہی اور عادل شاہی کے علاوہ عہد آصفیہ اور احاطہ اور مدراس وغیرہ کے شعرا بھی شامل ہیں۔ مگر ان کی تعداد ان کی حقیقی تعداد سے نہایت کم ہے۔ ایسے شعرا جو اپنے کلام کے لحاظ سے استاد سخن کہے جا سکتے ہیں۔ اور جن کی تصانیف ان کی قابلیت کی بین دلیل ہے بیسیوں ہیں۔ چنانچہ صرف عہد قطب شاہی اور عادل شاہی کے شعرا جن کا ذکر جواہر سخن میں ہو سکتا تھا بطور مثال حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ احمد	قطب شاہی	مثنوی لیلیٰ مجنوں
۲۔ ابن	" "	قصہ ابوشحمہ
۳۔ غلام علی	" "	مثنوی پدماوت
۴۔ لطیف	" "	ظفرنامہ
۵۔ افضل	" "	محی الدین نامہ
۶۔ علی	عادل شاہ (شاہی)	کلیات
۷ مقیمی	عادل شاہی	چندربدن و مہیار
۸۔ دولت	" "	بہرام و حسن بانو
۹۔ ملک خوشنود	" "	ہشت بہشت
۱۰۔ رستمی	" "	خاور نامہ
۱۱۔ مرزا	" "	مراثی
۱۲۔ شاہ ملک	" "	احکام الصلوٰۃ

ان میں سے اکثر مثنویاں اپنی خصوصیات کے باعث نہایت اہم ہیں اور ان کے مصنف استادِ سخن کہے جا سکتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا۔ کہ دکن کے شعرا کے متعلق معلومات کی وسعت بہت تنگ تھی

اور ان کے متعلق ہماری نظر کی جولاں گاہ دور رس نہیں تھی۔ اور ان کے کارنامے ہماری نظروں سے پنہاں تھے۔

مگر اب وہ بات باقی نہیں رہی۔ کتنی کتابیں اور مضامین ان کے متعلق شائع ہو چکے ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان سے معقول استفادہ کیا جاتا۔ مولف جواہر سخن اور ارباب اکیڈمی سے ہمیں امید ہے۔ کہ آئندہ کتاب کی جلدوں میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ بلکہ ایک ضمیمہ کے طور پر پہلی جلد کا تکملہ کر دیا جائے۔ تو مناسب ہے۔ تاکہ بے شمار جواہر پوشیدہ نہ رہیں فقط۔

(شاہ جہاں ۳۴ سنہ)

شعرائے اردو کا ایک نایاب تذکرہ

ایک زمانہ وہ تھا۔ کہ قدیم شعرائے اردو کے تذکرے نایاب اور کمیاب تھے۔ مگر اب متعدد تذکرے طبع ہو چکے ہیں۔ ان میں میر تقی کا تذکرہ "نکات الشعرا" اور قائم کا تذکرہ "مخزن نکات" شمالی ہند کے قدیم ترین تذکرے ہیں۔ ہنوز متعدد تذکرے ایسے ہیں۔ جن کے مخطوطات تو موجود ہیں۔ مگر وہ اب تک طبع نہیں ہوئے۔ مثلاً تذکرہ فتح علی گردیزی، علی ابراہیم خان کا

تذکرہ گلزار ابراہیم" اور تذکرہ مصحفی وغیرہ۔ ان سے قطع نظر دکن کے مرتبہ تذکرے بھی نایاب تھے۔ جن میں سے لچھمی نارائن شفیق کا تذکرہ "چمنستان شعرا"۔ اور خواجہ خاں حمید کا تذکرہ "گلشن گفتار" شائع ہوا ہے۔

شمالی ہند کے تذکروں میں دکھنی شعرا کا حال بہت کم پایا جاتا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے۔ کہ دکھنی شعرا کے متعلق ان کو پوری طرح معلومات حاصل نہیں ہوئے تھے۔ جو معلومات تھے۔ وہ زیادہ تر سید عبدالولی عزلت کے سفر دہلی کے بعد ان سے اخذ کئے گئے تھے۔ اس کے برخلاف دکھنی تذکروں میں شمالی ہند کے شعرا کا حال تفصیل سے نظر آئے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں کے معلومات کا ذریعہ وسیع تھا۔

دکن اور شمالی ہند کے تذکروں میں چند امور مشترک نظر آتے ہیں۔ جو ان ابتدائی تذکروں میں عموماً پائے جاتے ہیں:-

۱۔ چونکہ شعرائے اردو کی تذکرہ نویسی بھی فارسی کی تقلید میں شروع ہوئی تھی۔ اس لئے ان کی ترتیب بھی فارسی تذکروں کے مماثل ہوتی تھی اور یہ اثر اس قدر غالب تھا۔ کہ اردو شعر کہنے والوں کے تذکرے ہونے کے باوجود فارسی میں لکھے جاتے تھے۔

لہ یہ سب اب شائع ہو چکے ہیں۔ (حاشی)

ب۔ یہ قدیم تذکرے عموماً شاعر کے تخلص کے لحاظ سے ردیف وار لکھے جاتے تھے۔ قائم نے البتہ دور قائم کئے ہیں، جس کی پیروی مولانا محمد حسین آزاد نے کی ہے۔

ج۔ شاعر کے حالات کی تفصیل نہیں ہوتی اور نہ اس کی پیدائش اور مرنے کا سنہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اکثروں کے ساتھ ان کے وطن کی بھی صراحت نہیں ہوتی۔

د۔ مصنف کو جن شاعروں سے کوئی خصوصیت ہوتی ہے۔ ان کے کلام کی مبالغہ آمیز تعریف کی جاتی ہے۔

اب تک دکن کے جن غیر مطبوعہ قدیم تذکروں کا پتہ چلا ہے۔ وہ دو ہیں:-

۱۔ ریاض حسنی مصنفہ عنایت اللہ فتوت جو ۱۱۶۸ھ ہجری میں مرتب ہوا۔

۲۔ تذکرہ تمنا جو ۱۱۹۴ ہجری میں مرتب ہوا۔

اس مضمون میں فتوت کے تذکرے "ریاض حسنی" کا تعارف مقصود ہے اس کا ایک مخطوطہ دفتر دیوانی و مال سرکار آصفیہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس تذکرے کے (۲۲۳) صفحے ہیں، بارہ سطری مسطر ہے۔ کاتب خود

محمد اکرم ہیں، جن کی فرمائش پر مصنف نے اس تذکرے کو قلمبند کیا ہے اس کی تصنیف ۱۱۶۸ ہجری میں ہوئی ہے۔ تاریخ تصنیف کا قطعہ مصنف کا لکھا ہوا حسب ذیل ہے:-

تاریخ بنائے این "ریاض حسنی" ۔۔۔ جستیم ز فیض خاص آل مدنی
از روئے سرور ببدل ہاتف برگفت ۔۔۔ گلدستۂ ریحان بہار معنی

مصنف نے ۲۶ صفحے کا دیباچہ لکھا ہے جس میں طویل حمد و نعت کے بعد اپنا حال بیان کیا ہے۔ جن شعرا کا ذکر کتاب میں آیا ہے۔ اُن کی ردیف وار فہرست کتاب کے آخر میں درج ہے۔ ان شاعروں کی تعداد ایک سو اسی ہے جس میں ۷۵ دکھنی شعرا ہیں۔ باقی شمالی ہند، گجرات وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

دیباچہ کا جستہ جستہ انتخاب پیش کیا جاتا ہے:-

" احقر العباد فی خلقت انس و جان خواجہ عنایت اللہ خاں عرف خواجم المتخلص نفوت بن خواجہ عبدالرحمٰن خان بہادر اعتقاد الدولہ لشکر جنگ اگرچہ تفاخر ابویت بدرجہ ثبوت از جملہ فرائض، لاکن شمامۂ عنبر آگین ذات مبارک ایشاں دماغ عالم و عالمیان معطر و معنبر ساختہ آں مجمع الکمالات چوں حسداً بعد جد در

دراولادصدیق اکبراست لہذا گوئے راست بازی ویک سوئی
از احبائے ہمگنان عصرخود بردہ واعیان دہر دست اجابت بید
شجاعت مبارکش میسپارند . . . . . از عہدحضرت مغفرت
منزل بندگان آصف جاہ سلیمان پایگاہ نوراللہ مرقدہٗ تا حالت
تحریر این مقالات کہ بندگان آصف الدولہ خلف الصدق مرحوم
مغفوراست درعقیدت وبندگی بہ توسیع اوقات بسرمی برند
برخے از احوال حضرت جنت منزلت مرقومہ برقم قلم می پردازد۔
باوصف کثرت امورات ملکی کہ بی چتر سلطانی بود در قلمرو دکن
بداد گری وعدل گستری مشہور آفاق ۔ بفکر شعر در مزاج دریا مواج
نیز جوش داشت . . . . . آنچہ بزبان ہندی بود در تذکرہ
کہ بہ تہجی حروف تخلص شاعران صورت پذیرفتہ مردف گردانید
وموسوم بہ ریاض حسنی ساختہ از نظر ترجماۃ والانظران امید
اصلاح دارد وباللہ التوفیق۔"

نثون کے جو کچھ حالات دیباچے وغیرہ سے معلوم ہوتے ہیں، یہ ہیں
کہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد سے تھے اور ان کا سلسلۂ مادری حضر

سیدنا عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ ان کے اجداد بدخشاں کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد اودگہ کے قریب (جو آج کل "چاندا" سے موسوم ہے) ایک موضع میں اقامت کی۔ یہاں ان کے بزرگ کسی درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔ فتوت کے دادا خواجہ آفتاب "خجستہ بنیاد" (یعنی اورنگ آباد) آئے جہاں ان کے بعض دوسرے رشتہ دار بھی مقیم تھے۔ فتوت کے باپ حضرت خواجہ عبدالرحمٰن سرکار آصفیہ کے سلک ملازمت میں داخل ہو کر اعلے مراتب اور خطاب "اعتقاد الدولہ بہادر جنگ" سے سرفراز ہوئے۔ جاگیر اور منصب سے ممتاز کیے گئے۔ جوانی میں ان کو موسیقی سے خاص دلچسپی تھی۔ ہر دو شنبے کو موسیقی کا جلسہ کرتے جس میں ماہران فن جمع ہوتے اور اپنے اپنے کمالات دکھاتے۔ کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہا کرتے تھے۔ شجاع، دلاور، صاحب مروّت و سخاوت تھے۔ ۱۱۹۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

فتوت کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ سنہ پیدائش سے ہم واقف نہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ باپ کے انتقال کے وقت ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ حضرت سید محمد حسینی سے (جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اولاد سے

تھے، علوم ظاہری و باطنی کا اکتساب کیا۔ کم عمری سے شاعری کا شوق تھا۔ مشاعروں میں شریک ہوتے۔ فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اس زمانے میں اورنگ آباد میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ مشہور مشہور شعرا اورنگ آباد میں جمع تھے۔ بزم شعرا کے صدر سید سراج الدین حسینی "سراج" جیسے استاد فن تھے۔ فتوت بھی ان کے شاگردوں اور ارادتمندوں میں تھے۔ ان کے فرزند درویش محمد سے فتوت کو بڑا اتحاد تھا۔ باپ کے مرنے پر فتوت کا تعلق دربار آصفی سے قائم ہوگیا۔ ۱۱۷۹ھ میں آبائی جاگیر ان کو اور ان کے بھائی خواجہ ابوالبرکات خاں کو ملی۔ اور دونوں خطاب خانی و بہادری سے سرفراز کئے گئے۔ محرم ۱۲۲۳ھ میں فتوت کا انتقال ہوا۔ اولاد غالباً کوئی نہ تھی۔

اس تذکرے کی وجہ تالیف کے متعلق دیباچے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مؤلف کے ایک دوست خواجہ محمد اکرم کو شعرا سے بڑا خلوص تھا۔ ان کی دوستی کا دائرا نہ صرف اورنگ آباد یا دکن ہی کے شعرا تک محدود تھا۔ بلکہ شمالی ہند کے نامور شعرا سے بھی روابط قائم تھے اور اکثروں سے نامہ و پیغام کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کے پاس شعرائے متقدمین و متاخرین کے کلام کا بڑا

ذخیرہ جمع تھا۔ انہیں کی فرمائش پر فتوت نے اِس کام کو شروع کیا۔ خواجہ محمد اکرم کے ذخیرے کے علاوہ سید عبدالولی "عزلت" کے کتب خانے سے بھی استفادہ کیا اور اپنے چچیرے بھائی خواجہ موسیٰ سے (جو شعر فہمی اور سخن سنجی میں مشہور تھے) امداد لی۔

اورنگ آباد میں فتوت کے اس تذکرے کے پہلے شعرائے اردو کا ایک مختصر تذکرہ خواجہ خاں حمید نے مرتب کیا تھا۔ لیکن حمید کے ذکر میں فتوت نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جس سے خیال ہوتا ہے کہ یا تو فتوت کو اس تذکرے کا علم نہ تھا۔ یا وہ اِس کو قابل ذکر نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح فتوت کے تذکرے کا ذکر لچھمی نرائن شفیق نے اپنے "چمنستان شعرا" میں نہیں کیا ہے۔ حالانکہ "چمنستان" کی ترتیب کے وقت فتوت کے تذکرے کی تکمیل ہو کر تقریباً سات سال گذر چکے تھے۔

فتوت کے تذکرے کی ترتیب بھی انہیں خصوصیات کے ساتھ ہوئی ہے۔ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ مگر باوجود اس کے اس تذکرے سے بعض خاص امور پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ اس میں شمالی ہند کے ایسے متعدد شعرا کا ذکر اور کلام ہے جن کے متعلق میر تقی، قائم اور میر حسن کے تذکرے ساکت ہیں ۔ اور وہ شعرا یہ ہیں :۔

۱۔ آزاد ۔ محمد فاضل دہلوی

۲۔ آگاہ ۔ محمد صلاح دہلوی

۳۔ آشنا ۔ زین العابدین دہلوی

۴۔ آوارہ، محمد کاظم دہلوی

۵۔ الہام ۔ نضائل بیگ دہلوی

۶۔ انجام، امیر خان دہلوی

۷۔ ارشد، شیخ محی الدین اُجینی

۸۔ حیرت، اسمٰعیل خان دہلوی۔

۹۔ حیا دہلوی۔

۱۰۔ ذہین، میر محمد مستعد دہلوی۔

۱۱۔ ضائع، بلگرامی

۱۲۔ طالع، میر شمس الدین دہلوی۔

۱۳۔ عمارہ۔ سیتارام

۱۴۔ ممنون، دہلوی

ب۔ شمالی ہند کے بعض شعرا جن کے نام کی صراحت میر تقی نے اپنے تذکرے میں نہیں کی ہے اور صرف تخلص ہی پر اکتفا کیا ہے۔ فتوت نے ان کے نام بھی لکھے ہیں مثلاً بیتوا میر شہاب الدین دہلوی، بسمل، قزل باش خاں وغیرہ۔

ج۔ شمالی ہند کے اکثر شعرائے متقدمین و متوسطین کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے کلام کا بہترین انتخاب موجود ہے۔ بعض شعرا کے ساتھ اُن کے اساتذہ کا نام بھی بتا دیا ہے۔ مثلاً میر کے ذکر میں خان آرزو کو ان کا استاد بتا دیا ہے اور سودا کے متعلق محمد امیر میر کے شاگرد ہونے کی صراحت کی ہے۔

د۔ بعض دکھنی شعرا کے حالات میں کسی قدر تفصیل سے بھی کام لیا ہے جس سے بعض اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً نصرتی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ فتح بیجاپور کے وقت زندہ تھا۔ اور عالمگیر نے بیجاپور کے تمام شعرا کا کلام سنا اور نصرتی کے کلام کو پسند کر کے ملک الشعرا کے خطاب سے

سرفراز کیا۔ اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۱۰۹۷ھ میں نصرتی بقید حیات تھا۔ وہاں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عالمگیر کو اردو شاعری سے خاص شغف تھا۔ سعدی دکھنی کے متعلق اگرچہ کوئی تفصیل نہیں ہے۔ مگر اس کے دکھنی ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مصنف "گلشن گفتار" کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ان کو موسیقی میں اچھی مہارت تھی۔ امامی برھان پوری کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ وہ مہر کن تھا اور زیادہ تر مرثیے کہا کرتا تھا۔ غرض کہ اس قسم کا کثیر مواد فراہم ہو سکتا ہے۔ اب چند شعرا کے حالات بہ طور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ شمالی ہند کے شعراء۔

آرزو { گل رنگین سخنش بمشام گل چینان معنی معطر و خوش بو سراج الدین علی خاں آرزو، نوبادۂ چمن حضرت شیخ محمد غوث گوالیری است

متوطن دار الخلافت جنت بنیاد شاہ جہاں آباد است، نہال مضمون را بہ آب و تاب در زمین موزونیت بائین تہمین می نشاند۔

پھر کر نظر نہ آیا ہم کو سجن ہمارا   گویا کہ تھا چھلاوا وہ منھول ہمارا

زیبرے دہن کے آگے دم مارنا غلط ہے   غنچے نے گانٹھ باندھا آخر سخن ہمارا

میخانے بیچ جاکر شیشے تمام توڑے　　زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

آبرو } بلند استعداد خوش گو شیخ مبارک اللہ آبرو گوالیری است۔ علم سخن بدار الخلافت شاہ جہاں آباد دہچینان حشمت نشان سخن دانی افراشتہ کوس معانی را بآواز دل نواز می نوازد۔

کرتے تو ہو تغافل پر حال آبرو کا

دیکھو تو تم پیارے بے اختیار رو دو

مجلس رنداں میں مت لیجا دل بے ذوق کو

شیشۂ خالی کو کیا عزت ہی می خواراں کے بیچ

دل تو دیکھو آدم بے باک کا

عشق سے بھرتا ہے پتلا خاک کا

بیدل } از احوالش کماہی آگہی نیست

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل جہاں ہے ہم ہیں

اس تخم بے نشاں کا حاصل جہاں ہے ہم ہیں

حاتم } محمد حاتم حاتم شاعر خوش بیان و عندلیب رنگین الحان۔ زاد و بوش۔ فرحت نژاد۔ جہاں آباد و خدمت سخن را چنیں امتیازی دہد۔

آب حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا
مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا

ساقی شراب ناب ہے اور سب ہیں یار جمع
آنے کا کر رہے ہیں ترا انتظار جمع

کوئی ہے سرخ پوش کوئی زرد پوش ہے
آ دیکھ بزم میں کہ ہوئی ہے بہار جمع

جو بال زلف کا ترے شانے کے ہاتھ سے
ٹوٹا سو ہم کیا ہے اسے تار تار جمع

چن چن نکالے ہے کوئی ایسا بھی دردمند
مدت ستی ہوئے ہیں پھپولوں میں خار جمع

آ جا کہے ہے تجھ ستی حاتم یہ وقت ہے
ہوتے ہیں پھر یہ یار کہاں بار بار جمع

بزم میں کس کے تئیں فرصت مے نوشی ہے
نگہ مست تری دار دے بے ہوشی ہے
ساز درویشی و سامان فقیری حاتم
میری فہمید میں تنہائی و خاموشی ہے

درد } خواجہ محمد میر درد، طوطی شکرین مقال شکرستان ہندست، حقا کہ در سخن گوئی یگانہ آفاق۔ طبع بلند و فکرش رساست۔

انداز وہی سمجھے مرے دل کی آہ کا،
زخمی جکوئی ہوا ہو کسو کی نگاہ کا

محتسب سنگ جفا سے ترے میخانے میں
کونسا دل تھا کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا

نہ خانہ خدا ہے، نہ ہے یہ بتوں کا گھر
رہتا ہے کون اس دل خانہ خراب میں

سودا } معنی یاب، بے ہمتا، مرزا محمد رفیع سودا، فخر سخن گویان
جہاں آباد است، بلبل طبعش از آئینہ نمائی محمد میر میر
گویا شارہ چنانچہ می سراید۔

قاتل کے دل میں آہ نہ نکلی ہوس تمام
ذرّہ بھی ہم تڑپنے نہ پائے کہ بس تمام

نے خوف دنے حکایت دنے شعر دنے سخن
نے سیر باغ دنے گل و گلزار دیکھنا

ہشار ہیں بت پرست مسلماں خدا پرست
پوجوں میں اوس کسی کو جو ہو آشنا پرست

صانع } مسکن و مولدش از خاک بلگرام است
کیا دیکھ سگ لیلیٰ کو رخصت استخواں اپنا
نچھوڑا ہائے کچھ مجنوں نے صحرا میں نشاں اپنا
...کی اس محبت پر دیا تھا جان و دل صانع
نہ تھا معلوم، ہو جائے گا وہ نامہرباں اپنا

مظہر

مرزا جان جاناں مظہر۔ گوہر اصلش از دیار بخارا و مولد و منشایش اکبرآباد۔ متانت فکرش مظہر تجلیات الٰہی است و مظہر انوار فیوضات غیر متناہی میگویند که بلند ہمتی بہ شعر و شاعری سر فرو نمی آرد و این فن را سرمایۂ افتخار نمی انگارد۔ اکثر اوقات گرامی خود را در تکرار حدیث مصروف میدارد و از سیر و تواریخ سلف بہرہ متکاثر حاصل می نماید۔ ازانجا که آب و گلش تخمیر یافتۂ سخن است عنان اشہب فکر را در ساخت فصاحت این فن میگرداند۔ غرض امام الشعرائے عصر خود است۔ منصفان سینہ صاف افصح المتاخرین میگویند۔ در ثنا مدحش لب و چشم می پویند۔

گئے آخر جلا کر گل کے ہاتوں آشیاں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشان اپنا

نہ جانوں صبحدم باد صبا کیا جا پکار آئی
کہ غنچے کا دل نازک چمن کے بیچ بہار آئی

گر گل کو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں
بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

میر } والا فکر بے نظیر میر محمد تقی میر۔ زادگاہش اکبر آباد است فکرش رنگیں ایجاد مصباح طبعش برگرد سئے (۹) تجلی کدہ ادراک سراج الدین علی خان آرزو است رسا طبع والا فکر است۔

بھلا تم نقد دل لے کر ہمیں دشمن کہو اب تو
کہو کچھ ہم بھی کر لیں گے حساب دوستاں در دل

ممنون } ممنون از شعرائے دار الخلافت شاہجہاں آباد است۔

کہی بلبل نے پنجرے میں ہوا قسمت کا یوں باٹا
کہ خار.. وصل گل ہوا اور ہم سوک کر کانٹا

(ب)۔ دکھن کے شعرا۔

آصف } عمدۃ امرائے عظیم الشان قدوۃ خوانین بلند مکان رکن رکین سلطنت، عمدۃ عمید خلافت، صاحب سیف والقلم، رافع لوائے والعلم وزیر صاحب تدبیر سپہ سالار با فرہنگ نظام الملک

بهادر فتح جنگ استفادۂ سخن از افادۂ نگاہ مرزا عبد القادر بیدل جنت منزل
است دیوانہا مدون دارد و در تمام عمر خود کہ ہمیں مضمون ہندی تسخیر خاطر
گردیدہ و عجب اتفاق بلسان در بیان سرزدہ ۔ تخلص آصف وشاکر۔

کالی نہ کہو کوئی میرے دلبر کون حسد سے
مجھ دل کی کلی میں یہ دعائے یمینی ہے

امامی } مہر کشد دار السرور برہان پور است مرثیہ ہا میگوئید در سبیل
مدح حضرت امام شہید علیہ السلام می پوید وحب آل عبا
وردہا لہائے جہان می افزاید۔

آب بن جب ہوئے نیلم لب یاقوت حسین
جام کوثر کا دیا حور نے اس آن میں آ

حمید } سید خواجہ خاں حمید پسر بزرگ ترک تاز خان بہادر قوی جنگ
است مشق سخن از عارف الدین خان عاجز نمود۔ مہارت
علم موسیقی بقانون در چنگ است کار زندگی در عین عنفوان از دائرہ

حیات گسیختہ۔ مقام ریختہ گوئی را بایں نو(۹)، در پردۂ نازک خیالی جلوہ میداد۔

مجھ کو دیتا ہے نگاہوں سیں وہ بالا بالا
جس سے پلکھوں نے ہر یک مو سے سنبھالا اچھالا

دردمند محمد فقیہہ دردمند۔ طوطی طبعش از آئینہ ثنائی مرزا مظہر گویا گردید۔ مولدا و اددگیر از توابع محمد آباد بیدر است۔ کہ در صغر سن ہمراہ والد خود از دکن بشاہ جہان آباد رفت و در ظل عاطفت شاہ ولی اللہ اشتیاق نبیرۂ مجدد سرہندی قدس سرہ جا گرفت بعد چندے مرزا مظہر جان جاناں بتربیت او پرداخت و بہ یمن نظر رحمت او کمالاتے فراہم آوردہ۔ شعر فارسی و ریختۂ شائستہ در سلک نظم می کشید۔ ساقی نامۂ او شہرتی دارد۔ مدتیست کہ بجانب بنگالہ رفت و آنجا بجہت روزگار بسر می برد از خامہ او سخن چنیں می تراود۔

ہے غم سے رفیقوں کے مرا دل ناشاد
اس دہر کے جاتے ہیں سبھی عیش بہ باد
پردیز کنیں شیشہ خانہ عشرت پر (۹)
سنگ آیا ولیک سخت آیا فرہاد

سعدی۔ سعدی دکھنی کہ براحوالش کماہی آگاہی دست نداد۔

ہمنا تمن کو دل دیا تمن لیا اور دکھ دیا
تم یہ کیا ہم وہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے

سراج } سراج بہ انجمن محفل قدسی اساسیان بدر منبر آسمان شب زندہ داران و خلص معنی بسراجاً منیرا ۔ ۔ ۔ ۔ حضرت شاہ سراج الدین حسینی سراج از سادات حسینی صحیح النسب است ۔ بجانب قدوۃ سالکان حضرت شاہ عبدالرحمن قدس سرہ دست بیعت دادند بکمال توکل و استغنا بدریافت معنی من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ اوقات ملکوتی صفات خود در خجستہ بنیاد حق میگذارد و در مبادی نشو و نما برنگ گل خرقہ درویش در بر کردہ بہ تباشیر صبح شعور لسان بلبل زمزمہ سخن سنجی پیش گرفتہ مرتبہ سخن گوئی از شان صفات او مرتبہ ادنی است و اعجاز معجزات کلام از عیسی پیام وہ ہویدا صاحب کمالات مصنفان ہند و دکن افضل المتاخرین میگویند و در میدان وصفش بسر تا چشم می پویند :۔

دل نہیں ہے بلکہ ہے سولی کا پھول دوسرا منصور کہلانے لگا ۔

سراج اس ہستی موہوم کا احوال کہنے کو　　عدم کے صاف تختے کشود عنقا سے آتے ہیں

ہے طریق خاکساری میں مرا دل ان دنوں　　خاک بردار غبار رہگذر انتظار

ناصر درۃ التاج اورنگ نشینان جہاں مقبول حضرت شاہ شہیدان . . . خلف الصدق حضرت آصف جاہ امیر والا پائگاہ برضا

حق رضی رضا بر نواب نظام الدولہ ناصر جنگ ناصر رئیس ملک دکن بود۔ ذائقہ

حیا نش شربت شہادت چشیدہ و بعنایت الٰہی در سالک کمترین بندہا سے

مظلومان دشت کربلا گردید۔

نین تیرے شکار کرتے ہیں　　دل ہمارا فگار کرتے ہیں

خوب رو جب سنگار کرتے ہیں　　آرسی پر بہار کرتے ہیں

کس کی بیداد سوں چمن میں آج　　پھول سارے پکار کرتے ہیں

اہل دل گریۂ ندامت سیں　　سیر ابر بہار کرتے ہیں

خوش نگہ ہین بر ہیں سبز لباس　　سرو کو شرمسار کرتے ہیں

چشم بد دور دلبراں سارے　　اپنے ناصر کو پیار کرتے ہیں

نصرتی سخن طراز دکن است مسکنش بیجاپور۔ اکثر قصدہا و دیوان ہا بزبان ہندوی مرتب ساختہ و در آں تلاش ہا بسیار کردہ

داد معنی یابی داده۔ وقتیکہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی انار اللہ برہانہٗ ولایت دکن را در تسخیر در آورد و حکم نفاذ داد کہ سخن سخن سنجان ایں ملک را در نظر بگذارند، بموجب حکم گذرانیدند۔ کلام نصرتی را بر ہمہ افضل فرمودہ بخطاب "ملک الشعرائے ہند" سرفرازی یافت۔ چنانچہ در مدح عاشق شہباز بلند پرواز سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ بکمال خشوع و خضوع می سراید:۔

کہ جب اصل سینی سیادت کی بیل
چلی بن سین ہستی کے جب باند جبیل ؟
کمالات کا جب آ کے منڈا چھڑی
لگا گل سو یوں پائے عزت بڑی
دکن کی عجب بخت در خاک ہے
کہ جس بیچ تجھ خواب گاہ پاک ہے
زبان دھو کے پھول نرسوں کل میں لاؤں ؟
کہ سید محمد حسینی کا ناؤں

ولی } منظہر کمالات خفی و جلی محمد ولی دکھنی۔ زاد و بود ش دکن است و دست بیعت بجناب حضرت شاہ علی رضا گجراتی قدس سرہ

دارد۔ موجد ریختہ گوئی و بانی بنائے فصاحت زبان ہندوی است۔ در فن ریختہ گوئی امام الشعرا است۔ مدتے در بلدۂ گجرات عافیت صفات چہرۂ ہستی افروختہ آخرالامر از سورت جہاں بے بنیاد گذشتہ دگذاشتہ؟ بہلک قایم شتافت اللہ تعالے مغفرت نماید۔ ایں چنیں اشعار از کلام معنز بیام است:-

نہ پوچھو عشق میں جوش و خروش دل کی ماہیت
برنگ ابر دریا بار ہے رو مال عاشق کا

غرور حسن نے تجھ کو کیا ہے اس قدر سرکش
کہ خاطر میں نہ لاوے توں اگر تجھ گھر ولی آوے

یکرنگ { شاہ یکرنگ۔ بود دباشش گلشن بنیاد نجستہ بنیاد است۔ در سخن فرس فکرش برجستہ داشت و در بدیہہ گفتن خود را یگانۂ عصر می انگاشت۔ گاہی بتفنن طبع فسکرش بطرف زبان دکن مائل می شود:-

نانے کجل سجن یو انکھیاں اب اری کرتے ہیں
سادی نیں یہ بس ہیں تری دلربا کتیاں

نا پیچ دے زلف کو نہ کر ابرواں کو خم

کافی ہے یک نگہ تری افسوس گری کتیں

ناگر، لباس زر کا توں لے من موہن پیا

. . . .

(رسالہ ہندوستانی اکتوبر ۱۹۳۳ء)

تمنا کا تذکرۂ شعرار

تاریخ ادب اردو کے لئے تذکرہ کی اہمیت کو سب ارباب ادب نے تسلیم کیا ہے لیکن اس کی اہمیت کے احساس کے باوجود قدیم تذکروں کو طباعت کا جامہ پہنانے پر اب تک جیسی چاہیئے۔ ویسی توجہ نہیں ہوئی ہے

جس طرح دکن کی شاعری کو شمالی ہند کی شاعری پر اولیّت کا تفوق حاصل ہے، اسی طرح تذکرہ کی کتابوں کی تالیف میں بھی دکن کو اولیّت کا فخر حاصل ہے، دکن میں مرتب شدہ تذکرے شمالی ہند کے تذکروں سے قدیم ہیں، چنانچہ اب تک قدیم دکنی تذکروں میں سے (۱) تذکرۂ حمید دگلشن

گفتار مرتبہ ۱۱۶۴ھ) (۲) تذکرۂ افضل (تحفۃ الشعرا مرتبہ ۱۱۶۵ھ) (۳) تذکرۂ فتوت (ریاض حسنی مرتبہ ۱۱۶۸ھ) اور (۴) تذکرۂ شفیق (چمنستان شعرا مرتبہ ۱۱۷۵ھ) کا پتہ چل چکا ہے۔

اس کے پہلے ہم ریاض حسنی یعنی تذکرۂ فتوت کو رسالہ ہندوستانی بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں روشناس کرا چکے ہیں، اس وقت دکن کے ایک اور تذکرہ کا تعارف کرایا جاتا ہے، یہ تذکرہ ۱۱۹۴ھ میں تالیف پایا ہے۔

کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) میں ایک مخطوطہ موجود ہے، جس کو تذکرۂ تمنا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس مخطوطہ کے (۱۴۴) صفحے اور ہر صفحہ میں (۱۹) سطریں ہیں، خط نستعلیق ہے، تاریخ کتابت درج نہیں، اس کے بجائے تذکرہ کے شروع ہونے اور ختم ہونے کی تاریخیں درج ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے۔ کہ یہ تذکرہ تمنا نے تالیف کیا ہے اور ۱۱۹۲ھ میں اس کی تالیف شروع ہوئی اور دو سال بعد ۱۱۹۴ھ میں اس کی تالیف ختم ہوئی۔ وہ قطعات حسب ذیل ہے:۔

چو ایں تذکرہ را نمودم شروع　　زحق است امید اتمام او

تمنا بتاریخ سالش زمن   خرد گفت "آغاز صفحہ بگو"
۱۱۹۲ھ

تذکرۂ شاعران شد چو تمام این زمان   دل و جان حزین بہیچ و شادمان
داشت تمنا دلم فکر بتاریخ او   آمدہ آواز غیب شکر خدائے جہاں
۱۱۹۴ھ

اس کتاب میں حروف تہجی کے لحاظ سے شعرا کا ذکر ہے اور ہر شاعر کے فارسی کلام کے بعد اس کا اردو کلام درج کیا گیا ہے، اس امر کے قوی قرائن موجود ہیں، کہ یہ نسخہ خود مؤلف کا مسودہ ہے۔

سارے مخطوط میں جا بجا حک و اصلاح موجود ہے اور نیز اضافہ اور عبارت کے بڑھانے کا جو ڈھنگ ہے، وہ سوا مولف کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ جا بجا متعدد صفحات خالی چھوڑ دیئے گئے ہیں، اس سے بھی ہمارے قیاس کی تائید ہوتی ہے۔

اس تذکرہ سے اس کے مؤلف کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا تخلص "تمنا" تھا، وہ اورنگ آباد کا باشندہ اور حیدرآباد کا متوطن تھا، دربار آصفی کے امرا تک رسائی حاصل تھی، صمصام الملک کا درباری شاعر تھا، ارباب کمال سے ربط و ضبط رکھتا تھا۔ اس کے بعض شاگردوں نے بھی اس کے زمانہ میں

شہرت حاصل کر لی تھی، اور اس تذکرہ کی تالیف اپنے دوست محمد کرم بخش سالم قاضی
پیپری کے کہنے سے کی ہے، اس کتاب کے تالیف کے وقت تمنا کے والد بھی
زندہ تھے [۱]۔

دکن کے جن تذکروں سے ہم واقف ہیں، ان میں کسی تمنا کا ذکر نہیں ہے
مگر مجموعۂ فصاحت [۲] سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں ایک شاعر اسد علی خان
تمنا تھے، جو ارسطو جاہ کی خدمت میں قصائد اور قطعات پیش کیا کرتے تھے
اور یہ قطعات ۱۱۹۷ھ سے ۱۲۰۳ھ کے زمانے تک پھیلے ہوئے ہیں۔
اس مخطوطہ پر بھی کسی نے پنسل سے اسد علی خان تمنا کا نام لکھ دیا ہے۔
اور خود بعض شعرا کے حالات میں تمنا نے اپنے تخلص کے ساتھ اس تذکرہ کے مولف
ہونے کی صراحت بھی کی ہے۔

افسوس ہے کہ دیگر تاریخی حوالوں سے ان کے حالات پر روشنی نہیں پڑتی۔
البتہ اس امر کا پتہ چلتا ہے۔ کہ اعلیحضرت آصف جاہ ثانی کی پیش گاہ میں اسد علی
خان تمنا نے قصیدے پیش کئے ہیں، بہر حال اس امر میں کوئی شک و شبہ

---

[۱] تمنا کا دیوان اب سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے جس کا اب پتہ چلا ہے۔
[۲] ارسطو جاہ کی مدح میں جو قصائد اور قطعات لکھے گئے تھے۔ ان کو ایک مجموعہ میں جمع کیا
گیا ہے اور اس کو مجموعۂ فصاحت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ سرکار نظام کے
دفتر دیوانی و مال کے کتب خانہ میں محفوظ ہے ؛

نہیں ہے۔ کہ اسد علی خان تمنا دکن کے ایک صاحب مرتبت شاعر تھے اور یہ تذکرہ انہی کی تالیف ہے۔

افسوس ہے کہ ہم تمنا کے سنہ وفات سے بھی واقف نہیں ہیں۔ مگر مجموعہ فصاحت کی تالیف کا زمانہ ۱۲۱۵ھ ہے، اس میں تمنا کے جو قطعات شامل کئے گئے ہیں، ان میں ۱۲۰۴ھ کے بعد کا کوئی قطعہ شامل نہیں ہے۔ درآں حالیکہ ۱۱۹۷ھ سے ۱۲۰۳ھ تک تقریباً ہر سال کے قطعات فراہم کئے گئے ہیں، اس سے اس امر کا قیاس ہوتا ہے کہ تمنا ۱۲۰۴ھ تک بقید حیات تھے۔

اس تذکرے کے متعلق جو امور خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اس تذکرہ میں تمنا نے صرف اپنے معاصر شعرا کا ذکر کیا ہے جن میں سے اکثر زندہ تھے اور ان سے تمنا کو تعارف حاصل تھا [illegible] کے بعض ایسے شعرا کا [illegible] گیا ہے جن سے غالباً ان کو تعارف [illegible] نہیں تھا ممکن ہے مراسلت رہی ہو۔

۲۔ اکثر شعرا کے حالات میں سنین کا بہت لحاظ رکھا گیا ہے اور واقعات

کو بقید سنہ قلمبند کیا ہے ۔

۳۔ اکثر شعراء کے استادوں کا بھی ذکر کیا ہے ۔

۴۔ بعض شعرا کے کلام کے متعلق رائے بھی دی ہے ۔

۵۔ بعض شعرا کے تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً عبدالوہاب بیکل نے ایک تذکرہ موسوم "بے نظیر" لکھا تھا اور بہاؤالدین عروج نے تذکرہ "خزان و بہار" شاہ فضل اللہ فضلی نے فن سلوک میں زاد راہ اور اردو نظم میں دو کتابیں "قصہ پریم لوکا" اور قصہ "برہ بیوگا" کے مصنف ہیں ۔

۶۔ بعض شاعروں کے حالات میں ان کے احباب اور ملنے جلنے والوں کا تذکرہ بھی کیا ہے ۔

۷۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے دو اردو شعر درج کئے ہیں ۔ جو حسب ذیل ہیں :۔

باغ میں جانا ہے میرا کام کا شوق ہے مجھ کو گلابی جام کا

کہوں کیا اس کی بے پروائیوں سے دل پریشاں ہے ۔

نہ آیا ایک دم مجھ پاس جس کا نام جاناں ہے

۸۔ اس تذکرہ پر دیباچہ نہیں لکھا گیا ہے۔ متن کتاب میں بھی تمنا نے اپنا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ فتوت اور شفیق نے اپنا حال بھی متعلقہ ردیف میں لکھ دیا ہے۔

۹۔ اورنگ آباد کے دوسرے دو تذکرہ نویس خواجہ خان حمید اور لچھمی نارائن شفیق کا اس تذکرہ میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ وہ تمنا کے ہمعصر تھے، اور انہوں نے اپنے تذکرے لکھ دیئے تھے اور اسی طرح شفیق اور حمید کے تذکروں میں تمنا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس بنا پر ہو۔ کہ تمنا نے اس زمانہ میں شہرت حاصل نہ کی ہو۔ مگر تمنا کے تذکرہ میں حمید اور شفیق کا ذکر نہ آنا تعجب انگیز ہے۔

۱۰۔ فتوت کا ذکر تمنا نے کیا ہے، مگر تعجب ہے۔ کہ ریاض حسنی کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ دوسرے مصنفین کی کتابوں کا ذکر ہے اور پھر یہ کہ اس وقت ریاض حسنی کی تالیف کو عرصہ گذر چکا تھا۔

۱۱۔ بعض شعرا کے ساتھ اپنے ہم درس ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔

۱۲ بعض شاعروں کی ملازمت اور ان کے مشاغل کی صراحت کی ہے۔

۱۳۔ اس تذکرہ سے بعض شاعروں کے متعلق جو صحیح معلومات حاصل ہوتے

ہیں۔ اس کی وجہ سے دوسرے تذکروں کے ناکافی تحقیق کی بنا پر پیدا کردہ شکوک کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً شفیق نے اپنے تذکرہ میں نقد علی خاں ایجاد کا ذکر کیا ہے، انجمن ترقی اردو کی جانب سے شفیق کا جو تذکرہ شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک اور ایجاد کا تحفۃ الشعرا کے حوالہ سے اضافہ کیا گیا ہے اور ان کا نام مرزا علی نقی بتایا گیا ہے۔

تمنا کے تذکرہ سے معلوم ہوا کہ یہ صحیح نہیں ہے اس زمانہ میں دکن میں ایک ہی ایجاد تھے ان کا اصلی نام تو مرزا علی نقی تھا اور باپ نقد علی خان تھے۔ دربار آصفی سے مرزا علی نقی خان کو نقد علی خان خطاب ملا تھا۔ اس طرح ایجاد کی شخصیت ایک ہی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس تذکرہ میں صرف اردو شعرا ہی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس میں فارسی گو شعراء کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کا اردو کلام پیش کیا گیا ہے اور اس کو "ہندی" کی سرخی کے تحت لکھا گیا ہے۔ دکن کے شعرا کے قطع نظر شمالی ہند کے جن شعرا کا اس میں ذکر ہے ان کی فہرست حسب ذیل ہے :-

۱- سراج الدین علی خان آرزو (۲) مولانا غلام علی آزاد (۳) قزلباش خان امید

(۴) مرزا عبدالقادر بیدل (۵) بیدار (۶) اولاد محمد خان ذکا بلگرامی (۷) مرزا رفیع سودا (۸) مرزا مظہر جان جاناں۔

ان میں سے بیدل اور مظہر کے اردو اشعار نہیں ہیں۔ صرف فارسی لکھے گئے ہیں۔ دوسرے شعراء کا فارسی کے ساتھ اردو کلام بھی دیا گیا ہے۔ شعراء کی مجموعی تعداد ۱۵ ہے۔

ذیل میں تذکرۂ تمنا سے چند شاعروں کے تذکرے بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

ایجاد } ایجاد از قوم قاچار نام اصلی او میر علی نقی خلف الصدق نقد علی خان ہمدانی، با شیخ علی خان وزیر شاہ سلیمان صفوی بقرابت قریبہ مشہور بود، درعہد آصفجاہ بدلیونی پادشاہی فرخندہ بنیاد مدتے مامور بود۔ دراں زمان خان ایجاد نیز بسیار قرب و مصاحبت نواب داشت، و بخدمت کوتوالی لشکر سرفراز بود، بعد وفات والد بخطاب و دیوانی موروثی سرافتخار برافراشت بعدش بداروغگی فیل خانہ سرکار نواب صلابت جنگ سربلند گردید۔ و درعہد نواب نظام الدولہ فتح جنگ بہادر بہ خدمت اتالیقی صاحبزادہ بلند اقبال انتظام الدولہ نصرت جنگ بہادر چندے سرگرم بود، دراین ایام در حیدرآباد بخانہ خود فردکشی

کرد، مرد بزرگ خوش مزاج. غزل فارسیش چوں زلف خوباں مسلسل و مضامین تازہ از رخسارہ محبوباں . . . . . ریختہ اگرچہ زبانش نیست فامابزور طبیعت دقیقہ شناسی بحسن کیفیت سرانجام میدہد، گاہ گاہ اتفاق ملاقات می افتد، عزیز ہر کسے است حق سبحانہ سلامتش دارد۔

ایجاد بیٹھ رہ تو نجف کی زمین پہ   نقش قدم ہو خاک رہ بوتراب کا

ہم اسیروں کو تیرے زلفوں سے ہے دلبستگی
کون کافر چاہتا ہے ایسے داموں سے نجات

تربت پہ میری شمع اگر تو نہ لائے گا
جلتا رہوں گا حشر تلک میں کفن کے بیچ
تجھ لب سا کوئی شفیق نہ پایا سہیل نے
راتوں کو بھی چراغ لے ڈھونڈا یمن کے بیچ

س طرح ہے عندلیبوں کو گلستاں کا تلاش   اس طرح سے ہی مجھ کو شہر خوباں کا تلاش

بیٹھا ہوں تیرے ابروئے خمدار کے نزدیک
سر اپنا رکھا ہوں اسی تروار کے نزدیک
بکتا ہوں زر مہر کو بازار وفا میں
ان مولوں گراں نہیں ہوں خریدار کے نزدیک

کسے دریا سا دل اپنا ہم اے دلدار دیتے ہیں
ہر اک کو ہم کہاں یہ گوہر شہوار دیتے ہیں

انور } محمد سیف اللہ انور، سرو ہستیش از گلشن آباد خجستہ بنیاد سر کشیدہ از بادو سن تمیز باکتساب علوم میل نمود، و در چندے یکتا بر آمد نقیر داد ہم مکتب بلکہ اکثر اوقات باہم در حصول کتب فارسیہ در جناب حضرت محمد داد رحمنا قبلہ مدظلہ مثل شوکت و اسیر و چار عنصر مرزا سایح وقاری بود، و در حربیۂ شمع ادراک خود را از شعلۂ توجہ میر صاحب قبلہ میر انور الدین دل سلمہ اللہ افروختہ، در عالم دوستہا آشنائے یگانہ است و در جہاں آشنائی ہا مفتخر زمانہ مردلیست مودت پیشہ، و جولانے محبت اندیشہ، نہنگ ہستیش در محیط خجستہ نہاد آشنائے امواج مضامین و بحور اشعار است و حبیب صبرش از تار کش پنجۂ عشق تار تار با مؤلف مودت صمیم

میدارد، برفاقت حضرت ابوے دام ظلہ وزاد قدرہ بسر می برد او سبحانہ سلامت دارد۔

مگر گنج شہیداں باغباں تھا اس بیاباں میں

جو تخت دل سوا اگتا نہیں کچھ اس خیاباں میں

ہو گئی گرد تیرے دام کے خوشبو صیاد،

بال بلبل سے مگر نکہت گل کرتے ہیں

عصمت کا لاف مار نہ گل میرے یار سے

بدنام تو بھی ہے گا چمن میں ہزار سے

ہے نمایاں رخ پہ تیرے خط ریحان آج کل

مور کے قبضہ میں ہے ملک سلیمان آج کل

عاشقوں کے قتل پر امروز فردا خوب نہیں

دیکھ لیں ہو جائے گا کافر مسلمان آج کل

آرسی کو مت دکھا مژگان و ابرو ہمدگر
خنجر و شمشیر شیشہ میں لڑاتا ہے کوئی

آشفتہ { خواجہ ابوطالب خان آشفتہ، خلف اشرف خواجہ اشرف خان بہادر غضنفر جنگ است، گلشن فکریش را تازہ آب ورنگ

قبل ازیں بدارونگی فیل خانہ نواب نظام الدولہ بہادر سرفرازی داشت و والدش نیز بدیوانی پادشاہی بلدہ حیدر آباد مامور بود، جدش نواب عماد الملک مبارز خان کہ احوالش بکتب تواریخ من وعن مندرج است۔ جوان صالح بزیور قابلیت پیراستہ و بجواہر آدمیت آراستہ . . . . . با فقیر یگانگت تمام می دارد و از کرم جوشیہائے شبانہ روزے خود سرد مہری یاراں درفع می سازد، بسبب پاس خاطر و مفرشد نش فقیر گاہ بگاہ بحک و اصلاح می پردازد، اگر عالم دو ستیہائے شاگردی و استادی راچہ دخل فاما ایں قدر با ستمداد کردن او نوشتہ شدہ چنانچہ خود گوید،

استاد افلاطونم و شاگرد تمنا   آشفتہ دو عالم . . . زمن امروز

سبزہ نخل مرے آہ کا پھوٹا نکلا   قد دلدار ہوا سرو کا بوٹا نکلا

بعض کے منہ سے نکلتی ہے اب شراب کی بُو
چمن میں جس طرح مہکے گُلِ گلاب کی بُو
تمہارے زلفِ معنبر کے سامنے پیارے
کہاں مجال مقابل ہو مشک ناب کی بُو
وہاں کی خاک اے آشفتہ اپنے سر پہ رکھ
کہ جس زمین سے نکلے ہے بوتراب کی بُو

وہ اپنے گھر سے نشے مست شراب نکلے ہے
طلوع صبح کا جوں آفتاب نکلے ہے

خون ہے کس کا نگار سچ کہیو   تیرے دامن پہ یار سچ کہیو

میں کب سے ترا طالب دیدار کھڑا ہوں
رسوا شدہ کوچہ و بازار کھڑا ہوں
کرتا ہے اگر قتل تو پھر دیر کی کیا وجہ
حاضر ہوں ترے روبرو جلاد کھڑا ہوں

شاید ہے دست نازک گلروئے سبز پوش
یہ شاخ گل نہیں جو ہلے ہے چمن کے بیچ

سودا } مرزا رفیع سودا، در معنی پروری و مضمون گستری ممتاز است
صفائی ذہن و جودت طبعش بے نیاز . . . . . .

نیشکر را از چاشنی شعرش پائے حسرت در گل است، و عسل را از ذریعہ فکرش
نیش زنبور در دل،

دامن مکان اشک سے ہے دو قدم کی راہ،
آنکھیں چرا نہ سخت دل اتنے سفر سے تو

مے کشاں روح ہماری بھی کہیں شاد کرو
ٹوٹے گر بزم میں شیشہ تو ہمیں یاد کرو

سن کے یہ کہتا ہے میرے نالۂ جان کاہ کو
کیوں مجھے ایسا بنایا کیا کروں اللہ کو

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

کون کہتا ہے کہ مت اور وں سے مل اور ہم سے مل
جس کے ملنے میں خوشی تیری ہو پر مجھ سے مل

(معارف ۱۹۲۵ء)

کیمبرج کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست

اس سے پہلے میں اپنے ایک مضمون میں ظاہر کر چکا ہوں، کہ انگلستان میں صرف لندن ہی میں اردو قلمی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں، بلکہ انگلستان کے دیگر حصوں میں بھی ان کا ذخیرہ موجود ہے، جس پر تفصیل سے کام کرنے کے لئے بڑے وقت کی ضرورت ہے۔

لندن میں انڈیا آفس، برٹش میوزیم اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں اردو مخطوطات جمع ہیں، اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں چند قلمی کتابیں بھی موجود

ہیں دکھنی مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اسی طرح کیمبرج میں اردو کا مواد موجود ہے۔

فی الوقت اس کا تو موقع نہیں ہے کہ تفصیل سے یہاں کے مخطوطات پر کچھ لکھا جائے، البتہ ان سے ایک حد تک واقفیت کے لئے ان کی فہرست اور بعض کے متعلق کسی قدر وضاحت ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے، تاکہ اردو کے ہمدردوں کو ان کا علم ہو جائے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ کی کیٹیلاگ جو عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور اردو قلمی کتابوں پر مشتمل ہے اور ۱۸۹۶ء میں پروفیسر براؤن Browne نے مرتب اور شائع کی تھی، اس کے بعد دوبارہ اضافہ اور ترمیم کے ساتھ ۱۹۰۰ء میں اور پھر اس کا تکملہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا ہے۔

یہ کیٹیلاگ صرف یونیورسٹی کے خاص کتب خانہ کے مخطوطات تک محدود نہیں ہے، بلکہ دیگر کالجوں کے کتب خانوں کا ذخیرہ بھی اس میں شامل کر لیا گیا ہے، براؤن کی یہ کیٹیلاگ ایتھے، ریو یا بلوم ہارٹ کی طرح تفصیل سے نہیں ہے، بلکہ بہت کم وضاحت کی گئی ہے۔

کیمبرج کے دیگر کالجوں سے قطع نظر کر کے کنگ کالج (King College

کا ذخیرہ کس طرح فراہم ہوا ہے، اس کی صراحت بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

یہ مخطوطات اڈورڈ افریم پوٹ (Edwara Eprain Pote) نے داخل کیں، یہ پوٹ متوطن ایٹن (Eton) کا لڑکا تھا، ۱۷۶۳ء میں اس نے کنگ کالج سے ڈگری حاصل کی اور کلائیو (Clive) کی ماتحتی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہو گیا اپنے ایک خط میں جو کالج کے نام ۱۷ فروری ۱۷۸۸ء کو پٹنہ سے روانہ کیا گیا ہے، لکھتا ہے۔ کہ جس وقت سے وہ ہندوستان پہنچا ہے۔ مشرقی علوم کی کتابوں کو جمع کرنے کا متمنی رہا ہے اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو کر (۵۵۰) قلمی نسخے فراہم کر لئے ہیں، یہ قلمی نسخے آہنی صندوقوں میں ۱۷۹۰ء میں انگلستان پہنچے اور نصف کنگ کالج کو ملے اور نصف ایٹن کالج (Eton College) کے حصہ میں آئے۔

ایک اور دلچسپ امر جو اس ذخیرہ کے متعلق عام طور سے پوشیدہ ہے، وہ یہ معلوم کرنا ہے۔ کہ پوٹ کو یہ ذخیرہ کس طرح حاصل ہوا؟

یہ مخطوطات دراصل اولاً کرنیل پولیئر (Colonel Polier) کی ملک تھے، پولیئر لیسنن (Lousanne) فرانس کا باشندہ تھا، ۱۷۴۱ء میں تولد ہوا، اگرچہ فرنچ تھا، مگر انگریزوں سے خاص اتحاد تھا جس کی بناء پر

یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہوا، کلایو (Clive) اور وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) کا اس پر بڑا اعتماد تھا۔

تیس سال تک یہ ہندوستان میں رہا، اور ہندوستانی علم ادب سے خاص طور پر واقفیت حاصل کر لی۔ اور بہت سی کتابیں جمع کیں، یہی پہلا شخص ہے جو وید کو یورپ میں لایا۔

۱۷۸۹ء میں یہ یورپ واپس آیا، اور وید اور چند قلمی کتابیں برٹش میوزیم کو تحفہ دیں اور اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ نے عربی اور فارسی کے چوبیس قلمی نسخے پیرس کے شاہی کتب خانہ کو تحفہ دیئے۔

پولیر (Polier) اپنا جمع کردہ پورا ذخیرہ یورپ نہیں لاسکا تھا، جو پورٹ کے ہاتھ لگا اور اس نے چند سال بعد یورپ کو وہ ذخیرہ منتقل کر دیا۔

یہ ہے کنگ کالج میں اردو قلمی کتابوں کے جمع ہونے کی مختصر تاریخ۔

یونیورسٹی کی کیٹلاگ بالکل صحیح اور مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ کئی ایک قلمی نسخے جو دیگر نسخوں کے ساتھ ایک ہی جلد میں شامل ہیں، ان میں سے اکثر کے ناموں کی صراحت کیٹلاگ سے نہیں معلوم ہوتی، تاوقتیکہ اصل کتابیں دیکھی نہ جائیں۔

یونیورسٹی کے مخطوطات سے قطع نظر دیگر کالجوں کے مشرقی مخطوطات سے سے چونکہ بہت کم استفادہ کیا جاتا ہے، اس لئے ان کی حالت چنداں بہتر ین نہیں کہی جا سکتی،

برٹش میوزیم، انڈیا آفس، اڈنبرا یونیورسٹی کے مخطوطات جبں عمدہ اور بہترین حالت میں ہیں۔ وہ بات کنگ کالج اور کاپر کالج کے مخطوطات کو حاصل نہیں ہے۔

اس تمہید کے بعد اب اردو مخطوطات کی فہرست دی جاتی ہے:-

ذخیرہ کتب خانہ یونیورسٹی

نمبر	نام	نمبر رجسٹر	نمبر	نام	نمبر رجسٹر
۱	قصۂ سیف الملک	Add.224	۶	ہدایت المومنین	add575
۲	قصہ چہار درویش	add311	۷	لطائف زبان اردو	〃 ۴۴۴
۳	نقلیات ہندی	〃 〃	۸	دیوان ولی	〃 35۴۵
۴	دیوان سودا	add324	۹	طوطا کہانی	9a ۴۴۵
۵	ترجمۂ تاریخ طبری	〃 ۱۹۴	۱۰	باغ و بہار	〃 ۴۴۵

نمبر	نام کتاب	تعداد
۱۱	داستان بے نظیر	G~25
۱۲	قصہ سیف الملک	aaa221

ذخیرہ کننگ کالج

نمبر	نام کتاب	تعداد
۱	پدماوت	55
۲	دیوان ولی	164
۳	رامائن تلسی داس	196
۴	بیاض مراثی	65
۵	دیوان یقین	168
۶	دیوان میر تقی	274
۷	دیوان سودا	168
۸	دیوان آبرو	80
۹	مصباح الہادی	14
۱۰	گیان پوتھی (ہندی)	14
۱۱	فاضل علی پرکاش (")	60
۱۲	سہسراس (ہندی)	219
۱۳	سندر سنگار (ہندی)	224
۱۴	ست سیا (")	60
۱۵	رامائن تلسی داس (")	196
۱۶	بھاگودھا رام (")	54
۱۷	بھاگوت ٹوڑمل (")	54
۱۸	بھاگوت جوتپی (")	51
۱۹	سنگھاسن بتیسی (")	221
۲۰	جوگ باشسٹ (")	28
۲۱	میکٹ چنتامن (")	60
۲۲	ارجن گیتا (")	14

کاپر کالج
Cowper College

نمبر	نام کتاب	تعداد
۱	ترجمہ انگلستان	20/I
۲	حکایت سوداگر تصنیف خوشدل	II
۳	دیوان گویا	III
۴	دیوان رضا	55

۵	قصہ ورشاہ دیمن رخ بانو مصنف ہر چند کھتری	16	۱۶	قصہ سوداگر مصنفہ رسوا	66
۶	فیصلہ دیوانی	40	۱۷	پندنامہ مصنفہ حاجی ولی	99
۷	دیوان ولی	40	۱۸	بیاض منتقل غزلیات میر و مرزا	53
۸	مثنوی بےنظیر و بدر منیر	66	۱۹	لیلی مجنوں مصنفہ تقی علی خان ہوس	64
۹	مثنوی در جواب دربار عشق تصنیف مصحفی	66	۲۰	مثنوی دلپذیر	55
۱۰	مثنوی قصہ سوداگر پسر تصنیف ضمیر	66	۲۱	پدماوت مصنفہ عبرت و عشرت	146
			۲۲	لیلی مجنوں مصنفہ میر تجلی	106
			۲۳	دیوان درد	106
۱۱	مثنوی مرزا لطف علی	66	۲۴	گلشن ہند	107
۱۲	قصہ زہرا و بہرام تصنیف خورشید	66	۲۵	قصہ گل بکاولی	26
۱۳	مثنوی سوداگر پسر تصنیف مرزا رفیع	66	۲۶	دیوان نصیر	47
۱۴	مثنوی لیلی مجنوں از نواب محبت خان	66	۲۷	کلیات نثار	185
۱۵	مثنوی اسرار محبت از محبت خان	66		- - -	

اس تفصیل سے اردو مخطوطات کی مجموعی تعداد معلوم ہو سکتی ہے، اب چند مخطوطات کے متعلق مزید حالات مناسب تصوّر کرتا ہوں۔

۱۔ بیاض مراثی، یہ کنگ کالج کی ملک ہے جس میں فارسی مرثیوں کے علاوہ حسب ذیل دکھنی شعرا کے مراثی درج ہیں۔

ندیم، جلیل، مدحی، یاد، ہوشدار، مسکین، ہوشیار، عسکری، قربان، صلاح، نظر، منعم، رضا، مستقیم، اکبر، چندا، صفی، شیدا، ریحان، عنایت، مخلص، رمضانی، قادر، کمتر، موالی، احمد، دل، معصوم، لطف، روحی، راز، اکبر۔

بعض کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو،

قادر

بیدل ہوا ہے عالم جب نیں وہ شہ گیا ہے
نگرنے نگر ہیں ماتم جب تیں وہ شہ گیا ہے

رمضانی

اس شاہ سروراں کو سرور نہ کہوں تو کیا کہوں
اس ماہ دو جہاں کو انور نہ کہوں تو کیا کہوں

مدحی

یاران دو جگ کے شاہ پر صلوات سب کہو
معنی لالہ پر صلوات سب کہو

یاد

حضرت نبی اپنی نواسیاں کے خبر لیو — ہیں چور رن میں گھائل زخماں کی خبر لیو

ندیم

اے صبا غم کی خبر گھر گھر سوں کہہ — پھر مدینے میں نبیؐ سرور کو کہہ

مستقیم

تشنہ لب رن میں کون آل پیمبر ہوتے — حاضر اس وقت اگر آن ساقی کوثر ہوتے

معصوم

آیا دل محرم سب جا عزا ہوتا ہے — ارض و سما ہا ماتم نیلی قبا ہوتا ہے

شیدا

سواری آج ہے شہ کی دیکھو یاراں محرم سوں — چلے ہیں آہ مظلوماں بہت دکھ درد ماتم سوں

احمد

صلوٰۃ بر محمدؐ صلوٰۃ بر محمدؐ — ہر دم بدم ہزاراں صلوٰۃ بر محمدؐ

یعقوب علی کے گھن کا موتی نبی کے من کا

زہرا فاطمہ کے تن کا صلوٰۃ بر محمدؐ

اکبر

ہے ہائے قاسم ہے ہائے قاسم — مارے تجھے کیوں ہے ہائے قاسم

صفی ۔

آیا ہے شہر ماتم کا رچا ہے بیاہ قاسم کا   تنہ سلطان عالم کا رچا ہے بیاہ قاسم کا

کیمبرج کی یہ بیاض ۱۱۵۷ھ میں لکھی گئی ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے

کہ مندرجہ کلام اس وقت کے شعرا اور اس کے پہلے شعرا کا ہے ۔

۲۔ مثنوی سیف الملوک، یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اس کے دو نسخے موجود ہیں

ایک نسخہ نامکمل کہا جا سکتا ہے، کیونکہ حمد و نعت وغیرہ نہیں ہے، بلکہ بسم اللہ

کے بعد ہی سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح شروع کی گئی ہے ۔

دوسرا نسخہ مکمل ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے تاریخ تصنیف کا شعر

بالکل صحیح لکھا گیا ہے ۔

برس ٹیک ہزار ہور پنج تیس میں   کیا ختم یو نظم دن تیس میں

(۳) پدماوت ۔ اس پر میں نے تفصیل سے مضمون لکھا ہے، کیمبرج میں ملک

محمد جائسی کی بھاکا اور عبرت و عشرت کی اردو پدماوت موجود ہیں۔

عبرت و عشرت کی پدماوت میں ایک دیباچہ بھی ہے جس سے معلوم ہوتا

ہے، اس کو ملک محمد جائسی کی پدماوت سے ضیاء الدین دہلوی نے اردو

نظم میں منتقل کرنے کی ابتدا کی تھی، ایک کافی حصہ کے مکمل کرنے کے بعد

ان کا انتقال ہو گیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد غلام علی عشرت بریلوی نے ۱۲۱۱ھ میں اس کو مکمل کیا، تاریخ تصنیف بھی درج ہے۔ ملاحظہ ہو :-

یہ کہہ کر مثنوی میں سنے جو کی غور — کوئی تاریخ اس کی کیجئے خوش طور

کہا دل نے اسے دیکھے جو شاعر — بلا شک جانے تصنیف دو شاعر

یہ نسخہ بڑی تقطیع کے ۱۵۰ ورق پر ہے۔ مگر یہ بھی مکمل نہیں ہے، آخری چند صفحات نہیں ہیں۔

(۴) ترجمۂ تاریخ طبری، یہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے، جس کی دو ضخیم جلدیں ہیں مترجم سید جعفر شاہ ابن سید قمر الدین ہیں، ابتدا میں چار ورق کا دیباچہ بھی درج ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، یہ ترجمہ اس وقت ہوا ہے، جب کلکتہ میں یورپین اصحاب کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم ہوا تھا، مترجم نے اپنے دیباچہ میں اردو کو ریختہ، اردوئے معلّٰی، ہندوستانی، ہندی ہر ایک نام سے موسوم کیا ہے، جس سے واضح ہو سکتا ہے، اس وقت یہ سب نام زبان اردو کے متعلق استعمال کیے جاتے تھے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"ازیں جملہ ایک زبان ریختہ ہے۔ کہ تمام ہندوستان میں بالفعل رواج ہے، چونکہ ہندوستان میں، صاحبان عالی شان کو ہر وقت

ہندوستانی زبان بولنا ضرور ہوتا ہے . . . . تاکہ صاحبان عالیشان ولایت سے آکے اول اردوئے معلّیٰ کی زبان سیکھیں اول اس مدرسہ میں زبان اردو کے سیکھیں . . . . مگر ہندی زبان میں اگر کچھ شعر و مرثیہ لکھا ہوئے تو اس کو بڑا نہیں سکتے ہیں"

یہ ایک مختصر یادداشت ہے، ہمارے ذخیرہ کی جو انگلستان کے مدینۃ العلوم کیمبرج کے کتب خانوں کی زینت بنے ہیں۔

(معارف ۱۹۲۹ء)

پیرس کے ہندوستانی مخطوطوں کی فہرست

تاریخ ہند کا مبتدی بھی اس سے واقف ہے۔ کہ فرانسیسیوں کا تعلق ہندوستان کے ساتھ کب سے شروع ہوا، تجارت کے ساتھ ساتھ جہاں ملک گیری ہوتی رہی وہاں ملک گیری کے ساتھ یہاں کے نایاب ذخیرے بھی یورپ کو منتقل ہوتے رہے منجملہ دیگر اشیا کے ایک قلمی کتابیں ہیں۔ جو آج پیرس کے قومی کتب خانہ ببلیاتک نیشنل (Bibliothèque Nationale) میں موجود ہیں عربی۔ فارسی۔ سنسکرت

مرہٹی، تلنگی سے قطع نظر کر کے ہم کو صرف ہندوستانی سے بحث کرنی ہے۔

فرانس کا محقق اردو گارساں ڈی تاسی ہے جس کے خطبات کا ترجمہ رسالہ اردو اورنگ آباد میں نواب مسعود جنگ بہادر وغیرہ نے شائع کیا ہے۔ خیال یہ تھا۔ کہ گارسی ڈی ٹاسی کا پورا کتب خانہ پیرس کے قومی کتب خانہ میں منتقل ہوا ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ صرف چند مخطوطے اس کے یہاں آئے ہیں اس کا پورا کتب خانہ کیا ہوا؟ کدھر گیا؟ کسی کو اس کا علم نہیں ہے۔

موجودہ زمانہ میں فرانس کے پرفیسر سنسکرت وغیرہ موسیو جوالبلاق اس کی تلاش میں ہیں، ممکن ہے۔ پتہ چل جائے۔

معلوم ہوتا ہے، ڈی تاسی کے مرنے پر اس کے ورثا نے کتب خانہ کی حفاظت نہیں کی اور وہ منتشر ہو گیا، چنانچہ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ولی کا جو دیوان ہے۔ وہ ڈی ٹاسی کی ملک رہا ہے۔ اس پر اس کے نوٹس بھی ہیں، بہر حال افسوس ہے، اردو مخطوطوں کی یورپ کو منتقلی کے بعد بھی حفاظت نہیں ہوئی۔

پیرس کے قومی کتب خانہ کے اردو مخطوطوں کی کیٹلاگ سنہ ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی ہے جس کا مصنف (A. Cabaton) ہے، یہ کیٹلاگ، انڈیا آفس

یا برٹش میوزیم کے کیٹلاگ کی طرح صراحت و وضاحت سے نہیں ہے اور پھر کسی حیثیت سے ناکمل اور غیر صحیح ہے۔

اول تو یہ کہ اردو مخطوطوں کو ہندوستانی سے (INDIEN) موسوم کر کے جو فہرست بتائی گئی ہے۔ اس میں ۲۴۱ کتابیں ہیں۔ مگر منجملہ ان کے صرف ۱۵ اردو ہیں، باقی سنسکرت، مرہٹی، تلنگی، تامل، فرنچ وغیرہ ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ سنسکرت، مرہٹی، تلنگی وغیرہ کے بھی علیحدہ کیٹلاگ ہیں۔ منتظمین کتبخانہ کے حسب بیان ہندوستانی (INDIEN) سے صرف اردو مخطوطے مراد ہیں اس سے واضح ہے غیر اردو کو اردو سے موسوم کرنا کس قدر غلطی ہے۔

دوسری فروگذاشت یہ ہوئی ہے کہ کئی ایک مخطوطے جو ایک دوسرے کے ساتھ مجلد ہیں، ان کا ذکر بھی نہیں ہے، اس طرح کئی کتابیں کیٹلاگ سے مفقود ہیں اور جب تک کتابوں کو دیکھا نہ جائے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔

تیسری فروگذاشت یہ ہے کہ اندراج فہرست میں کوئی خاص ترتیب فن یا حروف تہجی وغیرہ کی نہیں رکھی گئی ہے جس کے باعث کسی خاص کتاب کی تلاش مشکل سے خالی نہیں۔

ان کے سوا کتابوں کے نام مصنفین (جو صرف چند ہیں) کے ناموں

کے متعلق بھی غلطیاں تھیں۔

منتظمین کتب خانہ کو جب ان امور سے آگاہ کرایا گیا۔ تو انہوں نے خاص طور پر مجھے اس امر کی اجازت دی کہ کتب خانہ کے صرف اردو مخطوطوں کی فہرست مرتب کر دوں۔

ظاہر ہے۔ یہ کام علاوہ وقت طلب ہونے کے کافی وقت کا مقتضی تھا بریں ہمہ فن کے لحاظ سے ایک فہرست مرتب کر دی گئی۔ جو غالباً طبع کی جائے گی۔

ناظرین کی آگاہی کے لئے یہاں کے اردو مخطوطوں کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے:۔

مذہبی

۱۔ خلاصۃ المعاملات۔ ورق ۴۲ سطر ۱۵ مصنفہ سہیل، منظوم

۲۔ انواع العلوم ورق ۱۳۰ سطر ۱۵ " " "

۳۔ فقہ ہندی ورق ۱۲ سطر ۱۲ " ابین "

۴۔ فرائض نص " ۴۱ " ۱۳

۵۔ نور نامہ " ۱۰ " ۱۵ " الٰہی بخش "

۶۔ انتخاب کتب " ۵۲ " ۱۵ " کمال الدین "

۷۔ نافع المسلمین ورق ۷۹ سطر ۱۶ منظوم

۸۔ رسالہ عقائد " ۱۳ " ۲۴ مصنف محمد باقر آگاہ "

۹۔ ہدایت نامہ " ۱۰ " ۲۳ " " "

تاریخ

۱۰۔ عاشورہ نامہ ورق ۵۰ سطر ۱۱ " عبدالمالک " سنہ تصنیف ۱۱۰۰ھ

۱۱۔ نکات الشعرا " ۵۳ " ۱۵ " میر تقی میر "

۱۲۔ گلشن ہند " ۱۵۲ " ۱۷ " مرزا لطف علی "

۱۳۔ تاریخ آسام " ۱۲۶ " ۱۵ " سید بہادر علی حسینی "

یہ احمد شہاب الدین کی تاریخ آسام کا جو ۱۰۷۳ھ میں مرتب ہوئی تھی ترجمہ ہے جس کو سید بہادر علی حسینی نے ۱۸۰۵ء میں کیا ہے۔

۱۴۔ ہشت بہشت ورق ۲۱۱ سطر ۲۳ مصنف محمد باقر آگاہ "

۱۵۔ سری کشن " ۴۹۸ " ۱۵

قصص

۱۶۔ ترجمۂ انگلستان ورق ۱۸۰ سطر ۱۱

۱۷۔ نسخۂ ثانی " ۷۴ " ۱۱ صرف باب اول کا ترجمہ ہے

۱۸۔ پدماوت ورق ۲۰۸ سطر ۱۱ مصنف ملک محمد جائسی

شیر شاہ سوری کے زمانہ میں اول مرتبہ پدماوت بزبان بھاکا مرتب ہوئی ہے۔ پدماوت پر ہم نے تفصیل سے مضمون لکھا ہے۔ جو نیرنگ خیال میں شائع ہوا ہے، اس وقت یہ "بھاکا" کتاب دستیاب نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس کی صراحت اس میں نہیں ہے، کیمبرج میں بھی اس کا ایک نسخہ ہم نے دیکھا ہے۔ پیرس کا یہ نسخہ ۱۱ رجب ۱۱۳۲ھ کا لکھا ہوا ہے، پہلا شعر حسب ذیل ہے :-

سنورون آدایک کرتارد جین جیو دنیہ کینہ نسیارد

۱۹۔ افسانہ ہندی ورق ۵۶ سطر ۱۵ . . . . . . نثر

۲۰۔ قصہ جنگ امیر حمزہ ،، ۹۶ ،، ۱۲ . . . . . نثر

یہ قصہ داستان امیر حمزہ کے سوا ہے، اس میں ۲۲ فصلوں میں کتاب ختم ہوتی ہے، تاریخ کتابت ۱۱۹۸ھ۔

۲۱۔ مثنوی سحر بیان ورق ۳۱ سطر ۱۱ مصنف راسخ سنہ کتابت ۱۲۳۱ھ

۲۲۔ دوسرا نسخہ ۱۲۱۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔

۲۳۔ تیسرا نسخہ ۱۲۳۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔

۲۴۔ چوتھا نسخہ . . . .

۲۵۔ مثنوی راسخ ورق ۳۱ سطر ۱۱ مصنف راسخ سنہ کتابت ۱۲۳۱ھ

۲۶۔ قصہ خاور شاہ " ۲۱۶ " ۱۱ " غلام حسین منظوم

داستانِ امیر حمزہ کی طرز پر شاہ عالم بہادر شاہ کے زمانہ میں مرتب ہوئی

ہے۔ پہلا شعر:۔

کیا کہے اب زبان حمدِ خدا   ما عرفناک جب نبی نے کہا

(۲۷) مثنوی یوسف زلیخا ورق ۱۴۹ سطر ۱۴ مصنف محمد امین

سنہ تصنیف ۱۱۰۹ھ یہ مثنوی عالمگیر کے عہد میں بھروچ (گجرات) میں

لکھی گئی ہے۔ اس کے متعلق میں نے تفصیل سے علیحدہ مضمون لکھا ہے۔

جو "جامعہ" میں شائع ہوا ہے۔

۲۸۔ وامق و عذرا ورق ۴۰ سطر ۱۱ منظوم

۲۹۔ انشا نورتن " ۱۹۳ سطر ۱۵ مصنف محمد بخش مہجور نبا گر دجرات "غازی الدین

حیدر" کے زمانہ میں تصنیف ہوئی ہے، سنہ تصنیف ۱۲۳۰ھ یہ نسخہ خود مصنف کا قلمی ہے

منظومات

۳۰۔ معراج نامہ ورق ۴۳ سطر ۱۵

۳۱۔ دوازدہ ماسہ ورق ۱۵ سطر ۱۱ مصنف کا نام باوجود تلاش نہ معلوم ہوا

۳۲۔ کلیاتِ سودا " ۴۳۴ " ۹ تا ۱۲ مصنف مرزا رفیع سودا

۳۳۔ نسخہ ثانی . . . .

۳۴۔ مجموعۂ کلام ورق ۳۳ سطر ۱۱ ولی اور سودا کا مختصر انتخاب ہے،

۳۵۔ دیوانِ عاجز " ۶۰ " ۱۵ عارف الدین خان عاجز کا دیوان ہے، جن کی مثنوی لال و گوہر بھی مشہور ہے، اس کے دو نسخے انڈیا آفس اور ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔

۳۶۔ دیوان علیم اللہ شاہ ورق ۹۶ سطر ۹ مصنف علیم اللہ شاہ سنہ کتابت ۱۲۵۷ھ

۳۷۔ مجموعہ کلام ورق ۱۷۶ سطر ۹ چند فارسی اور اردو غزلوں کا مجموعہ ہے

۳۸۔ راگ ہائے ہندی ورق ۴۵۴ سطر ۱۵

۳۹۔ کلام چراغ علی شاہ ورق ۲۲ سطر ۱۰ مصنف چراغ علی شاہ

۴۰۔ دیوانِ امان۔ ورق ۷۶ سطر ۱۱ مصنف امان

۴۱۔ تحفۃ النسا " ۱۸ " ۲۳ " محمد باقر آگاہ

۴۲۔ ریاض الجنان " ۷۲ " ۲۳ " "

۴۳۔ رسالہ فرقہ ہائے اسلام ورق ۷ سطر ۲۳ مصنف " "

۴۴۔ ہدایت نامہ ورق ۱۰ سطر ۲۳ مصنف محمد باقر آگاہ

متفرق

۴۵۔ چند خطوط کسی غیر معروف شخص کے چند خطوط ہیں ورق ۱۱ سطر غیر معین

۴۶۔ لغت فارسی و اردو۔ ورق ۱۲۱ سطر ۱۲

۴۷۔ آموز المنشی ورق ۱۷ سطر غیر معین

۴۸۔ چند یادداشتیں، ورق ۳۰ سطر ۱۵

۴۹۔ اردو و فرنچ۔ ورق ۱۰۲ سطر ۱۱

۵۰۔ آئین و قواعد افواج کمپنی علاقہ مدراس۔ ورق ۳۵ سطر ۱۳

انگریزی فوج تنظیم مدراس کے متعلق فوجی قواعد اور سزا وغیرہ کے قانون بیان کئے گئے ہیں۔

۵۱۔ نامعلوم الاسم۔ ورق ۱۱۲ سطر ۱۱

تصوّف میں ایک نامکمل کتاب ہے، پنجابی زبان میں لکھی گئی ہے۔

یہ ہے کل مخطوطوں کی تفصیل جو پیرس کے قومی کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

(معارف ۱۹۳۰ء)

مؤلف کی دیگر کتابیں

۱۔ "دکن میں اردو" طبع ثالث مجلد — ۸ روپے

۲۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات مجلد صہ غیر مجلد للعہ

۳۔ رہبر سفر یورپ ۸ر

۴۔ حضرت امجد کی شاعری عہر

۵۔ مکتوبات امجد ۸ر

۶۔ خواتین عہد عثمانی ۴ر

۷۔ نجم الثاقب ۲ر

۸۔ خیابان نسواں ۱۲ر

۹۔ سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری ۰

۱۰۔ ذکر نبی صلعم ۱۲ر

۱۱۔ مدراس میں اردو ۸ر

عطیہ
رام بابو سکسینہ

ملنے کا پتہ

تاج کمپنی لمیٹڈ۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

ناشران تاج کمپنی لمیٹڈ پبلشرز

نے

فیروز پرنٹنگ ورکس ۱۹ ا سرکلر روڈ لاہور میں باہتمام عبدالحمید خاں

مینجر کے چھپوا کر ریلوے روڈ لاہور سے شائع کیا

۱۹۳۹ء